مستنصر حسین تارڑ
"الاسکا ہائی وے"
وادیٔ یوکان، برٹش کولمبیا (کینیڈا) اور الاسکا (امریکہ)
YOU ARE NOW ENTERING THE
WORLD FAMOUS
ALASKA HIGHWAY
DAWSON CREEK B.C.
ALBERTA
POOL
ELEVATORS
DAWSON CREEK

○●○●○

میں ابھی تفصیل سے بیان کروں گا کہ میں نے اس کونج کو کونسی مٹی سے تخلیق کیا لیکن اس سے پیشتر میں آپ کو اس کے آبائی وطن اور قبیلے سے آگاہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں..

یہ کونج ''سینڈ ہلز کرینز'' سے تعلق رکھتی ہے۔ دیگر پرندوں کی نسبت دراز قامت ہوتی ہے، اس کا قد چار سے پانچ فٹ تک ہوتا ہے اور کسی بھی پرندے کے لیے یہ اہم نہیں ہوتا کہ اُس کا وزن کتنا ہے اور قد کتنا ہے بلکہ برتری کا پیمانہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کے پروں کا پھیلاؤ کتنا ہے۔ سینڈ ہلز کرینز کونج کے پروں کا پھیلاؤ چھ سے سات فٹ تک محیط ہوتا ہے..

انسانوں کی مانند ایک نر کونج کو مادہ کونج کے ساتھ وصل آسانی سے نصیب نہیں ہوتا۔ جب ملاپ کے موسموں میں نر کونج کا بدن حدّتِ وصل سے بے چین ہونے لگتا ہے تو وہ مادہ کونج کو لبھانے کی خاطر سو سو طرح کے نخرے کرتا ہے۔ رقص کرتے ہوئے اُس کے سامنے کورنش بجالاتا ہے۔ کبھی جھکتا ہے اور کبھی اُس کے گرد ایک بیلے رینا کی مانند ناچنے لگتا ہے۔ سینہ پُھلا کر اپنی ''قوت مردمی'' کا مظاہرہ کرتا ہے..اور یہ منظر نامہ ایسا نہیں ہے کہ ہم اس سے ناواقف ہوں..

ہمارے ہاں بھی صنفِ نازک کو متوجہ کرنے کی خاطر، اُسے زیر کرنے کے لیے یہی حربے آزمائے جاتے ہیں۔

پورے فلوریڈا میں سینڈ ہلز کرینز کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں..یعنی اُن کے ہاں کم بچے خوشحال گھرانہ کے مقولے پر عمل ہوتا ہے..

سینڈ ہلز کرینز فلوریڈا کے آبائی باسی نہیں..وہ شمالی امریکہ کی برفوں سے فرار ہو کر موسم گرما کی حدّتوں میں سانس لینے کے لیے ادھر اُڑان کرنے آجاتے ہیں..

اور ہاں یہ سینڈ ہلز کرینز کونجیں دیگر پرندوں سے ایک سراسر الگ خصلت کی حامل ہوتی ہیں..

وہ بے حجاب..بنا کسی شرم وحیا کے چڑے اور چڑیوں کی مانند چوں چوں کرتی مسلسل جنسی عمل میں مصروف نہیں رہتیں..یہ کونجیں مزاج کے حوالے سے قدرے مشرقی اور شرمیلی ہیں..جب کسی ایک نر کونج کے آگے اپنے پَرنگوں کر دیتی ہیں، وصل نصیب ہو جاتا ہے تو اس ملاپ کے بعد ہمیشہ کے لیے اُس کی ہو جاتی ہیں، عمر بھر اُس کا ساتھ دیتی ہیں اور ایک روایت ہے کہ اگر اُن کا ساتھی مر جائے تو سوگ میں چلی جاتی ہیں، کسی اور نر کونج کی جانب ملتفت نہیں ہوتیں..

اور یہ کونجیں ہمیشہ اپنے پورے خاندان سمیت..نر کونج اور اپنے بچوں کے ساتھ اُڑان کرتی ہیں۔ اسی لیے آپ کسی ایک کونج کو کبھی تنہا نہیں پائیں گے۔ اُڑان میں یا میدان میں..ہاں بچوں کی پرورش نر کونج کی ذمہ داری ہوتی ہے..اُنہیں اُڑان سکھانا..کیڑے مکوڑے کیسے تلاش کیے جاتے ہیں اور اُنہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا اور اُن کے سروں پر پیار سے ٹھونگیں مارنا..مادہ کونج کا کام صرف نخرے دکھانا اور اِترانا ہوتا ہے..

اسی لیے جب کونج ڈار سے بچھڑ جائے تو وہ کُرلاتی بہت ہے..

اگر تخیل کی بلند پروازی سے قدرے گریز کر لیا جائے تو زمینی حقائق کچھ یوں تھے کہ الاسکا کی دور دراز مسافتوں کا قصد کرنے والا دراصل ایک ''گروپ ٹریول'' ایک اجتماعی سفر تھا..انواع واقسام کی نسلوں اور قومیتوں کے بیس سے ستر برس کی عمروں کے سیاحوں کا ایک گروپ تھا جس میں جاپانی، امریکی، مقامی کینیڈین، چینی، ہندوستانی اور کم از کم ایک

پاکستانی شامل تھا۔ یہ ٹور کینیڈا کے ایک معتبر سیاحتی ادارے کے انتظام وانصرام سے ترتیب شدہ تھا..

میں بنیادی طور پر نہایت آسانی سے گھل مل جانے والا شخص ہوں..سفر کے دوران راہ چلتے اجنبیوں سے بھی سلام دعا کرتا چلا جاتا ہوں..ٹرین یا بس میں داخل ہو کر ایک سنجیدہ اور رونی سی شکل بنا کر چپکے سے اپنی نشست پر بیٹھ نہیں جاتا بلکہ بے وجہ ہر مسافر کی جانب مسکراتے ہوئے دیکھتا ہیلو ہائے کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ برابر میں بیٹھے مسافر کے ساتھ قدرے بے تکلف ہو جاؤں۔ خاص طور پر اگر وہ ایک خاتون ہو..لیکن شاید یہ عمر کی تھکاوٹ تھی جو غالب آ رہی تھی یا میرا چڑچڑا پن تھا جو بڑھتا جا رہا تھا یا کیا تھا کہ اس تقریباً بارہ ہزار کلومیٹر کی طویل مسافت اور رفاقت کے دوران میں اس گروپ کے ساتھ راہ ورسم نہ بڑھا سکا..میں گزشتہ ایام کی نسبت ان دنوں بہت کم ادبی یا معاشرتی تقاریب میں شرکت کرتا ہوں کہ..میرا جی بھر گیا ہے اور میں گریز کرتا ہوں..مجھے اب بیشتر لوگ بے وقوف لگتے ہیں اور میں اُن کی رفاقت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہوں..میں اس امکان کو بھی رد نہیں کر سکتا کہ لوگ نہیں، شاید میں خود بے وقوف ہو گیا ہوں..بہر طور لاکھ تردد کرنے کے باوجود میں ان ہم سفروں کے زیادہ قریب نہ ہو سکا..وہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر مجھ سے الگ لوگ تھے.... چنانچہ میں نے سینڈ ہلز کرینز نامی کونجوں میں سے کسی ایک کو اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا اور پھر اُس سے درخواست کی کہ وہ میرے ساتھ چلی آئے..اور وہ چلی آئی...الاسکا کی سرد، تنہا اور شاندار سرزمینوں کی مسافت میں وہ میری رفیق ہو گئی..آئندہ کے زمانوں میں کونج نے نہ صرف اپنے دل کی کہانیاں کہنی ہیں بلکہ بقیہ مسافروں کے احساسات کی ترجمانی بھی کرنی ہے۔ اُس نے میرے اندر جھانک کر میرے ذہن کی تختی پر رقم عبارتیں پڑھ کر مجھ پر وارد ہونے والی کیفیت کو بھی زبان دینی ہے..

کونج نے وہ کچھ کہنا ہے جو خلقِ خدا کہتی ہے..

چنانچہ کونج اس سفر کے دوران میری وہ سہیلی ہے جو میرے دل کی پہیلی بُوجھ لیتی ہے..

اور یہ کونج نہایت متوالی ہے..

دِل ربا، دِل کش ہے..اُس کی سیاہ سحر آنکھیں بہتی ہوئی لگتی ہیں، اور جب وہ اپنے پر چھ سات فٹ کے پھیلاؤ میں لاتی ہے تو وہ دل کی سلطنت پر سایہ کرنے لگتے ہیں..

یہ یونہی تخلیق نہیں ہو گئی تھی، اسے وجود میں لانے کے لیے میں نے بہت کشٹ کاٹے..زندگی بھر کی محبتوں، کلفتوں اور اذیتوں کی مٹی پہلے تو گوندھی..اور اسے گوندھنے سے پیشتر اسے دل کی چھلنی میں یوں چھانا کہ اس مٹی میں نفرت، کمینگی اور بے اعتنائی کے جتنے بھی روڑے کنکر تھے وہ چھلنی میں سے چھن نہ سکے۔ اُس کی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے رہے..اور جو مٹی بالآخر میری پوروں کے لمس سے آشنا ہوئی وہ گویا ایک خاکِ پاک تھی، اُس میں محبت اور اُلفت کے ذرّوں کے سوا اور کچھ نہ تھا..

اس مٹی کو گوندھنے کے بعد میں نے اسے چاک پر چڑھایا..چاک کو اپنے پاؤں سے گھمایا..دونوں ہتھیلیوں کو گیلی مٹی پر جمایا، ہولے ہولے یوں دبایا کہ وہ ایک شکل اختیار کرنے لگی، سانس لینے لگی، ایک قلبوت کی صُورت میں ظاہر ہونے لگی اور اُس میں ایک روح پھڑ پھڑانے لگی..

کیا یہ قلبوت اس کونج کا تھا جو الاسکا کے سفر کے دوران میری رفیق ہوئی تھی؟

نہیں.. اولاً تو ایسا نہیں ہوا تھا..

پہلی شکل اُس کی نہیں تھی..

خوب گوندھی گئی گیلی مٹی کو جب میں نے اپنی ہتھیلیوں کے حصار میں لا کر ہولے ہولے دبایا تھا تو ایک انسانی شکل کا شائبہ ہوا تھا.. میرے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی.. میری تحریروں میں سے جنم لینے والی ایک شکل ماضی کے اندھیروں میں سے اپنے ضیاء بار حسن کے ساتھ نمودار ہوتی ہوئی.. ابھی اس کے نین نقش کاملیت کی جانب بڑھتے تھے جب وہ ڈھے گئے۔ میں ایک ناتجربہ کار کمہار تھا، مٹی میں پانی کی آمیزش زیادہ ہو گئی تھی تو وہ اپنا آپ سہار نہ سکی، میری ہتھیلیوں کے درمیان میں سے ڈھے کر ابتدائی شکل کھو بیٹھی...

میں نے اپنے پاؤں سے چاک کو ذرا تیزی سے متحرک کیا اور مٹی پر اپنی ہتھیلیوں کی گرفت مزید مضبوط کر دی تاکہ شکل جو بھی نمودار ہو، ٹھہری رہے، مسمار نہ ہو جائے۔

اور جو شکل نظر آتی تصویر نظر آتی۔

میرے ہاتھوں کی لکیروں پر سانس لیتی، دھڑکتی کوئی ایک شکل تو نہ تھی۔ کبھی وہ مشرقی جھمکے پہنے سنہری بالوں والی ایک اپاہج وینس، پاسکل دکھائی دینے لگتی..

کبھی اُس کی شکل پر آنکھیں نہ ہوتیں اور وہ ماسکو کے جشن کی رات میں ایک نابینا فاختہ دکھائی دینے لگتی..

اُس مٹی میں سے ایک چوڑی ناک اور موٹے ہونٹ ابھرنے لگتے، سرسوتی کی پاروشنی کا سیاہ بدن جو اپنے پھن سے وار کر کے کسی ورچن یا سومرو کو ڈس سکتا تھا..

مرید کے کے چوڑے کی سویڈش بیٹی برگیتا راوی کے آلودہ پانیوں میں سے ایک سیاہ وینس کی صورت ظاہر ہوتی لگتی۔

اور پھر ساری مٹی ایک زرد اوڑھنی کی مانند افق تا افق پھڑپھڑانے لگتی جو ایک زرد شہزادی کے غزالوں ایسے حسن کی پردہ پوشی کرنے میں ناکام ہو جاتی..

کوئی ایک شکل تو نہ تھی..

اور پھر جب چاک گھما گھما کر میرے پاؤں تھکنے لگے، میری ہتھیلیاں مٹی کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں سُوجنے لگیں تو اُن کے درمیان میں سے لامبے سفید پر نمودار ہونے لگے، ایک پرندہ میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سانس لینے لگا اور ایک کونج کی شکل ظاہر ہوتی چلی گئی۔

یہ کونج ان سب شکلوں کی بالآخر آخری شکل تھی جو میری ہتھیلیوں کے درمیان میں ڈھلتی زندہ ہو رہی تھیں۔

آئندہ زمانوں میں.. الاسکا کا جو طولانی سفر مجھے درپیش تھا اس کے دوران اگر یہ کونج کبھی پاسکل، کبھی پاروشنی اور کبھی ایک زرد غزال ہوئی جاتی تھی تو آپ کو اچنبھا نہیں ہونا چاہیے۔

آپ یقیناً اس بیانیے کے عجب پن سے بوکھلا گئے ہوں گے اور میں آپ کو مورد الزام نہیں ٹھہراؤں گا۔

آپ تب تک اس سفرنامے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک آپ اُتنے ہی مخبوط الحواس نہیں ہو جاتے جتنا کہ میں ہوں۔ حقیقت اور تصور کے بکھیڑوں سے بالاتر ہو کر اپنے ذہن کے سیاہ گھوڑے کی باگیں کھلی نہیں چھوڑ دیتے تب تک آپ اس سفر الاسکا کی رُوح میں نہیں اُتر سکتے۔

ماضی کی سب شکلیں اس ایک کونج میں مجتمع ہو گئی ہیں، وہ کبھی کُوکے گی، کُرلائے گی.. فریاد کرے گی اور کبھی مسرت کی لذت آمیز سسکیاں بھرے گی اور آسمانوں پر اُس کا ہم جنس پرندہ شور مچاتا اُسے بلائے گا..

بے شک میں نے ہی اُسے گیلی مٹی سے تخلیق کیا تھا اُس کے اندر اپنا سانس پھونک کر اُسے زندہ کیا تھا اس کے باوجود وہ روگردانی کر سکتی تھی، نافرمان ہو سکتی تھی۔ پر وہ نہ ہوئی اور میرے ساتھ ساتھ چلی آئی۔

اگر آپ اس تصوراتی، میری آرزو کے چاک پر ڈھلی اس کونج کے کرشماتی وجود پر یقین نہیں رکھتے، ایمان نہیں لا سکتے تو فی الفور اس تحریر کو تیاگ دیجیے.. یہ اُن کے لیے نہیں ہے جو شک کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے..

○●○●○

''چلتے ہو تو الاسکا کو چلئے''

ایک ہموار، کھلا اور تاحد نظر وسیع زمینی منظر تھا جس پر ایک بے رنگ آسمان جھکا ہوا تھا اور اس میں جا بجا کٹ چکی فصلوں کی جڑوں کے ارد گرد چارے کے پہیہ نما گول گول گٹھے تھے جو دکھائی دیتے جاتے تھے..

یہ گٹھے اس سرزمین کی پہچان تھے۔

دور کے..ٹورنٹو اور مانٹریال کے شہروں سے آنے والا جیٹ ہوائی جہاز جب کیلگری میں لینڈ کرنے کے لیے بلندی کم کرتا نیچے آتا چلا جاتا ہے تو اُس کی کھڑکیوں میں سے نیچے بچھے منظر میں سب سے نمایاں چارے.کے یہی گول شکل کے گٹھے ہوتے ہیں۔

یوں لگتا ہے جیسے زیوس دیوتا جب آسمانوں پر اڑان کرتا تھا تو اس کی رتھ کے پہیے الگ ہو کر ان کھیتوں میں گر گئے ہیں... یا مہابھارت کی جنگ میں کام آئے ہوئے مہاراج کرشن کی رتھ کے نشان ہیں۔

اور اس وسیع زمینی منظر کے پیٹ پر جو شاہراہ لکیر ہو رہی تھی جیسے سیزرین آپریشن کے بعد ایک عورت کے پیٹ پر کچھ نشان گھاؤ کے ہوتے ہیں ایک ایسی شاہراہ پر ایک سلور کلر جیپ بے آواز چلی جاتی تھی اور اس میں ایک نومولود کونج اپنے گیلے پروں میں دبکی بیٹھی تھی اور اس کے برابر میں..جس نے اُسے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا وہ بھی کچھ سہما ہوا سا بیٹھا تھا۔

میں آپ سے عرض کر چکا کہ یہ ایک انواع و اقسام کی نسلوں اور قومیتوں کے سیاحوں کا ایک قافلہ تھا جو برف کی دور افتادہ سلطنت الاسکا کو دیکھنے کے چاؤ میں چلا جاتا تھا..اس قافلے میں شامل افراد کی کُل تعداد بارہ تھی اور تیرہواں کھلاڑی میں تھا۔ چار جہازی سائز کے نئے نکور دکھتے لینڈ روور تھے اور ایک نقرئی رنگ کی زیرو میٹر جیپ تھی جس کے اندر داخل ہوئے تو نشستوں کے چمڑے کی مہک میں ایک کنوار پن تھا۔ سفر کا آغاز ہوتے ہی یوں جانئے کہ وہ درجن بھر سیاح یکدم معدوم ہو گئے۔ اب میں تھا اور کونج تھی اور صرف ہم دونوں الاسکا کو جاتے ہیں..

کم از کم تین دن کی مسلسل مسافت کے بعد ہم نے کینیڈا کی سرحد پار کر کے الاسکا کی سرزمین میں داخل ہونا تھا..

ہمارے سامنے ایک اجنبی اور تاریک سمندر تھا جس میں ہم اُتر رہے تھے..اُس جادوئی جزیرے کی تلاش میں جس کا نام الاسکا تھا..

دل بیٹھتا جاتا تھا، جانے وہ وہاں ہے بھی یا نہیں..اگر ہے تو ہم پہنچ جائیں گے یا راستے میں ہی کہیں ڈوب جائیں گے..دل بیٹھتا جاتا تھا..

دنیا بھر کی سیاحتی منزلوں کے راستے طے ہوتے ہیں، وہ وہاں موجود ہیں یہ طے ہوتا ہے۔ پیرس، روم، دمشق یا قرطبہ بہر طور وہاں ہیں تو اُن کی جانب سفر کا آغاز کرتے ہوئے آپ کے بدن میں ایک پُر اشتیاق سنسنی پھیلتی ہے، خون میں شیمپین ایسے پُر خمار گلابی بلبلے پھوٹتے ہیں لیکن یہ جو دنیا جہان کے پار الاسکا ہے، تو یہ طے نہیں ہو پا رہا کہ وہ وہاں ہے بھی کہ نہیں..صرف نقشے ہماری ڈھارس بندھاتے ہیں کہ وہ وہاں ہونا چاہیے..

بے شک میری کوہ نوردیوں کا آغاز سولہ برس کی عمر میں ہوا جب میں گورنمنٹ کالج کی کوہ پیمائی کی ٹیم میں شامل ہو کر رتی گلی کی چوٹی تک پہنچا تھا لیکن میں بلندیوں کا تب اسیر ہوا، پہاڑوں کے جاہ و جلال کے اژدھے نے مجھے ڈس کر ایک خمار آلود زہر میرے بدن میں تب داخل کیا جب میں درمیانی عمر کے زوال سے آشنا ہو رہا تھا..اور اس کے باوجود میں پہاڑوں کی سلطنت کی گوری شاہ گوری کی کنواری برفوں تک جا پہنچا تھا جو ایک معجزے سے کم نہ تھا..اس خمار آلود زہر کی سیاہ طاقت کے سہارے میں جھیل کرومبر کے بلند اور تنہا خواب میں چلا گیا..دنیا کا طویل ترین برفانی راستہ طے کر کے سنولیک کے راستے عافیت سے ہیسپر کے گاؤں میں جا نکلا..لیکن تب مجھ میں کچھ ہمت اور سکت تھی، ڈھٹائی تھی اور اب..نہ ہمت تھی اور نہ سکت البتہ ڈھٹائی جوں کی توں موجود تھی..مجھے کونج پر انحصار کرنا تھا کہ وہ مجھے اپنے پروں کے سہارے الاسکا تک لے جائے..وہ میری بیساکھی تھی..

الاسکا، اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست تھی لیکن اس سے روٹھی ہوئی تھی..کینیڈا کے پار جا بسی تھی..مین لینڈ امریکہ سے جڑی ہوئی نہ تھی..اس کی سرحدیں الگ تھیں..

الاسکا کے سفر کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے ایک اور ''ٹریجڈی'' ہو گئی..

مجھے خبر ہی نہ تھی..

جیسے شمس تبریز نے مولانا روم کو کتابوں کے ایک انبار میں محو مطالعہ دیکھ کر اپنی دیوانگی میں سوال کیا تھا کہ..یہ کیا ہے؟ تو مولانا نے اپنے سرکاری درباری تکبر کے زعم میں نخوت سے کہا تھا کہ یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔ تو اسی ساعت ان کتابوں میں آگ لگ گئی اور مولانا ہراساں ہو کر بولے..یہ کیا ہے تو شمس نے بے اعتنائی سے کہا کہ..یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔

تو میں بھی وہ تھا جسے خبر نہ تھی..

مجھے خبر نہ تھی کہ اگر آپ الاسکا کی مسافتوں پر نکلے ہیں تو راستے میں ایک وادی یُوکان نام کی پڑتی ہے۔ کائنات ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کی وسعتوں اور دل کش ویرانیوں کا اختتام نہیں ہو پاتا۔ نہ تو اس کی جھیلوں اور دریاؤں کا کچھ شمار ہے اور نہ ہی اس کے جنگلوں کے اندھیرپن میں روشنی کی کوئی کرن داخل ہوتی ہے اور ان جنگلوں میں کیسے کیسے شاندار چرند اور پرند پائے جاتے ہیں..آبادی اتنی مختصر ہے کہ کئی کئی سو کلو میٹر چلے جایئے مجال ہے کسی انسان کا سامنا ہو جائے..بہت بڑے قصبوں کی آبادی بھی بمشکل ڈیڑھ دو ہزار تک پہنچتی ہے اور جو بڑے شہر ہیں وہاں کے باسی بھی اٹھارہ بیس ہزار سے تجاوز

نہیں کرتے.. پورے شہر میں اگر ایک اجنبی داخل ہو جائے تو کُل آبادی کو خبر ہو جاتی ہے کہ باہر کی دنیا سے کوئی الگ سی شکل والا آیا ہے..کون ہے؟ یُوکان اتنی دور افتادہ ہے کہ اہل کینیڈا میں بھی وہ لوگ کم کم ہوتے ہیں جو کبھی اس وادی تک پہنچے ہوتے ہیں بلکہ ٹورنٹو میں ایک ریڈیو انٹرویو کے دوران جب میں نے متوقع سفر الاسکا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے وادیٔ یُوکان کا نام لیا تو میزبان خاتون نے حیرت سے کہا.. یُوکان..وہ کہاں ہے؟

اور مجھے بھی پہلے کہاں خبر تھی کہ کینیڈا میں کہیں کوئی وادیٔ یُوکان بھی ہو سکتی ہے۔

اور خبر ہو بھی کیسے سکتی تھی کہ اہل کینیڈا جنہیں امریکی دیہاتی لوگ کا خطاب دیتے ہیں، اس دیہاتی پن کے تاثر کو زائل کرنے کی خاطر دنیا کے سامنے ایک چاندی کی طشتری میں ٹورنٹو، وینکوور، مانٹریال، کیوبک یا اٹاوہ وغیرہ سجا کر پیش کرتے ہیں۔ ان بڑے شہروں کو اپنا نمائندہ قرار دے کر اہل دنیا کو باور کرواتے ہیں کہ ہم ہرگز دیہاتی نہیں ہیں۔ ذرا ان شہروں کی آن بان، چمک دمک اور بلند عمارتیں تو ملاحظہ کیجیے..اور یقین جانیے میں تعصب نہیں برت رہا، یہ جواُن کا صدر مقام اٹاوہ ہے..جسے میں نے اپنے دوست بھی اور مداح بھی عمران فاروقی کی میزبانی میں دیکھا، نہایت ہی پھیکا، سپاٹ اور بے جان سا شہر ہے..یقین کر لیجیے ہمارا اپنا پاکستانی اٹاوہ اگرچہ میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا لیکن یقیناً وہ کینیڈا کے اٹاوہ سے تو بہر طور زیادہ جاندار ہو گا۔

گوجرانوالہ جاتے ہوئے کامونکی سے ذرا آگے آپ کو ایک بورڈ نظر آئے گا جس پر "اٹاوہ" لکھا ہو گا اور وہاں اگر کچھ بھی نہ ہو تو اُس کے جوہڑوں میں کنول کے پھول تو کھلتے ہوں گے، دھان کے کھیتوں میں زہریلے سبز رنگ کے خوبصورت سانپ تو رینگتے ہوں گے..اور اس میں شک نہیں کہ ہمارا اٹاوہ صدیوں سے آباد چلا آتا ہے جبکہ کینیڈا کا اٹاوہ تو مولود ہے۔

عین ممکن ہے کہ کسی انگریز صاحب بہادر کو یہ نام پسند آ گیا ہو اور اس نے کینیڈا کے ایک شہر کو یہ نام دے دیا ہو.. جیسے امریکہ میں ایک لاہور بھی ہے۔

چنانچہ اہل کینیڈا نے وادیٔ یُوکان سے ہمیشہ غفلت برتی ہے، اس کی تشہیر سے قدرے اجتناب کیا ہے کہ وہ دیہاتی نہیں کہلانا چاہتے..

گارسیا مارکیز کو ایک عجیب سا خبط ہے، وہ اپنے بیشتر ناولوں کے آغاز میں ہی ان کے انجام کا راز کھول دیتا ہے..اور پھر کہانی کو آگے بڑھاتا ہے..وہ ایک ایسا سامری جادوگر ہے جو پہلے صفحے پر ہی اعلان کر دیتا ہے کہ میں اس ناول کے آخر میں سونے کا ایک بچھڑا تخلیق کر کے آپ کے سامنے زندہ کر دوں گا..اختتام جاننے کے باوجود وہ آپ کو اپنے داستانوی طلسم کا اسیر کچھ یوں کر لیتا ہے کہ آپ ناول پڑھتے ہوئے فراموش کر دیتے ہیں کہ اس کے آخر میں سونے کا ایک بچھڑا نمودار ہو گا..اور جب بالآخر وہ بچھڑا آپ کے سامنے آ جاتا ہے تو آپ ششدر رہ جاتے ہیں کہ ہائیں یہ کہاں سے آ گیا۔

تو میں بھی مارکیز کی مانند اپنی اس خودنوشت، سرگزشت وغیرہ کے آغاز میں یہ راز فاش کر دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ منزل مقصود الاسکا تھی لیکن..اس کے راستے میں وادیٔ یُوکان کا سونے کا بچھڑا ایسا ہے کہ آپ الاسکا کو بھول کر اس کی

پرستش کرنے لگ جائیں گے..

مجھے اس سفرنامے کا عنوان دراصل "وادیٔ یوکان" رکھنا چاہیے تھا جس میں الاسکا کا بھی تذکرہ تھا لیکن میں قدرے کمرشل اور خودغرض ہو گیا کہ "الاسکا ہائی وے" ایک پُرکشش نام ہے۔ اسے آسانی سے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ یوں بھی اردو میں جہاں تک میری مختصر معلومات کا تعلق ہے، آج تک الاسکا کا سفرنامہ کسی نے تحریر نہیں کیا اور اس کی سادہ سی توجیہہ ہے کہ کسی ادیب کے حواس اس قدر غتربود نہیں ہوتے کہ وہ خواہ مخواہ نیویارک اور ٹورنٹو کی گلیاں چھوڑ کر ہزاروں کلومیٹر دور کے ویرانوں کا رخ کر لے۔

وادیٔ یُوکان جس کی اتھاہ وسعتوں میں ہم سینکڑوں کلومیٹر کے فاصلے طے کرتے چلے جاتے تھے اور ان راستوں میں ویرانیوں، شادابیوں اور سحر انگیزیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا، نہ کوئی آبادی، نہ کوئی ریستوران یا گیس سٹیشن..بس ایک خلائی تنہائی تھی جس کے اندر ہم بیٹھتے دل سے سفر کرتے چلے جاتے تھے..تو یہ یُوکان تھی، الاسکا سے کہیں بڑھ کر میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر کر وہاں ہمیشہ کے لیے جاگزیں ہو جانے والی..

میں نے بھی گارسیا کی مانند آپ کو اس سفرنامے کے اختتام سے آگاہ کر دیا ہے کہ الاسکا کی نسبت یُوکان تھی جس نے مجھے مسخر کر لیا..

کچھ حرج نہیں اگر سفرِ الاسکا کا باقاعدہ آغاز ہو جائے..

دیر کرنا مناسب نہیں..دور کی منزل ہے اور راستوں میں ویرانی اور قدرتی مناظر کی ایک لمبی چپ ہے اور اس چُپ کے اندر کیسے کیسے جانور پرندے منتظر ہیں کہ وہ اپنی حیات کے پہلے پاکستانی کو دیکھیں..

اُنہیں مایوس کرنا مناسب نہیں۔

تو چلتے ہو تو الاسکا کو چلیے..

○●○●○

''بینف برف آثار..اور جھیل لوئیس''

ایڈمنٹن کی جانب رواں شاہراہ کو ترک کر کے جب ہم یکدم بائیں جانب مڑ گئے تو میں نے ہراساں ہو کر کہا
''سلوجنج..یہ ہم کدھر جا رہے ہیں، الاسکا ادھر تو نہیں اُدھر ہے..''

''ہم بینف جا رہے ہیں..'' اُس نے چونچ چڑھا کر ایک بیزار لہجے میں کہا..

سفر کی اولین ساعتوں میں ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ کوئی کھلکھلاتی خوش باش ہنسوڑ قسم کی دوست سلوجنج نہ تھی..کچھ لیے دیے رہتی تھی، بوتھی سُجا کر بیزار بیٹھی رہتی تھی، میں نے تو اس کی مٹی میں محبت کی بوندیں ٹپکائی تھیں، جانے اُن کا اثر کیوں نہیں ہوا تھا..

''لیکن ہم الاسکا کے راستے سے ہٹ کر اُدھر..اُس..عجیب سے نام والے قصبے کی جانب کیوں جا رہے ہیں؟''

''یہ ہمارے ٹور کے شیڈول میں شامل ہے..یوں بھی بی۔سی کے لوگ بینف پر جان دیتے ہیں..''

''بی سی..یعنی بیفور کرائسٹ کے..قبل از مسیح کے لوگ..''

''ویری فنی..'' اُس نے پھر چونچ چڑھائی ''مجھے سفر کے پہلے دن ہی احساس ہو رہا ہے کہ میں نے حماقت کی ہے جو اپنا قبیلہ اور فلوریڈا کے سورج سے دمکتے مالٹوں سے مہکتے موسم ترک کر کے تمہارے ساتھ آ گئی ہوں..بی سی..کینیڈا کے صوبے برٹش کولمبیا کا مخفف ہے..اور یہاں کے باسی اس قصبے کے شیدائی ہیں، کسی بھی اجنبی کو جانے نہیں دیتے جب تک کہ اس قصبے کی زیارت نہ کروا دیں..اور وہ اجنبی اس کی توصیف میں نڈھال نہ ہو جائے..جانے نہیں دیتے..ہم بینف میں کچھ وقت گزار کر الاسکا کی جانب جاتی شاہراہ پر واپس آ جائیں گے..''

وہاں بینف میں اوائل ستمبر کی خزاں کے آثار اترے ہوئے تھے۔جتنے بھی پستہ قد شجر اور چنار کے درخت اس کے کوچہ و بازار میں سجاوٹ ہوتے تھے ان کے پتے حسن بیمار کی زردی میں زرد تھے..اور ان کی پیلی اوڑھنیوں کی تاب نہ لا کر قصبے کے پس منظر میں جو برف ردائیں پہاڑ تھے ان کی سفیدی بھی زرد ہوتی لگتی تھی..

اور اس کے موسم رنگیلے اور سہانے تھے جن کے سرد گیلے بوسے بدن کو مس کرتے تو اسے ایک پُر لذت جھرجھری سے سرشار کرتے..

بینف کی مرکزی سٹریٹ پر پہاڑوں کی برفیں اُمڈی آتی تھیں اور وہاں سیاحوں کے غول تھے جو بھیڑوں کی مانند

اِدھر اُدھر منہ اٹھائے بے مقصد گھومتے تھے..ان میں سے بیشتر بھیڑوں کی ناکیں چپٹی تھیں یعنی وہ جاپانی تھیں..بینف میں جو دو تین بڑے بڑے سوونیئرز یعنی یادگاری تحفوں کے سٹور تھے، وہ جاپانیوں کی ملکیت تھے..انگریزی سے ناواقف جاپانی سیاح یہاں جوق در جوق آتے تھے، جی بھر کے جاپانی بولتے تھے کہ کل عملہ بھی جاپان سے درآمد شدہ تھا..اور وہ عملہ اپنے ہم وطنوں کو جی بھر کے لوٹتا تھا..ان سٹورز میں اگر بھولے سے کوئی امریکی یا برطانوی سیاح چلا جاتا تھا تو نہایت لاچار ہو جاتا تھا کہ سیلز گرلز ہاتھ نچا کر کہتی تھیں ''نو انگلش پلیز''

بینف کے کوہستانی برفیلے حسن میں کچھ کلام نہ تھا..یہ آپ کو ایک سرخوشی سے لبریز تو کر دیتا تھا لیکن..یہ کچھ ایسا یکتا اور دم روکنے والا قصبہ بھی نہ تھا..''سلوجنج..'' میں ذرا مؤدب ہو کر گویا ہوا کہ کہیں وہ مجھے ترک کر کے یہیں سے اپنے قبیلے کی جانب پرواز نہ کر جائے..''بے شک دل نوازی کی خزاں زردی اور بلندیوں کے سردیلے راحت آمیز موسم اس قصبے کو نظر نواز کرتے ہیں لیکن..میرے وطن میں ایسے درجنوں کوہستانی قصبے ہیں جن کے گلے میں اس سے کہیں بڑھ کر حسن کی سرد مالائیں ہیں۔ناران، شاردا، کریم آباد، گل مت، شگر، چیلو، پھنڈر..اور کچھ ایسے دور افتادہ کوہستانی گاؤں ہیں کہ یہ بینف...اور ان سے میں اشکولے، ہوشے اور...''

''چپ..'' سلوجنج نے اپنا لامبا پر پھیلا دیا..''تم نے ان بی سی والوں کا..برٹش کولمبیا کے باسیوں کا دل نہیں دُکھانا..یہ ہرگز نہیں کہنا کہ ہمارے پاکستان میں اس کے ہم پلہ کوئی اور قصبہ بھی ہو سکتا ہے..اس لیے چپ..دل نہیں دُکھانا..''

برف پوش بلندیوں اور خزاں آلود اشجار کے سائے تلے بینف کے کوچہ و بازار...کہ یہ ستمبر کے پہلے دن تھے اور موسم گرما اپنے حدت بھرے روشن خیمے سمیٹ تو چکا تھا پر ابھی کوچ کرنے کے مراحل میں تھا اور وہاں جو برفیں بلندیوں پر تھیں، منتظر تھیں کہ کب وہ رخصت ہو اور کب وہ بینف پر اُتر کر اسے اپنی سفید رداؤں میں لپیٹ لیں..تو بینف کے کوچہ و بازار ابھی تک سیاحوں سے بھرے پُرے پُرشوق تھے اور ان میں جاپانیوں کی کثرت تھی...کبھی دنیا بھر کے سیاحتی قابل دید مقام..پیرس، روم، جنیوا، برلن، لنڈن وغیرہ ایڑھیاں اٹھا اٹھا کر متمول امریکیوں کی راہ دیکھتے تھے، ان کے آگے بچھے جاتے تھے اور یہ کیسے دن تھے کہ ایک جنگ عظیم کے ہارے ہوئے مفتوح لوگ..ہیروشیما اور ناگاساکی کی راکھ میں سے بھی بچ جانے والے شکست خوردہ لوگ..نہایت متمول، خوش لباس اور خوش اطوار لوگ..امریکیوں کی برتری کو روندتے ہوئے سیاحتی مقامات پر راج یوں کرتے تھے کہ وہی شہر اور قصبے جو کبھی امریکیوں کی راہ دیکھتے تھے، اب ان کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تھے اور جاپانیوں کے آگے جھکے جھکے کورنش بجا لاتے چلے جاتے تھے..شنید تھی کہ وہ ایسے مقامات سے رخصت ہی نہ ہوتے تھے اور ہوٹلوں اور ریستورانوں کے مالک اُن لوگوں کے آگے ہاتھ جوڑتے تھے کہ پلیز اب تو چلے جایئے، اگلے برس آ جایئے گا..سائیونارا..خدا حافظ..

ویسے بینف خوش نظر مزید ہو سکتا تھا اگر آپ کے ہمراہ کوئی خوش نظر ہو..اور اگر ایک بیزار سلوجنج ہو تو وہاں تادیر ٹھہرنے کا کچھ جواز نہ تھا..بینف کی مرکزی سٹریٹ کی گہما گہمی سے ذرا بلند ہو جایئے تو ایک ہریاول بھرا سکون آپ کے بدن کے گرد لپٹنے لگتا ہے۔ذرا سی چڑھائی کے بعد آپ کے کانوں میں ایک آبی شور کی جھاگ اترنے لگتی ہے۔ایک دریا

ہے جو چٹانوں میں سر پٹختا جھاگ آلود ہوتا ہے اور وہاں ایک آبشار ہے جو اُس کے پانیوں پر رم جھم برستی جاتی ہے۔

یہ رم جھم رم جھم پڑے پھوار کی صورت گرتی نہیں ہے بلکہ اُس کے پانی جھاگ اُڑاتے دریا کے پانیوں کی ٹھنڈک میں چھید کر کے اس کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ منہ زور گھوڑوں کی مانند.. اور پھر اُس کے پانیوں میں شامل ہو کر مطیع ہو جاتے ہیں۔

سیاح اُس دریا پر ایستادہ لکڑی کے پُل پر کھڑے، مسکراتے، دریا کی چنگھاڑ سے خوفزدہ ہوتے پھر بھی مسکراتے تصویریں اتروا رہے تھے۔

وہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا۔

اس کی شکل کو نہیں دیکھا کہ وہ منہ موڑے کھڑی تھی اور اس آبشار کے شور میں گُم تھی، جانے کس دھیان میں گُم تھی۔

اس کے لامبے سیاہ بال بنگال کے سیاہ سحر تھے جو اس کے شانوں سے اتر کر اس کی نمایاں ہوتی.. ایک نیلی جین میں جکڑی معصوم سی پشت پر اُترتے تھے اور وہ گُم کھڑی تھی۔

میں اس کا چہرہ دیکھنے کا تمنائی ہوا، پر دیکھ نہ سکا۔

بینف کی برف سفیدیوں اور اوائل ستمبر کی خزاں زردیوں میں مُجھے صرف وہ ایک لڑکی یاد ہے جو منہ موڑے کھڑی تھی۔

بے شک میں اس کی شکل نہ دیکھ سکا.. اور اس کے باوجود اس کی شکل سے شناسا نہ ہونے کے باوجود صرف اس کے گھنیرے بالوں اور اس کے متناسب بدن کے زاویوں سے جان گیا کہ وہ زندگی سے خوش نہیں ہے.. اس لیے منہ موڑے کھڑی ہے۔

ہم واپس ہوئے.. الٹے قدموں لوٹ کر آئے اور ایڈمنٹن جانے والی شاہراہ کے مسافر ہو گئے اور میرے دل کو چین آ گیا کہ شکر ہے ہم جانبِ منزل تو ہوئے.. بینف سے کچھ فاصلے پر اور درمیان میں گھنے جنگل پڑتے تھے جہاں ریچھوں کے بسیرے تھے.. کینیڈا کی سب سے لاڈلی اور واقعی پُرشکوہ جھیل لوئیس تھی.. گروپ کے دیگر ارکان نے اسے ایک پُرشوق اور جوشیلے اضطراب میں مبتلا ہو کر دیکھا.. وہ مُجھے اپنی سیف الملوک لگی جس نے کینیڈا میں آ بسرام کیا تھا کہ وہاں اس کی قدردانی نہ ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک طوائف ایسا برتاؤ ہوا تھا.. اس کے کناروں پر درجنوں چھپر ہوٹل ایستادہ ہو چکے تھے اور کڑاہی گوشت کے شوقین.. بوٹیوں کو دانتوں میں کتوں کی مانند جھنجھوڑتے لوگ اس کے کنوارے نیل پن کے آئینہ پانیوں میں ہڈیاں پھینکتے تھے اور نور جہاں کے فحش گانے سنتے شور وغل کرتے تھے.. اس لیے سیف الملوک نے بھی اپنے وطن کو ترک کیا۔ کینیڈا میں آ کر سیاسی پناہ کی طلبگار ہوئی اور یہیں کی شہریت اختیار کر لی۔ لیک لوئیس.. سیف الملوک تھی۔

○●○●○

''بگلا جھیل، کبوتر جھیل، دُھواں جھیل اور راج ہنس جھیل''

ایڈمنٹن تک کے سفر کے دوران سیاحتی گروپ کے بیشتر ارکان متعارف ہونے کے بعد ایک دوسرے کو پہلے ناموں سے مخاطب کرنے لگے تھے تا کہ اس تقریباً تین ہفتوں کے سفر کے دوران ان کے درمیان کچھ روابط بڑھ جائیں، دوستی ہو جائے جو کہ اتنی طویل مسافتوں کے لیے بہر طور ایک وقتی ضرورت تھی.. گروپ میں جو دو تین خوش شکل خواتین تھیں اور لنڈوری تھیں اُن کے پہلے نام بار بار پکارے جا رہے تھے لیکن ذرا توقف کیجیے، بھلا مجھے کیا غرض کہ میرے ہم سفر کون تھے اور اُن کے پہلے نام کیا تھے.. میں تو سراسر اُن سے جدا تنہائی میں سفر کرتا تھا اور میری ہم سفر گونج کا کوئی نام نہ تھا.. وہ صرف گونج تھی اول اور آخر..

ابھی تک کے سفر کے دوران آس پاس جو کچھ گزر رہا تھا اُس میں کچھ کشش نہ تھی تو اس سپاٹ لینڈ سکیپ نے نہ ہی مُجھے پکارا اور نہ ہی میں نے اس سے کچھ کلام کیا.. البتہ ایڈمنٹن کے راستے میں ایک قصبہ ''بالزاک'' نام کا آیا جو کہ ایک ممتاز فرانسیسی ناول نگار تھا۔ اب جانے اسے ہنری بالزاک سے کیوں موسوم کیا گیا تھا.. اس کی توجیہہ یہی ہو سکتی ہے کہ کینیڈا کے پہلے قابض اور آبادکار فرانسیسی تھے۔ پھر ایک مقام ''کارسٹیئرز'' نام کا آیا..

عجیب نام تھا.. کار کی سیڑھیاں..

ہم ایک ایسی ندی پر سے گزرے جس میں یوں لگا کہ پانیوں کی بجائے اداسی بہتی ہے اور اس کا نام تھا ریڈ ڈیئر.. یعنی سرخ ہرن..

یقیناً یہ ایک آبائی انڈین نام تھا..

سرخ ہرن تو کب کے یہاں سے رخصت ہو چکے، معدوم ہو چکے اور ان کے ہمراہ ان کے چاہنے والے، ان کے ساتھ حیات بسر کرنے والے بھی تو یہاں سے اپنی آبائی سلطنتوں سے بے دخل کر دیے گئے.. اسی لیے اس ندی میں پانیوں کی بجائے اداسی بہتی تھی۔

شاہراہ سے ذرا فاصلے پر دو جھیلوں کی نشاندہی ہمارے نقشوں پر نمایاں ہوتی تھی..

ان میں سے ایک ''گل لیک'' کہلاتی ہے یعنی سمندری بگلوں کی جھیل...

اور دوسری کا نام ''پجن لیک'' درج تھا.. کبوتروں کی جھیل..

مُجھے یقین ہے کہ یہ محض تصوراتی رومانوی نام ہیں جن کا حقیقت سے کچھ لگاؤ نہیں۔ نہ ہی ''گل لیک'' پر کوئی

ایک سمندری بگلا اُترتا ہوگا اور نہ ہی ''پچن لیک'' کے کناروں پر کوئی ایک کبوتر غٹرغوں کرتا ہوگا.. اگر کچھ امکان ہوتا تو وہاں کوئی ایک سمندری بگلا یا کبوتر ہے تو میں گونج کی منت سماجت کرتا کہ چھوڑو اس الاسکا کو.. آ ؤ اس ایک بگلے، اس ایک کبوتر کے پاس چلتے ہیں۔ کیا معلوم وہاں ایک نہیں ہزاروں بگلے جھیل کے پانیوں پر اترتے ہوں اور بے انت کبوتر اپنے نام کی جھیل پر پھڑ پھڑاتے ہوں..

ہوسکتا ہے یہ دونوں جھیلیں میرے ناول ''بہاؤ'' کی اُس جھیل کی بہنیں ہوں جس پر پرندے مرنے کے لیے آ جاتے تھے.. اور اب تک ان پر جتنے سمندری بگلے اور کبوتر اترے تھے، وہ سب کے سب خواہش مرگ میں اترے تھے اور مر چکے تھے.. یہ ہوسکتا ہے..

ہم ایڈمنٹن کے دل میں داخل ہونے کے بجائے اس کے اردگرد جو شریانیں راستے تھیں ان پر سفر کرتے ہوئے باہر سے ہی گزر گئے۔

اسی ایڈمنٹن کے آس پاس ایک کھلی تنہائی میں کہیں مظفر اقبال برسوں سے قیام پذیر تھا.. اس کے گھر کے اردگرد پھلدار شجر ہجوم ہوتے تھے اور وہاں ایک چھوٹی سی جھیل بھی تھی جس پر کونجیں اور مرغابیاں اترتی تھیں.. ایک زمانے کا ہپّی خصلت.. عادات واطوار میں لاپرواہ، بے دریغ زندگی کا مبلغ، ایک باغی.. اب مطیع ہو چکا تھا، مذہب کی جانب ایسے رجوع کیا کہ جب اسلام آباد میں ہوا کرتا تھا تو اپنی غیر ملکی بیوی اور بچوں کے ہمراہ نماز ادا کرتے ہوئے خود امامت کرتا تھا.. اس نے متعدد پیچیدہ نوعیت کے ناول لکھے تھے اور عبداللہ حسین کے بارے میں ایک مختصر انگریزی کتاب کا مصنف تھا، ایک مدت سے میرا بھی شناسا تھا.. اور اب وہ کسی حد تک ایک اسلامی فلسفی ہو چکا تھا، گئے زمانوں کی مانند پھٹی ہوئی نیلی جین اور ٹی شرٹ میں صفا چٹ کلین شیو ہپّی نہ تھا، وہ ایک لامبے درویشی چوغے اور پگڑی کے علاوہ ناف تک آتی طویل داڑھی میں ملبوس ہو چکا تھا، اسے نو ستمبر کے انہدام کے بعد ایک کینیڈین شہری ہونے کے باوجود جب ٹورنٹو ایئرپورٹ پر اس کے صوفیانہ لباس سے خوفزدہ ہوکر روک لیا گیا تو اس زیادتی کی بازگشت کینیڈین پارلیمنٹ میں بھی سنائی دی تھی... ایک ملاقات پر اس نے مجھے خصوصی طور پر ایڈمنٹن کے نواح میں واقع اپنے گھر میں آنے کی پرخلوص دعوت دی تھی۔ پر میں نہ جا سکا.. ہم دونوں کی نظریاتی دنیائیں الگ ہو چکی تھیں.. وہ بقول اس کے بھید پا چکا تھا اور میں ابھی تک شک شبہے کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا تھا اور مجھے راستہ سجھائی نہ دیتا تھا.. میں مذہبی شدت سے مفاہمت نہ کر پایا تھا.. اگر میں اس کی دعوت قبول کر کے اس کے گھر چلا جاتا تو شاید ہم دونوں ناخوش رہتے.. نہ میں اس کے عرش تک پہنچ پاتا اور نہ وہ اس فرش پر آ سکتا تھا جہاں میں مقیم تھا۔

بہرطور ایڈمنٹن کے نواح میں سے گزرتے ہوئے میں نے بیتے دنوں کے مظفر اقبال کو گمشدہ محبت کے ساتھ یاد کیا۔

ایڈمنٹن سے آگے ایک ایسی سرزمین تھی جو کاشت کاری کے لیے بے حد موزوں تھی۔ جہاں گندم اور دالیں اُگتی تھیں، بریسم اور شفالے کے کھیت سرسبز ہوتے افق تک جاتے تھے اور تنومند مویشی چرتے تھے.. اور جہاں کہیں ندیاں تھیں، ان کے پانی مچھلیوں کے اچھلنے سے تلاطم میں آتے تھے..

کہیں کہیں گھنے جنگلوں کے سیاہ سائے تھے جن کے شجر کاٹ کر دریا برد کیے جاتے تھے اور ان کے اندر شکار کی بہتات تھی..

اس سرزمین نے مجھے مسرت سے ہمکنار نہ کیا.. کہ اس میں کچھ ہیجان نہ تھا، کوئی اضطراب نہ تھا۔

اور پھر ہمارے راستے سے پرے کوئی ''سموک لیک'' تھی جو گزر گئی۔

کوئی ایسی جھیل جو دھواں دھواں تھی۔

اور یہ اس لیے ''سموک لیک'' تھی کہ جس دریا میں سے یہ جنم لیتی تھی اُس کا نام ''سموک ریور'' تھا..

دھواں دریا میں سے جنم لینے والی دھواں جھیل..

اور ہم اس ''سموک ریور'' پر سے گزرے.. یہ کچھ ایسا دریا بھی نہ تھا.. ہمارے معیار کے مطابق ایک برساتی نالہ تھا اور مجال ہے وہاں سے کوئی دھواں.. کہاں سے اٹھتا ہے.. نہیں اٹھتا تھا..

یہ آرزو دھواں دھواں..

ابھی ہم دھواں جھیل سے نہ سنبھلے تھے کہ آس پاس کوئی ''ریچھ جھیل'' تھی جو گزر گئی..

مجھ ایسا جھیلوں کا شیدائی اور کون ہوگا.. جو سولہ برس کی عمر میں رتی گلی کے پار ایک ایسی جھیل دیکھتا ہے جو نیلی چٹانوں میں گھری ہوئی دھند میں روپوش ہے اور اس کے پانیوں پر ایک آبشار اترتی ہے اور وہ جو برف کے تودے راج ہنسوں کی مانند اس کے پانیوں پر تیرتے ہیں تو اس آبشار کی زد میں آ کر اپنا رخ بدلتے ہیں.. اور پھر سولہ سے ستر برس کا سن آیا تو بھی وہ شخص اس ایک جھیل کے سحر میں گرفتار اس کے خواب دیکھتا ہے اور دوبارہ پچاس برس بعد اُدھر کا رخ کرتا ہے، پر اس جھیل پر پھر بھی نہیں پہنچ پاتا.. نذیر صابر کی میز کے شیشے تلے جھیل کرومبر کی ایک تصویر دیکھتا ہے تو اس کے وصل کے لیے جان جوکھوں میں ڈالتا ہے تو اس شخص کے آگے اگر یکے بعد دیگرے ایک بگلا جھیل، کبوتر جھیل، دھواں جھیل، ریچھ جھیل کے بعد ایک راج ہنس جھیل کا دانہ دُنکا ڈال دیا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اُسے چکھنے سے گریز کر جائے، بے شک سفر الاسکا کا ہو تو وہ اُسے ترک کر کے ان جھیلوں کے قریب تک نہ پہنچے..

لیکن میرے راستوں کا تعین ہو چکا تھا، میں ان سے روگردانی نہیں کر سکتا تھا..

میں روگردانی کر جاتا اگر مجھے ذرہ بھر یقین ہوتا کہ..

''گل لیک'' پر واقعی سفید آبی بگلوں کے ہجوم اُترتے ہوں گے..

''پچن لیک'' پر کبوتروں کا بسیرا ہوگا.. اور ان میں سے کوئی ایک کبوتر ممکن ہے ایسا بھی ہو کہ جو کبھی سبز گنبد کی قربت میں رہا ہو.. اور جب کوئی دوست یا شناسا حج کرنے کے لیے یا عمرہ کرنے کی خاطر اُدھر جاتے ہوئے مجھ سے پوچھتا ہے کہ تارڑ صاحب میرے لائق کوئی خدمت.. تو میں نہایت لجاجت سے درخواست کرتا ہوں کہ ہاں.. ایک تو میری جانب سے روضۂ رسولؐ کے گرد اُڑانیں کرنے والے کبوتروں کو دانہ ڈال دیجیے گا اور.. اگر ہو سکے تو اُس سبز گنبد کو آنکھوں میں رکھ کر اپنے موبائل پر مجھ سے بات کر لیجیے گا۔

اور میرے دوست اور آشنا مجھے سرشار کر دیتے ہیں۔

ابھی چند روز پیشتر ماڈل ٹاؤن پارک میں سیر کرنے والے میرے ایک دوست حاجی یونس نے میری درخواست کے مطابق سبز گنبد کو آنکھوں میں رکھتے ہوئے مجھے فون کیا اور میری آنکھیں میرے موبائل کے راستے جب اس گنبد کے سبزے تک چلی گئیں تو وہ گنبد مجھے ایک نم جھلملاہٹ کے پاریوں نظر آنے لگا کہ مجھ سے یہ منظر برداشت نہ ہوا۔

رابطہ منقطع ہو گیا تو میں دیر تک اپنے موبائل کو تکتا اس کے نصیب پر رشک کرتا رہا... یہ ایک بے جان دھات کا بنا ہوا موبائل ابھی میرے بابا کے حضور میں تھا..

اور میں نہ تھا..

لیکن یہ سب سراب تھے.. یہ سب بگلے، کبوتر، ریچھ، دھویں اور راج ہنس ایک فریب تھے..

اگر مجھے ذرہ بھر یقین ہوتا تو میں روگردانی نہ کرتا...

سفر کی شام ہوتی جا رہی تھی..

پہلے دن کے سفر کا اختتام ہونے کو تھا..

○●○●○

"میں اپنے پیڑ کے درخت کو یاد کرتا ہوں"

ہم نے آج کی شب کسی ڈاسن کریک نامی قصبے میں بسر کرنی تھی اور اس کی وجۂ شہرت وہ الاسکا ہائی وے تھی جس کا آغاز وہاں سے ہوتا تھا۔

"تم مجھے یہ کہاں لے آئے ہو؟" گونج جو اس سفر سے اکتا چکی تھی اور بہت دیر سے اونگھ میں تھی، بیدار ہوئی، اس کی سیاہ سحر انگیز بنگالی آنکھیں وا ہو گئیں۔ "میں اچھی بھلی فلوریڈا کے گرم آسمانوں کی حدت بھری آسودگی میں اڑان کرتی تھی.. یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو.."

"میں نے تمہیں مجبور نہیں کیا تھا گونج.."

"تم نے مجھے اپنے ہاتھوں سے تشکیل دیا تھا تو میں مجبور تو ہو گئی.. میں کیسے اپنے تخلیق کار سے انکاری ہو سکتی تھی۔ لیکن میں جو طویل اُڑانوں کی عادی ہوں، میں اس زمینی سفر کی یکسانیت سے اکتا گئی ہوں۔ کیا تم مجھے اس زمینی یکسانیت سے نجات دلانے کے لیے، میرا دل پرچانے کی خاطر مجھے کوئی اپنی کہی ہوئی نظم نہیں سنا سکتے.."

"گونج.." مجھ میں ایک خفگی نے جنم لیا "تم آگاہ ہو کہ میں صرف ایک نثر نگار ہوں.. ایک داستان گو ہوں، مجھے شاعری سے کچھ سروکار نہیں۔"

"تمہاری ہر تحریر میں شاعری کی جھانجھریں چھنکتی ہیں.. غالب اور مجید امجد تو ہر دوسرے ورق اپنی چھب دکھلاتے ہیں.. تم نے اپنے حج کے سفرنامے کا ہر عنوان غالب، بلھے شاہ اور شاہ حسین سے مستعار لیا تو پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں شاعری سے کچھ سروکار نہیں.."

"مجھے شاعری سے تو بہت سروکار ہے گونج لیکن مجھے شاعری کرنے سے کچھ سروکار نہیں کہ جو کچھ میں تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں، نہایت عیاں کر کے کھرا کھرا کہنا چاہتا ہوں۔ وہ شاعری میں ممکن ہی نہیں کہ اس میں ایک وقتی ہیجان ہوتا ہے، ایک پوشیدگی اور پر لطف مبالغہ ہوتا ہے، یہ حقیقت سے ذرا پرے ایک دھندلے لیکن پرکیف جہان میں ہوتی ہے.."

"لیکن تم نے اپنا پنجابی ناول "پکھیرو" ایک نثری نظم کی صورت میں لکھا تھا.. "بہاؤ" میں بھی یہ کیفیت جا بجا ملتی ہے بلکہ تمہاری ہر تحریر میں نثری شاعری کے آثار ملتے ہیں.."

"ایک بار ابن انشاء نے مجھے لکھا تھا کہ آپ کی نثر میں شاعری کا لطف ہے تو میں نے اس توصیف کو

قدرے ناپسند کرتے ہوئے انہیں کہا تھا کہ انشاء جی.. جیسے اچھی شاعری میں نثر کا لطف نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہیے ایسے ہی اچھی نثر بھی شاعری کی قربت میں نہیں ہونی چاہیے.. اسے نثر میں ہی ہونا چاہیے۔ جیسی کہ بیدی، منٹو، قراۃ العین حیدر یا یوسفی کی نثر ہے.. تو جسے تمہارے علاوہ کچھ اور لوگ بھی نثری شاعری کہتے ہیں وہ صرف پُراثر نثر ہے اس کے سوا کچھ نہیں..''

''تو تم نے کبھی شاعری نہیں کی؟''

''نہیں..'' میں ذرا جھجک گیا۔ ''جسے عرف عام میں شاعری کہا جاتا ہے وہ کبھی نہیں کی.. لیکن میں تمہیں اپنا رازداں بناتا ہوں، میں اب تک جان چکا ہوں کہ تم میں قدرت ہے کہ تم میرے ہر راز کو جان سکتی ہو.. اُن آٹھ نو برسوں کے دوران جب میں ٹیلی ویژن پر ہر سویر صبح کی نشریات کا آغاز کیا کرتا تھا تو کبھی کبھی کوئی نثری نظم نوعیت کی شے بھی بیان کر دیتا تھا.. یہ ''نظمیں'' نہایت معمولی اور روزمرہ کی حیات کے عام تجربوں سے مستعار شدہ ہوتی تھیں.. مثلاً ایک حیرت انگیز رنگوں کے نقش و نگار والا، ایک منقش اژدھا جو ٹیکسلا کی اس ذیلی سڑک پر مردہ پڑا تھا جو عجائب گھر کی جانب جاتی ہے.. وہ شاید سڑک کے پار اتر رہا تھا جب اسے کسی بھاری ٹرک کے ٹائروں نے کچل دیا.. اُس کا بدن ایک آرٹ گیلری تھا.. یا بدھ خانقاہ موہرا مرادو کے اوپر جو ایک چمگادڑوں سے بھری غار تھی اس کے باہر بیٹھے ہوئے ہری پور کے مالٹے کے باغوں پر جو شام اترتی تھی.. اپنی امی کے دوپٹے کی خوشبو، اپنے بیٹے کے چہرے پر پہلی آئس کریم کھاتے ہوئے وہ معصوم سرخوشی یا وہ سنہری لومڑی جو اسلام آباد کی ایک سرد سویر میں بے جان پڑی تھی... میں ایسے نقش بیان کر دیتا تھا.. پھر ایک روز مجھے ٹیلیویژن ہیڈ کوارٹر سے ایک سندیسہ آیا کہ تارڑ صاحب.. ہمیں شکایتیں موصول ہو رہی ہیں کہ جن نظموں سے آپ صبح کی نشریات کا آغاز کرتے ہیں.. آپ ان کے شاعروں کا نام تک نہیں لیتے.. میں نے افسران بالا کی تشفی تو کر دی کہ جناب عالی میں تو نشریات شروع ہونے سے پیشتر میک اپ کرواتے ہوئے کچھ سطریں گھسیٹ لیتا ہوں اور میں یہ کیسے کہوں کہ جناب یہ کلام دل پذیر اس خاکسار کا ہے.. ازاں بعد میں نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا کہ میں ایک نثری نظم کے شاعر ہو جانے کی تہمت اپنے سر نہیں لے سکتا تھا..''

''تو میں درست تھی..'' گونج مسرت سے گرلائی ''تمہارے اندر بے شک نثری ہی سہی شاعری کے جرثومے تو ہیں۔ چونکہ تم فکشن کو شاعری سے افضل جانتے ہو اس لیے شرمندگی سے ان کا اقرار نہیں کرتے.... ڈاسن کریک تک کے سپاٹ اور بے روح سفر کی بوریت کو کم کرنے کے لیے کیا تم مجھے کوئی ایسی ''نظم'' نہیں سنا سکتے.. اب مجھ میں یہ تاب تو نہیں کہ میں تمہارا کوئی طویل سفرنامہ یا ناول سن سکوں.. پلیز..''

''چلو میں اپنے چیڑ کے درخت کو یاد کرتا ہوں..''

''کونسے چیڑ کے درخت کو؟''

''جسے میں یاد کرتا ہوں.. سنو..''

''ارشاد..''

''نہ.. ارشاد نہیں.. کہ یہ شاعری نہیں، نثر ہے.. سنو..''

''چیڑ کا درخت''

مجھ سے ملاقات کرنے کی خاطر.. ملنے کے لیے لوگ آتے رہتے ہیں..
باقاعدگی سے نہیں..
کبھی روز و شب گزرتے جاتے ہیں اور کوئی بھی نہیں آتا..
اور کبھی وہ میرے سارے دن کو غارت کر دیتے ہیں..
میری سٹڈی میں مجھ سے ملنے کے لیے وہ آتے رہتے ہیں..
نہ ان کی آمد مجھے مسرت سے ہمکنار کرتی ہے اور..
نہ اُن کی غیر موجودگی میرے لیے آزار کا باعث بنتی ہے..
میں بہت کم اپنے اس حجرے سے باہر نکلتا ہوں جس میں میری رائٹنگ ٹیبل..
سیاہ روشنائی کی دوات، سفید کاغذ اور ایک قلم میرے التفات کے منتظر رہتے ہیں..
کہ اس حیات میں صرف انہوں نے مجھ سے کبھی بے وفائی نہیں کی..
ایک راہب کیکڑے کی مانند میں اپنی سٹڈی کی چٹان میں چھپا بیٹھا رہتا ہوں..
اور وہ جو مجھ سے ملنے کے لیے میرے راہب پن میں خلل ڈالنے کے لیے آتے رہتے ہیں..
تو ان میں سے کچھ دوست ہوتے ہیں..
انہیں میں گھر کے اندر نہیں لے جاتا کہ وہ قدرے مخدوش کردار کے حامل ہوتے ہیں..
کچھ دور پار کے رشتے دار ہوتے ہیں..
اور میں اُن میں سے اکثر کو پہچان بھی نہیں سکتا..
تو میں اُنہیں ٹرخا دینا چاہتا ہوں..
اور بیشتر وہ ہوتے ہیں جو میری تحریر کے کچے دھاگے میں بندھے چلے آتے ہیں..
میں اُنہیں لاکھ سمجھاتا ہوں کہ ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے.. لیکن..
اُن کی آنکھوں پر میری عقیدت کی پٹی بندھی ہوتی ہے اور وہ کسی اور کو دیکھ نہیں سکتے..
ان سب ملاقاتیوں میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے..
وہ میری سٹڈی کے دروازے پر تعینات ایک بلند قامت پہرے دار کو دیکھتے ہیں..
گھر کی چھت سے نکلتے لاہور کے آسمان میں بلند ہوتے ایک گھنے پہرے دار کو دیکھتے ہیں..
میرے چیڑ کے درخت کو دیکھتے ہیں..
اور وہ سب لامحالہ پہلا سوال یہی کرتے ہیں کہ یہاں..
پنجاب کے پُرتپش حبس بھرے میدانوں میں..
لاہور کی آلودہ حدتوں میں..

چیڑ کا ایک بلند و بالا درخت جو خوش نظر آتا ہے.. کیسے پنپ رہا ہے..
یہ تو نتھیا گلی، بٹراسی اور کاغان کے گیلے اور سرد موسموں کا باشندہ ہے..
مسلسل بارشوں کے بغیر اس کو سانس نہیں آتا..
تو یہ لُو کے گرم تھپیڑوں اور لاہور کے اس تندور میں نہ صرف زندہ ہے..
بلکہ سرسبز اور خوش ہے..
بے شک اپنے پتے.. اپنے خشک ہو چکے بال جھاڑتا رہتا ہے اور..
صحن کی صفائی کرنے والی خاتون زاہدہ شکایت کرتی رہتی ہے کہ صاحب جی..
آپ اس چیڑ کو کٹوا کیوں نہیں دیتے، اتنا گند ڈالتا ہے کہ اسے سمیٹتے ہوئے..
میرے جھاڑو کی تیلیاں عاجز آ جاتی ہیں..
میں ایک کھسیانی ہنسی ہنس دیتا ہوں.. کہ میرے پاس اس کے سوالوں کے جواب نہیں ہوتے..
یہ میرا پہلا پیڑ تھا جو میں نے اپنے مختصر صحن کی مٹی میں لگایا..
ایک چھ فٹ گہرا گڑھا کھودا.. اس میں پتوں کی کھاد بھری..
اور کچھ سنگریزے ڈالے..
تاکہ بارش ہو تو اس کی جڑوں کے گرد پانی جمع نہ ہو..
اِدھر اُدھر بہہ جائے..
اور خلاف توقع یہ چل نکلا..
میرے بچوں کی قامت سے بھی بلند ہو گیا..
اور جب وہ متجسس ملاقاتی رخصت ہو جاتے ہیں تو میں چیڑ کے درخت سے سوال کرتا ہوں کہ..
تُو کیسے ان موسموں میں پنپ گیا اور خوش بھی ہے.. کیسے..
تو وہ مجھ سے کلام کرنے لگتا ہے..
اے راہب گنگڑے.. محبت اور بڑھوتری موسموں کی پابند نہیں ہوتی..
تو خود مجھے سینچتا ہے..
ہر برس شمال کا رخ کرتا ہے..
وہاں کی بارشوں اور برفوں کو اپنے بدن میں سموتا ہے اور..
انہیں میرے لیے لاہور کے چلچلاتے گرم موسموں میں لے آتا ہے..
پھر ان بارشوں اور برفوں کے سرد گیلے پن کو میری جڑوں میں اتارتا، مجھے سینچتا ہے..
تو یوں میں پنپتا اور ہرا بھرا ہوتا ہوں..
اور جب خشک صحن بھرتے بالوں سے.. ایک عمر رسیدہ بیوہ کے خشک بالوں کی مانند..

بھر جاتا ہے تو تمہاری بیوی صفائی کرنے والی کو منع کر دیتی ہے کہ..
تم نے چیڑ کے ان بالوں کو نہیں سمیٹنا کہ..
میں ان پر چھڑکاؤ کرتی ہوں تو مجھے ان میں سے فیئری میڈو کے جنگلوں کی مہک آنے لگتی ہے..
اگرچہ اب مجھ میں سکت نہیں رہی لیکن میں اپنی عمر رفتگی کے باوجود..
ہر برس اپنے آپ پر جبر کر کے کہیں بلند پہاڑوں میں جاتا ہوں..
صرف اس لیے کہ..
اس چیڑ کے درخت کے لیے برفوں، بارشوں اور یخ موسموں کو اپنے بدن میں ذخیرہ کر کے لاسکوں..
مجھ میں سکت نہیں رہی اور اس کے باوجود یہ میری مجبوری ہے..
میں جانتا ہوں کہ اگر کسی ایک برس ناغہ ہو گیا.. میں بلندیوں کی جانب نہ گیا..
تو چیڑ کا یہ بلند قامت خوش آثار شجر سوکھ جائے گا..
میری سٹڈی کے دروازے کے سامنے کانٹے دار جھاڑیاں اور ببول اُگ آئیں گے..
جن کے کانٹے میرے پژمردہ روح میں اتر جائیں گے..
اگر چیڑ کا یہ درخت سُوکھتا ہے تو میں بھی سُوکھتا ہوں..
ہم ایک دوسرے کے سہارے سانس لیتے ہیں..
برفیلی بلندیوں پر سکت نہ ہونے کے باوجود جانا میری مجبوری ہے..
مجھے وہاں سے اس چیڑ کے درخت کے لیے کچھ بارشیں، کچھ برفیں اور کچھ سرد موسم لانے ہیں اور اسے سینچنا ہے..
اگر کسی برس میں ایسا نہ کر سکا تو..
مجھ سے ملاقات کے لیے آنے والے میری سٹڈی کے باہر ایک مردہ ہو چکے چیڑ کے شجر کو دیکھیں گے..
اور جب وہ دروازے میں داخل ہو کر اندر جھانکیں گے تو..
اندر بھی ایک چیڑ کا شجر مردہ ہو چکا ہوگا..

کونج نے کچھ ستائش نہ کی.. نہ داد دی اور نہ ہی بیزاری کا اظہار کیا، اس بے ربط نثری کہانی کو چونچ بند کیے سنتی رہی، پَر سمیٹے گم سُم رہی اور میں نے محسوس کیا اس کے سفید پروں میں سے بارش میں نچڑے میرے چیڑ کے درخت کی سہانی مہک اٹھ رہی ہے.. قدرے توقف کے بعد اس نے چونچ وا کی.. "تم اگر الاسکا جاتے ہو تو اپنی کوہ نوردی کی علت کے باعث یا دیوانگی سے مجبور ہو کر نہیں جاتے.. صرف اپنے چیڑ کے درخت کے لیے کچھ سرد اور بھیگے ہوئے موسم اپنے اندر ذخیرہ کرنے کے لیے جاتے ہو۔"
"کسی حد تک صحیح.." میں نے اس پر التفات کی ایک نظر ڈالی۔
"درست.." اس کے پروں میں ایک خنکی اور اداسی تھی، نشہ آور سیاہ سُرمئی آنکھوں میں ایک الم سیاہی تھی "تم تو

الاسکا کا قصد صرف چیڑ کے ایک درخت کی حیات کے تسلسل کے لیے کرتے ہو.. ایک زندہ رہنے کے لالچ کے تابع کرتے ہو تو آخر میں وہاں کیوں جا رہی ہوں..''

''وہاں فلوریڈا کے گرم موسموں میں اور نیلگوں آسمانوں تلے ہزاروں کونجیں اڑانیں کرتی.. زندگی کرتی ہیں تو ان کی زندگی کتنی بے مقصد ہے:. اور اگر تم میرے ساتھ چلی آئی ہو تو تم ان سے جدا ایک الگ روح ہو.. تم اُس بھیڑ میں سے نہیں ہو جن کی حیات ایک لگے بندھے معمول کے مطابق گزرتی جاتی ہے.. وہی دانے دُنکے کی تلاش، ایک خاص بلندی تک پرواز کرنا اور پھر اس کے پار نہ جا سکنا کہ پار جانے والوں کے پر جل جاتے ہیں.. کوئی شریک زندگی تلاش کرنے کی جستجو، پھر بچے پیدا کر کے انہیں پالنا اور پھر مر جانا.. کیا کسی بھی انسان یا پرندے کی حیات کا یہی یکسانیت سے بھرپور اکتا دینے والا مقصد ہے اور بس.. لیکن ہم اس متعینہ بلندی کے پار جائیں گے جس کے پار جانا ممنوع ہے۔ بے شک اس بغاوت کے نتیجے میں ہمارے پر جل جائیں اور ہم دونوں لڑھکتے ہوئے واپس زمین پر کریش کر جائیں اور مر جائیں..''

''اور اگر میرے اندر اس متعینہ بلندی کے پار جانے کی آرزو نہ ہو جس کے پار آج تک کوئی کونج نہیں گئی تو پھر..''

''ہر انسان، ہر پرندے کے اندر یہ آرزو ہوتی ہے لیکن وہ ہمت نہیں کر پاتا.. وہ ہزاروں برسوں کی روایت کو شکستہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا.. جب تک کہ اسے کوئی ایسا ہم سفر نہ مل جائے جس کے ذہن میں بھی حدوں سے پار جانے کا خلجان موجود ہو..''

''اور وہ ہم سفر تم ہو؟''

''ہاں... تم دیکھنا کہ اس طویل سفر کے بعد جب تم اپنے قبیلے کو لوٹو گی تو تم ایک مختلف کونج ہو گی.. تمہیں دیگر پرندوں کی حیات کتنی اُکتا دینے والی اور ان کی روزمرہ کی روٹین کتنی بے مقصد لگے گی اور.. اور تمہارے چہرے پر ایک مہاتما بدھ ایسی پرسکون اور پراطمینان مسکراہٹ ہو گی کہ تمہیں وہاں تک پہنچنے کا نروان حاصل ہو چکا ہو گا جہاں تک قبیلے کا کوئی پرندہ بھی نہیں گیا..''

''اگر میں واپس لوٹی تو.. پروں کے جل جانے سے بھسم نہ ہو گئی تو..''

''اگر ایسا ہو گیا تو پھر بھی تمہیں جستجو کا ایک نروان نصیب ہو جائے گا جو کسی اور کے نصیب میں نہیں ہے.. لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا..''

مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں کونج خوفزدہ ہو کر پہلے دن ہی مجھے ترک کر کے واپس نہ چلی جائے تو میں نے اُس کے تنے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا کر کے اُنہیں پرسکون کرنے کی خاطر وہ حربہ آزمایا جو ہر صنفِ نازک پر کارگر ہوتا ہے چاہے'' ایک پرندہ ہی کیوں نہ ہو، یعنی میں نے اُس کے ساتھ فلرٹ کرنا شروع کر دیا'' تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اپنی کوہ نوردی کی زندگی میں بہتیرے برف زار اور ویرانے نہیں دیکھ چکا.. دراصل جونہی تم وجود میں آئیں اور میں نے تمہارے سفید سراپے پر ایک نظر ڈالی.. تو میں تمہارے عشق میں مبتلا ہو گیا، تمہاری سیاہ آنکھوں نے مجھے موہ لیا.. میں خاصا برباد ہو گیا.. اگر اُس لمحے تم میرے ساتھ الاسکا چلنے سے انکاری ہو جاتیں تو کس کافر نے الاسکا کا رخ کرنا تھا.. یقین کرو۔''

''چل جھوٹے..'' کونج نے ننگے پاؤں کوٹھے پر اپنے محبوب سے ملنے آنے والی پرائمری پاس لاہوری لڑکی کی

طرح اِٹھلا کر کہا. حربہ کارگر ثابت ہوا تھا۔ البتہ میرا بوڑھا دل اس نخریلے تخاطب کی تاب نہ لا کر اس بری طرح دھڑکا کہ اس کے تھم جانے کا خدشہ لاحق ہو گیا.. مجھے اس نوعیت کی ہیجان خیزی کی عادت نہ رہی تھی..

اب یہاں ایک باموقع اور برمحل سوال ابھرتا ہے.. کیا میرے سفری گروپ کے اراکین اس امر سے آگاہ تھے کہ ایک کونج میری ہم رکاب ہے..؟ نہیں.. وہ یکسر بے خبر تھے۔ کونج کی موجودگی تو تب اُن پر منکشف ہوتی اگر اُن میں سے کوئی ایک کسی غیبی سحر کے زور سے میرے دماغ تک رسائی حاصل کر کے اُس کے خلیوں کی سکرینوں پر نقش اس کونج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا.. وہ تو میرے تصور کی بادبانی کشتی کے وجود سے آگاہ ہی نہ تھے جس کے بادبان تخیل کے گہرے سمندروں پر اگر کھلتے تھے تو ایک کونج کے لامبے سفید پروں کی پھڑپھڑاہٹ میں سے جنم لینے والی ہوا کے زور سے کھلتے تھے..

وہ آگاہ اگر نہیں تھے تو ہو بھی کیسے سکتے تھے..

البتہ وہ ان طولانی مسافتوں کے دوران یہ جان گئے کہ ہمارا یہ ہم سفر.. قدرے بدوضع شخص، اپنی نیلی جین کو ڈھلکنے سے ہمہ وقت بچاتا ہوا، جس کے دانت بدنما ہو رہے ہیں اور وہ نرم خوراک کی جانب راغب ہوتا ہے جسے وہ آسانی سے چبا سکے، گردن پر جھریوں کا ایک مفلر لپیٹے ہوئے، چپل اتار کر پاؤں نشست پر سمیٹے بیٹھا رہتا ہے، کچھ غرض نہیں رکھتا کہ دیگر ہم سفر کون ہیں، کیا کر رہے ہیں، ایک دوسرے کو لطیفے سنا رہے ہیں، بیئر پی رہے ہیں یا کیا کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے ناکام بدھ کی مانند جیپ کی اگلی نشست پر آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتا ہے جسے زندگی بھر کی تپسیا کے باوجود نروان حاصل نہ ہو سکا.. البتہ اس شخص کا روپ یکدم سنہرا ہو جاتا ہے جب جیپ کے باہر گزرتے کسی سحر طراز منظر پر اس کی آنکھیں ٹھہر جاتی ہیں۔ کسی گھنی اور تاریک شجر ہا شجر وسعت کے اندر اُسے کوئی ایک تنہا ایسا شجر نظر آ جاتا ہے جو اس سبزے میں ایک سورج مکھی کی مانند کھلا ہوتا ہے.. خزاں کی پہلی زردی نے اترنے کے لیے اس کا چناؤ کر لیا ہوتا ہے.. کوئی گمنام جھیل بڑھتی ہوئی جیپ کے ٹائروں کو چھونے لگتی ہے.. بلندیوں سے اترتی کسی آبشار کے چھینٹے کھلی کھڑکی میں سے اندر آ کر اُس کے چہرے کو بھگو دیتے ہیں.. تب یہ شخص سنہرا ہو جاتا ہے.. دانت لشکارے مارنے لگتے ہیں، گردن کی جھریاں زائل ہو جاتی ہیں اور یہ ایک مخمور نوخیزی میں مسکرانے لگتا ہے..

یہ شخص.. گھلتا ملتا نہیں.. شاید کسی احساس کمتری کا شکار ہے.. متکبر ہے یا ڈرپوک ہے یا پھر عمر رسیدگی نے اس کے دماغ کی چولیں ڈھیلی کر دی ہیں تبھی تو وہ کبھی کبھی خود سے کلام کرنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہاں کوئی متکلم نہیں لیکن لگتا ہے کسی سے باتیں کرتا رہتا ہے..

میرے ہم سفر میرے بارے میں شکوک رکھتے تھے..

اگر میں اُن کے شکوک زائل کرنے کی خاطر یہ کہہ دیتا کہ میں ایک خبطی بوڑھا نہیں ہوں.. میرے برابر میں ایک کونج بیٹھی ہے جس کے ساتھ میں باتیں کرتا ہوں تو شاید وہ فوراً پریٹر سے یہ کہہ کر کہ ہم ایک ایسے شخص کے ساتھ سفر کرنے کا خدشہ مول نہیں لے سکتے جس کا ذہنی توازن درست نہیں.. مجھے یہیں کہیں کسی ویرانے میں اتار کر چلے جاتے.. اس لیے میں لب بستہ رہا.. چپ میں ہی عافیت تھی۔

کونج کا سراپا کیسا تھا.. یہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ وہ اس ققنس کی مانند تھی جو اپنی ہی راکھ میں سے ہر بار

ایک نیا جنم لیتا تھا۔ ہر بار ایک جدا شکل ایک الگ روپ، کبھی پاسکل اور کبھی پاروشنی۔ کبھی نتالیہ۔۔ برگیتا اور کبھی شباہت۔۔

وہ ایک فضول سا فلمی گانا ہے کہ۔۔ تیرے چہرے سے نظر نہیں ہٹتی نظارے ہم کیا دیکھیں۔ لیکن یہاں حسب حال ہے۔ گونج کے چہرے پر جو آنکھیں تھیں اُن سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔۔ وہ از حد ملال بھری اداسی کی سیاہی میں تھیں۔۔ ایسی آنکھیں اگر کسی عورت کے چہرے پر ہوتیں تو وہ اُن کی جادوگری سے ایک کائنات مسخر کر لیتی لیکن ایسی آنکھیں انسانوں کے نہیں صرف جانوروں اور پرندوں کے نصیب میں ہوتی ہیں۔ میرے دیرینہ دوست مصور سعید اختر جنہوں نے میری متعدد کتابوں کے سرورق تخلیق کیے۔ پورٹریٹ بنانے میں ریمبرانت اور رافیل سے کم نہیں اُس کا کہنا ہے کہ ایک انسان کی آنکھوں میں کچھ طلسم نہیں ہوتا، ان میں اکثر لالچ اور حرص کے پرتو ہوتے ہیں۔۔ یہ صرف جانور اور پرندے ہوتے ہیں جن کی آنکھیں بے غرض ہوتی ہیں اور حسن کی سحر انگیزی کا شاہکار ہوتی ہیں۔ کبھی ذرا قریب ہو کر غور کیجیے۔۔ ایک فاختہ، ایک کبوتر، ایک راج ہنس اور ظاہر ہے ایک ہرن کی آنکھ۔ چشم آہو پر۔۔ یہاں تک کہ ایک اسٹیشن کُتے یا ساہیوال کے کسی اصیل بیل کی آنکھ کو ذرا غور سے دیکھیے تو اُن میں آپ کو وہ دل کو گرفت میں لینے والے سحر اور بھید نظر آئیں گے کہ آپ انہیں۔۔ ساہیوال کے ایک بیل کو بھی دل دے بیٹھیں گے اور جب میں نے پہلی بار گونج کی آنکھوں کو سعید اختر کی نظر سے دیکھا تو قائل ہو گیا۔ ایمان لے آیا نہ صرف گونج کی آنکھوں پر بلکہ دنیا کے ہر پرندے کی آنکھوں پر۔۔

البرٹا صوبے کے ہموار میدان۔۔ کاشت کیے ہوئے پہلو بہ پہلو تاحد نظر کھیت۔۔ ان میں چرتے مویشی۔۔ وسیع فارم ہاؤس۔ شام کی سیاہی میں ڈوبنے لگے تھے اور ہم ایک نادیدہ سرحد عبور کر کے ایک مرتبہ پھر برٹش کولمبیا کی حدود میں داخل ہو گئے۔۔

''تم اتنی دیر سے اپنی پژمردہ آنکھوں سے مجھے تکتے جا رہے ہو۔'' گونج نے ایک مدت کے بعد اپنی چونچ کھولی اور اپنی آنکھوں کی مصوری کا طشت مجھ پر کھول دیا۔ ''کیا تم اُس مصور پر بھی ایمان لے آئے ہو جس نے میری آنکھیں مصور کی تھیں یا ابھی تک شک شبے کی اندھیاری گلیوں میں بھٹکتے پھرتے ہو؟''

''تم وہ کچھ کیسے جان گئیں جو میرے ذہن کی پہنائیوں میں روپوش تھا۔''

''میں محرم راز ہوں۔ تمہارے دل اور ذہن کی تختی پر نادیدہ سیاہی سے جو کچھ رقم ہوتا ہے اسے پڑھ سکتی ہوں۔ تم مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے۔''

''کم از کم میں تمہاری آنکھوں پر تو ایمان لے آیا ہوں۔'' میں نے قدرے خوفزدہ ہو کر کہا۔ جانے یہ کمبخت گونج میرے ماضی کے کن کن گوشوں میں اتر کر مجھے بے نقاب کر سکتی ہے۔

''جھوٹے۔'' اس نے اٹھلا کر کہا۔

اب یہاں تو کوئی موقع نہ تھا جس کے جواز میں مجھے جھوٹا کہا جائے تو میں نے کہا ''کیوں؟''

''بس یونہی۔'' اس کے نخریلے پن کا بھی کچھ حساب نہ تھا۔

○●○●○

''ڈاسن کریک، اک شہرِ بے چراغ''

سب کے سب مسافر۔۔ پہلے روز کی طویل مسافت کے اختتام پر اپنے بدنوں پر ڈھیئے جاتے تھے، تھکاوٹ انہیں مغلوب کرتی تھی اور وہ ایک بے بس اونگھ میں تھے جب وہ ایک دھچکے سے بیدار ہو گئے کہ ہماری سواریاں رُکنے لگی تھیں۔۔ متعدد ٹائر بریکیں لگنے سے گھسٹتے ہوئے تھمتے گئے تھے۔۔

ہماری پہلی شب بسری کا قصبہ ڈاسن کریک اُس رات میں جلتا بجھتا اور تاریکی میں گم ہوتا تھا۔۔ روشنیاں کم کم تھیں۔۔

ڈاسن کریک۔ کُل آبادی سولہ ہزار۔۔ 1912ء میں جیولوجیکل سروے آف کینیڈا کے جارج ڈاسن کے نام پر آباد ہوا۔ اتنا نومولود کہ اس کی پیدائش کو ابھی ایک صدی بھی نہ گزری تھی۔ الاسکا ہائی وے کی تعمیر کے دوران دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں یہاں ایک چھاؤنی قائم ہوئی۔۔ اور پھر کچھ لوگ یہیں کے ہو گئے اور ایک تازہ بستی آبادی کر لی۔ اگرچہ وہ اہل نظر نہ تھے۔۔ ان پڑھ، مزدور اور وہ لوگ تھے جن کا کوئی گھر نہ تھا۔

ڈاسن کریک۔۔ 11705 آٹھویں سٹریٹ پر واقع ''دی جارج ڈاسن ان'' نام کا ایک ہوٹل تھا جس کی لابی میں سو برس پیشتر کی کچھ بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں نمائش پر تھیں جن میں عجیب جاہل شکلوں کے کچھ لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں بڑی بڑی جسامت کی مچھلیاں تھیں اور وہ مسکراتے تھے۔ اس ہوٹل کے مختلف کمروں میں سب ساتے چلے گئے اور بستروں پر تھکاوٹ سے مدہوش ہوتے چلے گئے۔۔

یہ ایک شہر بے چراغ تھا۔ تقریباً۔

تو شبِ فراق نے کہاں جانا تھا۔ تجھے گھر ہی لے چلیں۔

البتہ مجھے بستر پر دراز ہونے میں کچھ گریز ہوا۔ اور تب گونج نے مُندھی ہوئی نشیلی آنکھوں کو جھپکتے ہوئے کہا ''میں تمہیں بے آرام نہیں کروں گی۔ میرا وجود سارا دن پانی سے آشنا نہیں ہوا۔ میں شاور کھول کر اپنے آپ کو خوب بھگوؤں گی۔ اور پھر ٹب کو پانی سے لبریز کر کے اس میں سو جاؤں گی۔ تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔''

میں نے اطمینان کا لمبا سانس بھرا۔ اگر وہ میرے برابر میں آلیٹتی اور رات بھر خراٹے لیتی رہتی تو میں اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا ''سویٹ ڈریمز۔'' میں نے اس کے لیے خواہش کی اور کمفرٹر اوڑھ کر ٹانگیں پھیلا کر دراز ہوا اور یکدم نیند مجھ پر ٹوٹ کر گری اور میں اُس کے بوجھ تلے دب کر مدہوش ہو گیا۔

میں کب نیند میں اُترا اور کب بیدار ہوا مجھے کچھ خبر نہیں۔۔۔۔ جب کچھ خبر ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں کچھ

آ بیٹھیں ہیں، کوئی چل پھر رہا ہے۔ میں نے ابھی تک نیند سے بوجھل آنکھوں کو کھولا تو غنودگی کی ایک دُھندلاہٹ کے پار وہ اپنے نچڑتے ہوئے سفید پروں کو جھٹکتی سفید پروں پر ایک تولیہ باندھے کمرے میں بے دریغ چلتی پھرتی ہے۔

''گونج.. میرے گلے میں ابھی رات بھر کا غبار ہے جو واش روم میں جانے سے صاف ہوگا.. اور نہ ہی میرا چہرہ اس قابل ہے کہ اسے سویرے سویرے دیکھا جا سکے تو مجھے ذرا تیار ہونے کا کچھ موقع دو..''

''تو ہو جاؤ..'' اس نے نہایت تحکمانہ انداز میں کہا جس میں ذرہ بھر الفت نہ تھی۔ اس کا طرزِ تکلم ہی ایسا روکھا سا تھا کہ.. ''کہو..'' ''بولو..'' ''آ جاؤ..'' ''کھا لو..'' ''سناؤ..'' اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا کہ وہ ذرا نرم مزاج ہو کر یہ کیوں نہیں کہہ سکتی کہ ہاں.. میں سن رہی ہوں تم کہو.. یا پلیز بولو.. یا تم جو سنانا چاہتے ہو میں سن رہی ہوں..

کھڑکی کے آگے تنے دبیز پردوں میں سے روشنی سرایت کرتی خبر کرتی تھی کہ ایک اور دن، ایک اور مسافت کا آغاز ہونے کو ہے..

باہر ڈاسن کریک کی بستی تھی اور وہ ایک بستی کے سوا اور کچھ نہ تھی اور اگر وہ معتبر ٹھہری تو صرف اس لیے کہ اس بے شناخت بستی کی واحد شناخت یہ تھی کہ یہاں سے اُس دیومالائی شاہراہ کا آغاز ہوتا تھا جسے عرفِ عام میں الاسکا ہائی وے کہا جاتا ہے..

○●○●○

''الاسکا ہائی وے کا آغاز''

الاسکا ہائی وے کا مختصر اور کینیڈا میں رائج پسندیدہ نام ''الکان'' ہے۔ ڈاسن کریک زیرو میٹر ہے.. یہ میٹر آن ہوتا ہے تو پورے دو ہزار پانچ سو چالیس کلومیٹر کا فاصلہ پورا کر کے الاسکا کے شہر فیئر بینکس میں جا رکتا ہے..

الاسکا ہائی وے ڈھائی ہزار کلومیٹر سے زیادہ طویل ہے..

''جارج ڈاسن اِن'' میں شب بسری کر کے جب ہم صبح کی پہلی دھوپ کے ساتھ بستی سے باہر آئے تو ''البرٹا پول ایلی ویٹر ڈاسن کریک'' کے جہازی جسامت کے زرعی گوداموں کے پس منظر میں ایک بورڈ نمایاں ہوتا تھا جس پر ایک جادوئی عبارت رقم تھی..

"YOU ARE ENTERING THE
WORLD FAMOUS
ALASKA HIGHWAY
DAWSON CREEK B.C"

اور اس کے نیچے ایک سرخ تیر منزل کی جانب راہنمائی کرتا ہے..

سب کے دل ایک لمحے کے لیے تو رک گئے.. البتہ میرا دل ایک لمحے سے کچھ زیادہ ہی رکا.. جیسے کسی سنگ میل پر قرطبہ، ٹمبکٹو، اشبیلیہ، یارقند یا بخارا کا نام دیکھ کر ایک مرتبہ تو دل رُکتا ہے.. اور یقین نہیں آتا کہ ایک ایسا خوابناک طلسمی شہر اس راستے کے آخر میں واقعی موجود ہوگا..

بس یہی کیفیت اس بورڈ کی عبارت پڑھتے ہوئے بدن میں اتری کہ کیا واقعی اس شاہراہ کے آخر میں الاسکا ہوگا۔

''گونج'' وہ صبح سویرے پانی سے لبریز ٹب میں پروں سے چھپاکے مارتی چھینٹے اڑاتی نہا دھو کر.. اپنے پروں کو ہیئر ڈرائر سے خشک کر کے نہایت تر و تازہ اور اُجلی اُجلی سی لگ رہی تھی ''تم ہی کہو کہ کیا واقعی یہاں سے تقریباً ڈھائی ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر دنیا کے آخری سرے پر ٹانگی ہوئی برف ویرانوں کی وہ کائنات موجود ہے جسے الاسکا کہتے ہیں۔''

''میں تو زندگی میں پہلی مرتبہ یوں بائی روڈ ایک زمینی سفر کر رہی ہوں۔'' اس نے اپنی لامبی گردن کو بل دے کر اپنی سحر آنکھیں جھپکائیں۔ ''تم جو اس زمین کی قید میں ہو، یہ تصور بھی نہیں کر سکتے اوپر آسمانوں میں اڑان کرتے ہوئے اس زمین کو دھیرے دھیرے اپنے پروں تلے سرکتے گزرتے دیکھنا کیسا ہوتا ہے.. تمہارا ذہن بھی محدود اور تمہاری نظر بھی اور ہماری پرندوں کی نظر کی کوئی حد نہیں.. اڑان کے دوران کئی مختصر ملک اور خطے ہمیں پورے کے پورے نیچے بچھے دکھائی دیتے ہیں اور تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے.. ایک آدھ کلومیٹر دور ایک ٹریفک سگنل یا کوئی گھر.. یہ سائن بورڈ جسے پڑھ کر تم اتنے ہیجان میں مبتلا ہو گئے ہو کہ یہاں سے الاسکا ہائی وے کا آغاز ہوتا ہے تو یہ ہمارے لیے بے معنی ہے۔ کاش کہ تم اس زمین سے پیچھا چھڑا کر اس کی قید سے نکلو اور میرے ہمراہ پرواز کرنے لگو تو ہو سکتا ہے ہم آج کی شب الاسکا کی کسی جھیل پر اتر رہے ہوں..''

''اس زمین کو یوں حقارت سے تو نہ دیکھو.. بے شک تم ایک ایسی سبک رفتار بادبانی کشتی ہو جو آسمان کی نیلی جھیل میں تیرتی چلی جاتی ہے لیکن تم ایک خلاء میں تیرتی ہو.. تم زمین کی سوندھی خوشبو سے محروم ایک بے مہک ہوا میں اڑان کرتی چلی جاتی ہو.. اپنے تئیں آزاد ہو لیکن پھر بھی زمین کی قید میں ہو.. شب بسری کے لیے یہی زمین تمہیں پناہ دیتی ہے.. تم آسمانوں کے خلاء میں تو نہیں زمین پر گھونسلے بناتی ہو.. اُن میں انڈے دیتی ہو اور تمہاری نسل آگے بڑھتی ہے.. تو اس زمین کو حقارت سے مت دیکھو.. اور اے ری کونج تم نے مجھے کن باتوں میں الجھا دیا ہے.. ذرا دیکھو تو سہی کہ ہمارے گروپ میں شامل سیاح کتنے چاؤ سے الاسکا ہائی وے کے اس بورڈ کے ساتھ نہایت فاتحانہ پوز بنا بنا کر تصویریں اتروا رہے ہیں.. پلیز میری بھی ایک تصویر بنا دو تا کہ سند رہے..''

''تمہیں ایسی تصویری سند کی ضرورت ہے؟''

''ہاں.. بقیہ تمام سیاحوں سے کہیں بڑھ کر مجھے ایک ایسی تصویری سند کی سخت ضرورت ہے کہ میری ادب برادری کے لوگ ٹی ہاؤسوں اور ادبی محفلوں میں بیٹھے ہمہ وقت انکار میں سر ہلاتے رہتے ہیں.. اُن کے سر انکار میں ہلنے تب شروع ہوئے جب آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر میرا اولین سفرنامہ ''نکلے تری تلاش میں'' شائع ہوا اور وہ آج تک ہلتے چلے جا رہے ہیں.. وہ مجھ پر پھبتیاں کستے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں کہ تارڑ کے سفرناموں میں خیالی دنیائیں اور تصوراتی سلطنتیں ہوتی ہیں۔ اگر ان کا وجود ہوتا تو ہم جیسے دانش مندوں کو ان کی آگاہی کا عرفان حاصل نہ ہوتا.. نہ تو کسی ''سنولیک'' کا وجود ہے اور نہ ہی کسی ''پاک سرائے'' یا ''بے کہ ٹو کہانی'' کا.. اور ''دیوسائی'' تو ممکن ہی نہیں.. یہ سب داستان طرازی کے شعبدے ہیں.. اور اب یہ الاسکا.. تو کونج پلیز مجھے اپنے دفاع کے لیے ایک تصویری سند درکار ہے..''

''تم ان کنویں کے مینڈکوں کی ہرزہ سرائی سے کیوں رنجیدہ ہوتے ہو..''

''کونج ستم تو یہ ہے کہ وہ ان دنوں اپنے کنویں میں سے پھدک پھدک کر نکلتے ہیں اور کیا یورپ اور کیا امریکہ وہاں اپنے جشن منواتے ہیں، مشاعرے پڑھتے ہیں اور اس کے باوجود ان کے سر.. جب بھی میرا حوالہ آتا ہے تو رعشہ زدہ ہو جاتے ہیں.. تو کونج پلیز..''

تو یہ سند تصویر ہو گئی..

نیلے آہنی پایوں پر ایستادہ ''اب آپ مشہور زمانہ الاسکا ہائی وے میں داخل ہو رہے ہیں'' کے بورڈ تلے بنا ناری پلپک کی قدرے مہنگی نیلی ٹی شرٹ اور ایک ڈھلکتی خاکی رنگ کی پتلون میں مسکراتے ہوئے یہ تارڑ صاحب ہیں اور نہایت کائیاں ہیں کہ یوں احتیاط سے لبوں کو سکیڑتے ہیں کہ ان کے خزاں رسیدہ دانت نظر نہ آئیں..

بورڈ کے اوپر بلند مستولوں پر برٹش کولمبیا، کینیڈا اور امریکہ کے پرچم لہرا رہے ہیں..

اس بورڈ کے دیکھنے سے جس ہیجان انگیزی نے جنم لیا تھا اُس کا اُبال اترا تو ہمیں مسافت کا خیال آیا جو بہت طویل تھی اور ہم نے روانگی کے لیے تیاری باندھ لی.. جونہی ہم شاہراہ الاسکا پر رواں ہوتے ہیں تو بجائے اس کے کہ کوئی سنجیدہ سا، نیم کلاسیکی نغمہ.. موقع کی مناسبت سے.. مثلاً.. امبوا کی ڈالی پر بولے رے کوئلیا ہمارے کانوں میں اترتا ایک نہایت ہی عامیانہ فلمی گانا گونجنے لگا کہ.. بڑے ارمانوں سے رکھا ہے صنم تیری قسم.. پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم..

○●○●○

''پنک ماؤنٹین کا جھونپڑا... الاسکا 1497.7 میل دُور''

الاسکا ہائی وے.. ایک گدلے بے روح آسمان تلے بچھی.. اور اُس پر جو بادل تھے اُمڈتے نہ تھے افیونیوں کی مانند بے سُدھ پڑے تھے اور اُن میں سے بارش کی چند سُست سی بوندیں جیپ کی ونڈ سکرین پر گر کر ہولے ہولے سرکتی تھیں.. یہ ہائی وے وہاں تک جاتی نظر آتی تھی جہاں تک نظر جاتی تھی اور وہ کیسی اجڑی ہوئی اجاڑ تھی کہ دور دور تک نظر میں کوئی متحرک شے نظر میں نہ آتی تھی.. اس کے کناروں پر جو جنگلی روئیدگی تھی وہ ستمبر کے ان دنوں میں سراسر زردی کے پیراہنوں میں زرد ہوتی تھی..

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی..

دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا..

اس ویرانی کو اپنے سامنے بچھے ہوئے دیکھ کر میں ڈر کے ایک سکتے میں آیا کہ یا خدا میں کہاں آ گیا.. کن خطوں میں آ گیا اور کیوں آیا اور کیوں جا رہا ہوں..

وہ گھر ہی اچھا تھا جو اس دشت کو دیکھ کر یاد آتا تھا..

ایک بار پہلے بھی مجھ میں دُوری کا یہ ڈر آیا تھا۔ جب میں سنولیک تک پہنچا تھا تو مجھ میں یہی ڈر آیا تھا کہ میں کہاں آ گیا ہوں.. اپنے لاہور اور اپنے بال بچوں سے کتنی طویل اور پُر صعوبت مسافتوں میں آ گیا ہوں.. جہاں سے مجھے نزدیک ترین بستی تک پہنچنے کے لیے کم از کم پانچ روز کا برفانی اور مرگ آلود سفر درکار ہے..

یہاں بھی شاہراہِ الاسکا پر رواں ہوتے ہوئے دُوری کا یہی ڈر میرے بدن میں ایک سیاہ عفریت کی مانند پھیلنے لگا۔ لاہور سے تقریباً بیس گھنٹوں کی.. سمندروں پار براعظموں پار ہوائی مسافت کے بعد ایک شہر نیو یارک نام کا.. اور پھر وہاں سے کینیڈا کے نمائشی شہر ٹورنٹو کی جانب ایک پرواز۔ ذرا دم لے کر ایک اداس شہر کیلگری کی جانب تقریباً ڈھائی گھنٹے کی اُڑان.. اور پھر وہاں سے ایڈمنٹن اور ڈاسن کریک تک کی مسافت جہاں کوئی وادیٔ یُوکان ہے جس میں مجھے اترنا ہے تو.. یہاں سے گھر کتنا دور ہے؟

میرا گھر ''سنولیک'' سے اگرچہ تقریباً ایک ہفتے کی مسافت پر واقع تھا لیکن نزدیک تھا۔ اس لیے کہ سنولیک میرے اپنے وطن میں تھی.. میں اپنے گھر میں تھا..

لیکن الاسکا..

یہ جو الاسکا ہائی وے تھی، سارا برس کھلی رہتی تھی، تمام موسموں کی روڈ تھی، نہایت شاندار اور ہموار تھی، کہیں کہیں ٹوٹی پھوٹی تھی.. مرمت ہوتی رہتی تھی اور اس پر جس کسی آوارہ مزاج نے سفر کیا.. اُس نے اپنے متعدد ٹائر بیکار کیے.. در بدر ہوا.. اور جب سرخرو ہوا تو نہایت فخر سے اپنی کار پر یہ اعلان ثبت کیا کہ ''میں الاسکا ہائی وے پر سفر کر چکا ہوں'' اور کینیڈا بھر میں جس کار پر یہ عبارت رقم ہوتی اسے نہایت احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا کہ اچھا.. یہ کار الاسکا تک گئی تھی.. اس کے سامنے سرنگوں ہو جاؤ۔

میرے گھر کے ستارے کی روشنی اگرچہ مسلسل سفر میں تھی لیکن وہ مجھ تک ابھی تک نہیں پہنچی تھی.. گھر اتنا دور تھا..

کہا جاتا ہے کہ الاسکا ہائی وے کی تعمیر اینٹ، روڑے، سیمنٹ، بجری اور تارکول سے نہیں ایک عظیم رومان اور انسانی استقامت سے وجود میں آئی تھی اور اس کے اندر ایک بھید تھا۔ 1941ء میں جاپان نے امریکہ کے جزیرے ہوائی کی بندرگاہ پرل ہاربر پر ایک ایسا بھرپور فضائی حملہ کیا جس نے ایک مرتبہ تو امریکہ کو مکمل طور پر حواس باختہ کر دیا۔ جیسا کہ نو ستمبر کے حملے سے ہوا.. اور پھر امریکہ سنبھل گیا.. چوکنا ہو گیا کہ یہ بلائے ناگہانی جو نازل ہوئی ہے اسے بہرصورت زیر کرنا ہے.. وہ جو ریاست الاسکا کی ہے ہم سے صدیوں کے فاصلے پر اُس کے ساتھ ایک دائمی زمینی رابطہ ہونا چاہیے جو ظاہر ہے کینیڈا کی سرزمین کے راستے ہوگا.. ڈاسن کریک اُن زمانوں میں چند جھونپڑوں کی ایک گمنام بستی تھی جس کی آبادی کل چھ سو افراد پر مشتمل تھی.. امریکی انجینئر جن میں سیاہ فام بھی شامل تھے، اس دور دراز کے خطے میں پہنچے جو بجا طور پر خدا کا فراموش کردہ ایک ملک کہلا سکتا تھا اور انہوں نے پہاڑوں کو مسمار کر کے اور خاص طور پر مقامی مچھروں کا بے خوفی سے مقابلہ کر کے 1528 میل یا تقریباً ڈھائی ہزار کلومیٹر طویل یہ شاہراہ ایک برس کے مختصر وقفے میں تعمیر کر دی.. اس دوران تقریباً ڈیڑھ سو ندیوں اور دریاؤں پر مضبوط پُل بھی بنائے گئے.. اسے انسانی لگن اور انجینئرنگ کا ایک عجوبہ قرار دیا گیا.. بہت برسوں بعد ایک ملک پاکستان کے شمال میں پاکستانی اور چینی انجینئروں نے قراقرم کے مسلسل گرتے بھرتے پہاڑوں میں ایک ایسی شاہراہ تعمیر کی جو ایک عجوبہ نہیں ایک معجزہ تھی.. ان دونوں شاہراہوں پر سفر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ شاہراہ قراقرم کی پُرشکوہ بلندیوں کے سامنے شاہراہ الاسکا ایک کھلونا دکھائی دیتی ہے..

ایک بے دریغ وسعتوں کا حامل گدلا آسمان جس نے اپنے خیمے کی طنابیں زمین میں ٹھونک رکھی تھیں کہ ہر آسمان کو قائم رہنے کے لیے زمین کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم پر جھکتا چلا جاتا تھا اور وہ دیکھتا تھا کہ نیچے شاہراہ الاسکا پر ایک سلور کلر جیپ رینگتی چلی جاتی ہے اور وہ کبھی کبھار اشک بار ہو کر اُس پر مینہ کی چند بوندیں برسا دیتا تھا جو جیپ کی ونڈ سکرین کو یوں دھندلا دیتی تھیں کہ اس میں سوار ایک شخص اور ایک کُونج کو افق تا افق ایک ویران بھیگتی ہوئی لینڈ سکیپ دکھائی دیتی اُن کے دلوں میں خوف بھرتی تھی..

اُس شخص کا گھر بہت دور تھا اور کُونج جو آسمان چھوڑ کر آئی تھی وہ بہت، بہت دور تھا..

وہ پَر سمیٹے سمٹی ہوئی بیٹھی تھی ''تم درست کہتے تھے.. بلندیوں پر سے کسی منظر کو اپنے پروں تلے پھیلا ہوا دیکھنا کچھ اور ہوتا ہے اور اُسی منظر کے اندر زمین پر سفر کرتے ہوئے اُترنا کچھ اور ہو جاتا ہے۔''

''اس'' کچھ اور'' کے ہی تو سارے جھگڑے اور قضیے ہیں جنہوں نے نسل انسانی کو تعصب کے الاؤ میں جھونک رکھا ہے۔ ہر شخص اپنے عقیدے، اپنی تاریخ اور اپنے سچ کو کنویں کے ایک مینڈک کی مانند'' کچھ اور'' سمجھتا ہے اور اُس پر کامل یقین رکھتا ہے۔ جب کہ کچھ اور بھی '' کچھ اور'' ہوتے ہیں.. کچھ اور عقیدے، تاریخ اور یقیناً کچھ اور سچ..''

''کیا اس ویران اور تنہا کائنات میں.. جس کے اندر ہم خلائی مسافروں کی مانند بے آواز سفر کرتے چلے جارہے ہیں، کوئی بھی عقیدہ یا ایمان اہم ہو سکتا ہے.. اہم ہے تو صرف وادیٔ یُوکان جس کی جانب ہم سفر کرتے ہیں اور الاسکا جو ہماری منزل ہے.. ان دونوں کے سوا باقی سب کچھ باطل ہے۔ یہی سب سے بڑے اور آخری سچ ہیں۔''

ایک عجیب وقوعہ ظہور پذیر ہوا.. گروپ میں شامل جتنے بھی سیاح تھے، وہ ہمہ وقت چہکتے اور غُل کرتے تھے اور جونہی الاسکا ہائی وے کا آغاز ہوا وہ سب کے سب گُنگ ہو گئے.. اُنہیں تو سانپ سُونگھ گیا.. آپس میں کچھ کلام نہ کرتے تھے.. باہر کی ویرانیوں میں ڈوبے چپ بیٹھے تھے..

جب یہ طے ہو گیا کہ یہ ویرانیاں تو ابد تک ہمارا ساتھ دیں گی تو ہم کب تک ان کے ڈر میں آئے رہیں گے تو میں نے وقت گزاری کے لیے کُونج سے سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔ ''میں تمہاری نسل کی گرے کرینز کُونجوں کے بارے میں ایک معلوماتی کتابچے کا بہ غور مطالعہ کر چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ تمہاری نسل دیگر پرندوں کی نسبت کبھی ایک اور کبھی دوسرے محبوب پر پُھدکتی نہیں پھرتی، از حد وفا شعار ہوتی ہے جس کا چناؤ کر لے عمر بھر اُس کا ساتھ دیتی ہے۔ تو کیا تمہیں.. میں ایک ذاتی سا سوال پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں.. کبھی کسی سے عشق ہوا.. کوئی ایسا ہم جنس جس کے ساتھ عمر بھر کا یہ سفر گزارنے کی آرزو نے جنم لیا..''

''عشق ایک اذیت ہے۔'' بس اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

''راحت نہیں ہے؟''

''نہیں..'' وہ مغموم ہوتی گئی۔ ''ایک پرندہ تھا، میرا ہم نسل.. اگرچہ اُس کی اپنی ایک کُونج تھی، بچے تھے اور اس کے باوجود وہ میرے گھونسلے تلے برف باری کے دنوں میں بھی پھڑ پھڑاتا رہتا تھا..''

''تو پھر..''

''تو پھر یہ کہ.. ہماری جیپ کے ٹائر دھیمے ہو رہے ہیں، رُکنے کو ہیں.. ایک ویرانے میں لکڑی کا ایک کھوکھا نظر آ رہا ہے جس پر سرخ روشنائی سے لکھا ہے ''کم آن وِدئی آر اوپن'' یعنی یہاں سے ہمیں پٹرول دستیاب ہو سکتا ہے.. شاید کچھ چپس کے پیکٹ.. یا بیئر کے ٹِن وغیرہ.. سب رُک رہے ہیں..''

''یہ کونسا مقام ہے؟''

''کھوکھے کے برابر میں ایک بورڈ پر ''پنک ماؤنٹین'' پڑھا جا سکتا ہے..''

''گلابی پہاڑی؟.. کوئی مئے لالہ فام.. کہاں ہے؟''

''مجھ سے تو تم یوں پوچھتے ہو جیسے اس پنک ماؤنٹین میں میرا آبائی گھونسلا ہے۔ مُجھے کیا پتہ.. اس لکڑی کے کھوکھے میں جو بھی مقیم اور گاہکوں کا منتظر ہے۔ اُس سے دریافت کرتے ہیں کہ اس مقام کو پنک

ماؤنٹین کیوں کہا جاتا ہے۔''

ہم باہر آئے تو ایک ایسے سناٹے میں آئے جو ایک بے انت بیاباں میں ہولے ہولے گونجتا سنائی دیتا تھا.. ہمارے کان بیکار ہو گئے اُنہیں ایسی تنہائی سننے کی عادت نہ تھی..

قدرت نے جہاں انسان کو ذوق جمال کی ایک رومانویت ودیعت کی ہے وہاں اُس کے بدن میں ایسی بے اختیار مجبوریاں بھی بھر دی ہیں جو روکنے سے نہیں رُکتیں اور اگر وہ بدن زوال کی آشنائی کے مرحلوں میں ہو تو پھر وہ بالکل ہی نہیں رُکتیں..

''جاؤ..'' کُونج نے حسب عادت ایک تحکمانہ انداز میں کہا..

''کہاں..''

''کہیں بھی اور اپنے بوجھ سے نجات حاصل کر لو..''

میں کچھ خجل سا ہو گیا.. ویسے یہ کُونج بہت ہمدرد تھی، میری عمر کے برسوں کا دھیان رکھتی ہوئی میری بے اختیاریوں کو سمجھ سکتی تھی..

میں اُن سب سے ذرا الگ ہو کر.. لکڑی کے اُس کھوکھے سے ذرا دور ہو کر جہاں ایک آلودہ تالاب کے کناروں پر کچھ گھنے سرکنڈے تھے، وہاں اپنے آبی بوجھ سے نجات حاصل کر کے شتابی سے واپس آ گیا کہ کہیں قافلے کے لوگ مجھے اُس بیاباں میں بھول کر چلے نہ جائیں.. اگرچہ یہ خدشہ بے بنیاد تھا.. کُونج بے وفا نہ ہو سکتی تھی، مجھے یوں تنہا چھوڑ کر نہ جا سکتی تھی..

پنک ماؤنٹین کے اس بے حساب ویرانے میں نیلی ڈھلواں چھت کا ایک جھونپڑا یا کیبن.. لکڑی کے تختوں سے تعمیر کردہ.. تنہا.. اور یہ بھی نہیں کہ دور دور سے پُر شور اور جھگڑالو ہوائیں گونجتی ہوئی آتیں اور اُسے اپنی راہ میں پا کر اُسے لرزہ اندام کرتیں.. ہوا تو تھی ہی نہیں یہاں تو دم رکا ہوا تھا..

کیبن کی چھت پر کینیڈا کا چناری پرچم.. پھٹا ہوا اور بے جان، لہراتا نہ تھا کہ ہوا تو تھی ہی نہیں..

کیبن کی کھڑکی میں ایک سرخ سائن بورڈ ''کم اِن.. وِدئی آر اوپن''.. برابر میں ماسٹرز کارڈ اور ویزا کارڈ کی سہولت کے نشان.. اور یہ سب کچھ تو ایسا غیر معمولی نہ تھا..

غیر معمولی اور ہمیں ایک انجانے خوف میں مبتلا کر دینے والا انکشاف تو یہ تھا کہ اُس کیبن کے اندر یا آس پاس دور دور تک کوئی ذی رُوح نہ تھا.. اگر ویرانی کی کوئی روح ہوتی ہے تو وہ وہاں بہر طور تھی.. اور کوئی بھی نہ تھا..

تو پھر اُس کیبن پر جو سرخ بورڈ اطلاع کرتا تھا کہ آ جائیے.. ہم کاروبار کے لیے کُھلے ہیں تو وہاں کون ہے جو کاروبار کرتا ہے اور پھر بھی غائب ہے..

کوئی موجود نہ تھا..

بہر حال ''کم اِن.. وِدئی آر اوپن'' کے اعلان کے نیچے ایک سائن بورڈ آویزاں تھا جو کسی ماہر پینٹر کے ہاتھوں کا لکھا ہوا نہیں تھا، غالباً اُس غیر موجود کے اناڑی ہاتھوں کا زریں قلم تھا.. میں نے اُس سائن بورڈ کا ایک کلوز اپ کیمرے

میں ساکت کرلیا۔

''پنک ماؤنٹین سے ڈرائیونگ کے فاصلے''

شمال ←

فورٹ نیلسن	138.5 میل
لیرڈ کے گرم چشمے	332.2 میل
واٹسن لیک (وادیٔ یُوکان)	468.4 میل
وہائٹ ہارس (وادیٔ یُوکان)	773.5 میل
ہائنز جنکشن	843.5 میل
بیورکریک (امریکی سرحد)	1024.0 میل
فیئربینکس (الاسکا)	1343.5 میل
اینکرایج (الاسکا)	1498.7 میل

یہ فاصلے پڑھ کرہم تو حوصلہ ہار گئے، ہماری آخری منزل اینکرایج تھی جوصرف سو برس پیشتر ایک گمنام خیمہ بستی تھی اوراب الاسکا کا صدر مقام تھا اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ الاسکا کی مسافتیں کتنی طویل اور جان لیوا ہیں اوراگر بہت کم لوگ ادھر کا رُخ کرتے ہیں تو کچھ برا نہیں کرتے..اوراگر رخ کربھی لیتے ہیں تو واپسی پر اپنی کاروں پر یہ عبارت ثبت کرتے ہیں کہ..میں الاسکا میں تھا..تو بھی کچھ برا نہیں کرتے یعنی آپ اتنی مار دھاڑ کر کے اگر لاہور، نیویارک، مانٹریال، کیلگری اور ایڈمنٹن سے ڈاسن کریک میں ایک شب بسر کرنے کے بعد پنک ماؤنٹین پہنچے ہیں تو یہاں سے آگے ابھی تقریباً ڈھائی ہزار کلومیٹر کا سفر باقی ہے..تو اگر یہاں حوصلہ ہارتے تھے..تو اس کے سوا اور کیا ہارتے..

یہ ایک نادیدہ خلاء میں آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دینے والی بات تھی..

○●○●○

''میں جنگلی ہرنوں سے باتیں کرتا ہوں''

پنک ماؤنٹین کے بیاباں سناٹے میں سے باہر آئے تو وہ سب فاصلے بھی ہمارے ساتھ چلے آئے۔اینکرایج..ڈھائی ہزار کلومیٹر....کیا ہم پہنچ پائیں گے؟ اگر اس سفرنامہ الاسکا میں میرے دیگر سفرناموں کی نسبت مسلسل کشش اور دلچسپی کا فقدان محسوس ہورہا ہو تو براہ کرم مجھے دوش نہ دیجیے..میں تقریباً تین برس اسی شش و پنج میں مبتلا رہا کہ یہ سفرنامہ قلمبند کروں یا کچھ اور سفروں کی مانند اسے ایک ذاتی یادگار کے طور پر دل کے نہاں خانوں میں کہیں نقش کرلوں کہ جب جی چاہا ان میں جھانک لیا..اور اسے نہ بیان کرنے میں جو جھجک تھی اُس کی جڑیں یُوکان اور الاسکا کے ششدر کردینے والے، دل کو مسخر کرلینے والے یکتا مناظرِ فطرت میں اتنی گہرائی میں چلی گئی تھیں کہ میں اجتناب کرتا تھا..ان مناظر کی نہ تو کوئی قدیم تاریخ تھی جس کا سہارا لیا جاسکے اور نہ ہی میرے گروپ میں شامل سیاحوں کی شخصیتوں میں کوئی دلچسپ انوکھا پن تھا جس کے تذکرے سے بیانیے کو دلچسپ بنایا جاسکے..کسی سے کوئی قربت بھی نہ ہوئی کہ احساس کی سطح پر ہی کچھ گرمی اظہار ہو..یوں میں بے سہارا ہوگیا..کبھی بھی زمینی منظر یا لینڈ سکیپ یا پہاڑوں کی بلند برف سلطنتوں کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کا ذخیرہ بے حد محدود ہوتا ہے..مسلسل ایک تواتر کے ساتھ اگر آپ مناظر چاہے وہ کتنے ہی سحرانگیز اور جنت نظیر کیوں نہ ہوں بیان کرتے چلے جائیں گے تو تحریر میں بالآخر ایک اُکتاہٹ بھری یکسانیت غالب آنے لگے گی..آخر آپ تاریخ اور کرداروں اور اُن سے قربت کے بغیر کہاں تک صرف مناظر ہی مناظر بیان کرتے چلے جائیں گے..تب میرے وجود کے اندر اُس کونج نے جنم لیا جس نے مجھے حوصلہ بخشا اور اپنی رفاقت کا سہارا دیا..اور میں نے ہمت کر کے اس سفرنامے کا آغاز کردیا..

''کہاں ہو؟'' کونج پوچھتی تھی..

''کہیں دل کے نہاں خانوں میں..لیکن ہم کہاں ہیں؟''

''ہم نہایت طویل فاصلے طے کر کے پنک ماؤنٹین سے بہت دور آگئے ہیں..تم تو گم بیٹھے رہے، اتنے ساکت کہ تم پر ایک مجسمے کا گمان ہونے لگا..اور اس دوران راستے میں درجن بھر دریاؤں کو ہم نے پار کیا..بہت سی ویران جھیلوں کے کناروں پر دیر تک سفر کرتے رہے اور تم گم بیٹھے رہے..اب ذرا ہوش میں آجاؤ تو تمہیں ونڈ سکرین پر اُمڈتے سرسبز جنگلوں سے ڈھانپے ہوئے پہاڑوں کے سلسلے نظر آنے لگیں گے..اور ذرا آنکھیں کھولو تو ان جنگلوں میں سے ظاہر ہو کر شاہراہ کے کناروں پر محوِ خرام ہونے والے ہرنوں کو دیکھ سکو گے..''

''ہرن؟..'' میں ایک بچے کی مانند خوش ہو گیا۔ ''جنگلی ہرن؟''

''تم ان سے باتیں کرنا چاہتے ہو؟'' جیپ رُکنے لگی۔

''پتہ نہیں وہ مجھ سے باتیں کرنا پسند کریں گے یا نہیں..لیکن وہ ہیں کہاں؟''

''تم اتنی دیر سے آلتی پالتی مارے اپنی نشست پر دھونی رمائے بیٹھے ہو..ذرا اپنی ٹانگیں نیچے کر کے اپنی سینڈل پہنو اور جیپ سے باہر آ جاؤ..''

جیپ ایک محفوظ گھر تھا..جب میں سینڈل پاؤں میں اڑس کر باہر آیا تو جنگلوں سے ڈھکے نیلے پہاڑوں کا ایک وشت بے پناہ تھا جو مجھے تنہا پا کر میری جانب ہجوم کرتا چلا آیا..سورج لگتا تھا کہ ہم سے بھی زیادہ تھک چکا تھا..غروب کی ساعتوں سے ابھی ذرا پرے ایک کاہل کیفیت میں تھا کہ ڈوب جاؤں یا ابھی قدرے توقف کر لوں..اور اُس زرد پڑچکے سورج کے چہرے میں سے جو آخری کرنیں اور وہ بھی تھکاوٹ سے چُور جنم لیتی تھیں شاہراہ کے کناروں پر جو ذی شان اور عالی شان جانور کھڑے تھے اُن کے بھورے اور سرمئی بدنوں کو بھی زردی میں ڈھالتی تھیں..

وہ بے خطر اور پُرشکوہ مجسمے تھے جنہیں ابھی ابھی مجسمہ ساز نے تراش کر شاہراہ کے کناروں پر نمائش کے لیے ایستادہ کر دیا تھا..

کینیڈا کے صوبے برٹش کولمبیا اور وادیٔ یُوکان میں جنگلی حیات کی بہتات ہے بلکہ شاید اُن کی تعداد انسانوں کی آبادی سے کہیں تجاوز کرتی ہے۔ ان خطوں میں سفر کرنے کے دوران ان کی موجودگی سے آگاہی یوں ہوتی ہے کہ سڑک کے کنارے دو چار کاریں کھڑی ہوں گی اور اُن کے مسافر منہ اٹھائے پُر اشتیاق نظروں سے جنگل کے گھنے پن کو تکتے جا رہے ہیں کیونکہ وہاں کوئی جنگلی جانور ہے جو حرکت کر رہا ہے۔ چنانچہ آپ بھی رک جاتے ہیں..اُن مسافروں کی نظروں کی سمت میں اپنی نظریں دوڑا دیتے ہیں اور..وہاں واقعی کچھ نہ کچھ ہوتا ہے..کچھ بھی..جنگلی بھینسے، ہرن، ریچھ یا کوئی نیل گائے..

لیکن یہاں..الاسکا ہائی وے کی سنسناتی تنہائی میں جو دل میں ہول بھرتی ہے..جہاں ٹریفک برائے نام ہوتی ہے..مسافت میں ایک گھنٹہ بیت چکا اور نہ سامنے سے کچھ آتا دکھائی دیتا ہے اور نہ عقب سے کوئی کار ظاہر ہوتی ہے تو یہاں ان ہرنوں کو دیکھنے کے لیے کوئی پُر شوق جمگھٹا نہ تھا..

بس میں تھا اور وہ تھے..

مُجھے ان آزاد حیوانوں کے چہرہ بہ چہرہ روبرو ہونا مُجھے بہت راس آیا..بہت بھلا لگا..جیسے مجھ میں اور اُن میں نسل کا کچھ فرق نہ تھا بلکہ معاملہ کچھ برعکس ہو گیا تھا..یعنی تماشا وہ نہ تھے میں تھا..وہ اپنے جنگلوں میں سے ظاہر ہو کر مجھے..ایک شہری حیات کو دیکھنے چلے آئے تھے..

سمیر بھی جیپ سے باہر آ چکی تھی اور اُس کی سحر سیاہ آنکھیں بھی ہرنوں کے بدنوں کی مانند زردی میں ڈھل [illegible] ''کیا میں آگے بڑھ کر انہیں تھپک سکتا ہوں..انہیں پیار کر سکتا ہوں؟''

[illegible]''

جیسے ہمارے ہاں کے ناپید ہوتے کھدر کے کُرتے اور پگڑی میں ملبوس سُتھرے بزرگ کسی بچے کے سر پر پیار دینے کے لیے ہتھیلی پھیلائے شفقت سے اُس کی طرف بڑھتے تھے میں بھی اسی انداز میں نرم نرم پاؤں دھرتا ہتھیلی آگے کیے اُن کی جانب بڑھا کہ کہیں وہ مجھ سے بدک کر جنگل میں نہ اُتر جائیں..

وہ سرمئی بدن کے کچھ زرد ہوتے ہرن مجھ سے قطعی طور پر لاتعلق تھوتھنیاں اُٹھائے بے مقصد کھڑے رہے..

وہ کچھ ایسے حسین نہ تھے..بس ہرن تھے..

وہ ایک صحرائی شام کی گلاب رنگتوں میں بہاولپور کے لال سوہانڑا پارک میں زقندیں بھرتے کسی مس یونیورس کی بدنی بناوٹ رکھنے والے بلیک بک ہرن نہ تھے..

یہ وہ غزال بھی نہ تھے جو دشت بھر کے ایک اور غزال کو دیکھتے تھے اور جن سے پوچھا جا سکتا تھا کہ..غزالاں تم تو واقف ہو..کہ دیوانے پہ کیا گزری..یہ اپنے نہ تھے اجنبی سرزمینوں اور ناواقف موسموں کے ہرن تھے جن سے میرا کچھ تعارف نہ تھا اور نہ ہی وہ مجھے پہچانتے تھے..وہ پنک ماؤنٹین سے طویل فاصلوں پر کہیں کسی انجان خطے میں ڈھلتے سورج کی زردی میں میری نظروں کے سامنے تھے...یہ وہ غزال نہ تھے جو مجھ سے واقف تھے۔

میں اُنہیں پیار دینے کی خاطر ہولے ہولے اُن کی جانب بڑھا، نہ تو وہ میری آہٹ سُن کر ٹھٹھکے اور نہ ہی کوئی آہو چشم نظر التفات کی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُن میں سے ایک کی تھوتھنی کو تھپک کر اُسے پیار کیا..میری کھلی ہتھیلی میں اُس کے بدن کی حدّت سرایت کی۔ وہ ہرن ہرگز ہراساں نہ ہوا بلکہ حیرت سے مجھے بے خطر تکنے لگا..وہ آگاہ تھا کہ ان خطوں کے لوگ اُنہیں گزند نہیں پہنچاتے اور اگر وہ یہ جان جاتا کہ جس خطے سے میں آیا ہوں وہاں انہیں وہ جو سیاسی اور زمینی طاقت والے مسخرے فرعون ہیں اپنی شادیوں کی دعوت میں اُنہیں سینکڑوں کی تعداد میں ہلاک کر کے اُن کا گوشت نہایت فخر اور تکبر سے مہمانوں کو پیش کرتے ہیں تو وہ فوری طور پر خوفزدہ قلانچیں بھرتا نزدیکی جنگل میں روپوش ہو جاتا..

ایک سرائیکی شاعر آشولال نے کسی سرکاری دعوت میں ہرن کا گوشت کھانے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر میں اسے کھاؤں تو گویا اپنی ماں کا مردہ گوشت کھاؤں..اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ نہ وہ بلیک بک ہرن تھے اور نہ ہی اداس آنکھوں والے غزال..محض ہرن تھے۔ لیکن وہاں..پنک ماؤنٹین سے بہت فاصلوں پر..شاہراہ الاسکا کے کناروں پر ڈھلتے سورج کی زردی میں وہ مجھے اُن سے کہیں شاندار دکھائی دیئے کہ ہم روبرو تھے اور اُن میں سے ایک نے مجھے پیار کرنے کی اجازت دی تھی..اور شاید گردن کو ذرا جھکا بھی دیا تھا، وہ تھپکی وصول کرنے کے لیے..

جیپ کا ہارن بے تابی سے غل کرنے لگا..اور اُس کے اذیت بھرے شور سے وہ ہرن پہلی بار ہراساں ہوئے اور جنگل میں اتر کر اُس کی گھنی تاریکیوں میں کھو گئے..

اگرچہ وہ کھو چکے تھے، گم ہو گئے تھے..شاہراہ کا وہ کنارا جہاں وہ ابھی ابھی دیو مالائی مجسموں کی مانند ایستادہ تھے، ویران ہو چکا تھا لیکن..پھر بھی اُن کی شباہتیں مجھے وہاں نظر آتی رہیں..وہ جہاں جہاں کھڑے تھے وہاں اُن کے نقش ثبت ہو چکے تھے۔

جیپ کا ہارن طیش میں آ گیا..مسلسل بجنے لگا..

○●○●○

”خالص تارڑ رُوح کُونج پر آشکار ہوتی ہے“

”ہم یُوں تو کبھی الاسکا پہنچ نہ پائیں گے..“ میں جیپ میں سوار ہو رہا تھا جب کُونج نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔
”اگر تم ان راستوں میں ظاہر ہونے والے ہر جنگلی جانور کو منہ کھولے حماقت سے تادیر تکتے رہے تو ہم الاسکا پہنچ چکے۔“
”اور وہاں پہنچ کر کرنا کیا ہے کُونج..“ اُس کی خفگی رفع کرنے کی خاطر میں زبردستی مسکرایا ”یہ کوئی مراتھون دوڑ تھوڑی ہے کہ بہر طور بیالیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے سرخ فیتے کے ساتھ سینہ لگا کر اپنی جیت کا اعلان کرنا ہے.. ہمارے ایک نہایت مدبّر زمیندار تارڑ بزرگ جوا کھیلنے کے بے حد شوقین ہیں.. جب بھی دل میں امنگ پیدا ہو ہاتھوں میں تسبیح پھرولتے، تہجد کبھی نہ قضا کرتے یورپ کے قمار خانوں کا رُخ کرتے ہیں.. کوئی ایک شام اُن کے لیے خوش نصیب ہوگئی اور وہ رولیٹ ٹیبل پر یوں جیتتے چلے گئے کہ اُن کے آگے ہزاروں ڈالروں کے ٹھیپوں کے ڈھیر لگ گئے تو اُن کے ایک رفیق نے اُن سے کہا کہ چوہدری صاحب آج تو آپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ ماشاءاللہ جیت کے ڈھیر بلند ہوتے چلے جاتے ہیں.. تو اُنہوں نے بے اعتنائی سے کندھے سکیڑ کر کہا تھا.. چوہدری صاحب یہ ہار جیت میرے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ مجھے طمانیت تو ہوئی ہے کہ میں مسلسل جیت رہا ہوں لیکن.. میں تو صرف جوا کھیلنے.... دولت کو داؤ پر لگانے کے ہیجان خیز عمل سے لطف اندوز ہوتا ہوں.. تو اے کُونج.. میں تو اس طویل گمراہ کر دینے والے سفر کی لذت سے حظ اٹھاتا ہوں.. جیت جانا.. الاسکا پہنچ جانا میرے لیے کچھ معنی نہیں رکھتا..“

کُونج ذرا چونکی ہوگئی ”تم بھی تو تارڑ ہو..“

”میں ہوں..“

”تو تم بھی اپنے بزرگوں ایسے ہو؟“

”بدقسمتی سے میں اپنے ایسے بزرگوں پر نہیں گیا.. اُن جیسا نہیں ہوں.. ورنہ روایت ہے کہ ایک تارڑ بزرگ نے کسی جھاڑی پر سوکھتے سرخ دوپٹے کے قریب ہو کر دھونی رمالی.. کہ کبھی تو یہ بولے گی.. وہیں منتظر فوت ہو گئے.. اور نہ ہی میں اتنا بے بہا ثروت مند ہوں کہ اپنی خون پسینے کی لکھائی کی کمائی رُولیٹ کے میز پر داؤ پر لگا دوں.. بدقسمتی سے مجھ میں تارڑوں والے چند خصائل موجود نہیں۔“

”اور وہ خصائل کیا ہیں؟“ کُونج خفگی فراموش کر چکی تھی..

”مجھے شروع سے ہی صبح کی سیر کی علت ہے.. سرما کی ایک دھندلی سویر میں باغ جناح میں چلا جاتا ہوں اور کیا

دیکھتا ہوں کہ سامنے دھند میں سے ایک بزرگوار جھومتے ہوئے جوگنگ کرتے چلے آ رہے ہیں.. نفاست سے بنے ہوئے سفید بال جولفوں کی صورت میں گردن تک آتے تھے، سیاہ شیروانی اور کھڑکھڑاتے لٹھے کی شلوار میں ملبوس پاؤں میں جوگرز کی بجائے ایک طلائی کھسہ اور اُن کے برابر میں ایک ناتواں سا شخص، حقہ اٹھائے اُن کا ہم قدم ہوتا.. وہ دونوں میرے پاس سے گزر گئے اور چند لمحوں بعد وہی حقہ بردار سانس پھولا ہوا میرے پیچھے چلا آتا ہے کہ.. آپ کو چوہدری صاحب بلاتے ہیں.. میں ذرا بھنا گیا.. اوئے کونسے چوہدری صاحب.. تو اُس نے مجھ پر ایک نظرِ حقارت ڈالی کہ جانتے نہیں کون سے چوہدری صاحب.. اور پھر بولا ”چوہدری قادر بخش تارڑ..“
چونکہ قبیلے کے بزرگ تھے اس لیے تعظیم کرنی پڑی اور چوہدری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے ہمراہ ہولے ہولے جوگنگ کرنے لگا.. مُجھے کچھ وہم سا ہوا کہ اُس سرد سویر میں جو شفاف ہوا ہے اُس میں کسی نہایت بڑھیا سکاچ وسکی کی مہک کی آمیزش ہو رہی ہے اور یہ مہک چوہدری صاحب کے سراپے میں سے جنم لے رہی ہے.. اُنہوں نے پہلے تو نہایت مربیانہ انداز میں میری کچھ توصیف کی کہ فیض صاحب کے بعد تم دوسرے جاٹ ہو جس نے ادب کی دنیا میں کھلبلی سی مچادی ہے اور تارڑوں کا تو نام روشن کر دیا ہے اور پھر یونہی سرسری انداز میں پوچھا ”نوجوان...“ کہ میں تب یقین کرو نوجوان تھا ”کوئی مُجرے شُجرے کے بھی شوقین ہو کہ نہیں؟“
”نہیں چاچا جی..“ میں نے مؤدب ہو کر کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ مُجھے مُجرے شُجرے سے کبھی بھی شغف نہیں رہا..
چند لمحے اِدھر اُدھر کی رسمی گفتگو میں بیت گئے اور پھر یکدم انہوں نے کہا ”نوجوان.. تم کچھ گھونٹ شونٹ بھرنے کے بھی شوقین ہو کہ نہیں؟“
ایک تو وہ میرے بزرگ تھے اور پھر ملاقات بھی پہلی تھی تو میں اُن کے ساتھ کیسے فرینک ہو جاتا، میں نے ایک مسکین سی آواز میں کہا ”نہیں جی۔“
اور پھر سیر کے اختتام پر تیسرا اور آخری سوال آیا ”اچھا تو پھر.. کبھی افیون کا شوق بھی کیا ہے کہ نہیں؟“
میں نے زور زور سے سر ہلا کر گھگھیائی ہوئی آواز میں کہا ”نہیں جی.. بالکل ہی نہیں جی۔“
چاچا تارڑ رُک گئے.. حقے کا ایک کش لگایا اور پھر مُجھے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے بولے ”مُجرے کے تم شوقین نہیں ہو.. گھونٹ تم نہیں بھرتے.. افیون تم نہیں کھاتے تو.. تم کیسے تارڑ ہو؟ تو کُونج میں اپنے قبیلے کی فخریہ پیشکش نہیں ہوں.. اگرچہ چاچا رفیق تارڑ بھی تارڑی کے اس امتحان پر پورے نہیں اُترتے۔“
”لیکن تم میں تارڑوں کی ایک خصلت تو بدرجۂ اتم موجود ہے..“ کُونج نے اپنی لامبی گردن میں بل دے کر مُجھے اک ادا سے دیکھا ایسے کہ میں گھائل ہوتا ہوتا بچا ”میں تمہاری نظروں کا پیچھا کرتی رہتی ہوں اور وہ ہمیشہ کسی نہ کسی خوش نظر چہرے پر ٹھہر جاتی ہیں.. یہاں تک کہ تم نے جیپ سے اُتر کر جس ہرن کو پیار دیا تھا وہ بھی ایک ہرنی تھی.. ابھی تک الاسکا کے راستے میں کوئی ایسی جھاڑی نہیں آئی جس پر کوئی سرخ اوڑھنی سوکھتی ہو ورنہ تم مجھے ترک کر کے اس کے پاس ہو بیٹھتے کہ کبھی تو بولے گی..“
یہ ایک بکواسی کُونج تھی جس کے ساتھ میں بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا کہ یہ ایک تارڑ نہیں ایک مرد خصلت

ہے، وارث شاہ کے بقول اس عمر میں بھی پہنچ کر طبع حرص سے باز نہیں آتی۔ تو یہ محض حرص ہے..

''تم نے میرا چناؤ بھی اسی لیے کیا تھا کہ میں ایک عورت گونج ہوں۔''

''میں ایک مرد گونج کا چناؤ کیسے کرتا کہ میرے کوہ نورد ساتھی میاں فرزند علی کے بقول.. یہ میرا ڈیپارٹمنٹ ہی نہیں ہے۔''

گونج ہنس دی۔ چونچ کٹکٹا کر ہنس دی ''ویسے میں ایک خالص تارڑ روح کو دیکھ رہی ہوں اور یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ یہ رُوح خوراک کے بغیر ناتواں سی ہو رہی ہے۔ کیا تم بھوک محسوس کر رہے ہو؟''

میرے اندر ایک ناتواں خلاء نے دوہائی مچا دی۔ میں اُن غزالوں کو بھولا.. الاسکا ہائی وے کی جادو نگری کو فراموش کیا اور گونج کے یاد دلانے پر مجھے یاد آیا کہ میں.. بہت بھوکا تھا۔ ''ہاں.. میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تو ہاں میں بھوکا ہوں۔''

''تو تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے.. نقشے کے مطابق اگلے دو سو کلو میٹر کے راستے میں کسی ریستوران یا کافی بار کی کہکشاں نہیں ہے، فی الحال انہی پتھروں پر چلتے جانا ہے.. ہاں تم اپنی بھوک کو بہلانے کی خاطر اُن مُجروں کے بارے میں سوچو جن کے تم شوقین نہیں ہو.. اُن گھونٹوں کے بارے میں غور کرو جو تم نے شاید بھرے ہیں یا نہیں بھرے.. اور افیون کی اُن گولیوں کے بارے میں تفکر کرو جو تم نگل نہیں سکے۔''

ایک پل میں کچھ اور دوسرے پل میں کچھ اور.. کبھی رتی کبھی ماشہ.. گونج میں جہاں اُلفت کے نچھاور پن کی آبشاریں تھیں وہاں طنز کے بے رحم کچوکے اور بے درد بے رُخیاں بھی تھیں...

بے انت ویرانوں اور بے حساب سناٹوں میں سے یکدم شاہراہ کے کنارے پر نمودار ہونے والے گیس سٹیشن پر ہم رُکتے گئے.. نقشے یہ بھی خبر کرتے تھے کہ یہاں سے آگے کئی سو کلو میٹر تک پٹرول دستیاب نہیں اس لیے اپنی سواری کا پیٹ بھر لیجیے۔

گیس سٹیشن کی ویرانی سے ملحق ایک چوبی عمارت تھی جس میں سے ایک ٹین ایج لڑکا نمودار ہوا۔ بگٹٹ بھاگتا آیا اور ہماری آؤ بھگت میں کچھ کسر اُٹھا نہ رکھی ''میں آپ کو تہہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔'' وہ ایک سدھائے ہوئے طوطے کی مانند بولتا چلا گیا۔ ''میں آپ کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہوں.. مجھے امید ہے کہ آپ میری سروس سے کلی طور پر مطمئن ہوں گے اور آپ کو مجھ سے کچھ شکایت نہ ہوگی.. آپ کو کتنے گیلن گیس درکار ہے۔ پلیز آپ نے مجھے دیکھ کر مسکراتے رہنا ہے کہ میری ماما ہمارے چوبی گھر کی ایک کھڑکی میں کھڑی مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اُس نے.. اور میں اپنی ماما سے محبت کرتا ہوں.. اس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اگر تم یہاں سے کبھی کبھار گزرنے والے گاہکوں کو عمدہ سروس مہیا نہیں کرو گے تو میں تمہیں رات کے کھانے میں ایک چکن پیس کی بجائے صرف اُبلے ہوئے کچھ آلو دوں گی.. تو آپ جو حکم کردیں گے میں اُس کی تعمیل کریں گا ورنہ.. مجھے چکن پیس نہیں ملے گا۔''

اور واقعی اُس کی سخت گیر ماما کا چہرہ ایک کھڑکی میں سے جھانکتا نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ ہم اُس کے چکن پیس کی خاطر خوب مسکرائے اور پٹرول کی قیمت ادا کرتے ہوئے اُسے مناسب ٹپ بھی دیا..

مخالف سمت کی چند لمحوں میں اُترنے والی شب تنہائی میں سے ایک نیلی کار برآمد ہوئی اور رُکتی تھمتی ہمارے برابر میں آ کر رُکی۔

وہ ایک نہایت شریف الطبع قدرے معصوم سا درمیانی عمر میں ڈھلتا جوڑا تھا۔ اُن کی پرانی کار کا نمبر AXPL-318 تھا۔ مرد نے جین کے ساتھ ایک فضول سا دھاری دار سویٹر پہن رکھا تھا اور اُس کی بیوی جو شاید دو تین بچے جننے کے بعد اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ چکی تھی ایک نہایت دبیز اونی سویٹر میں ملبوس تھی جو اُس کی دوہری ٹھوڑی تک آتا تھا.. اور وہ خوش مزاجی سے اپنی عینک کے پیچھے سے مسکراتی جاتی تھی.. ''آپ ہمارے ایسے پہلے پاکستانی ہیں جو یہاں آباد نہیں ہیں، پاکستان سے صرف سیاحت کے لیے آئے ہیں لیکن آپ یہاں یوکان میں کہاں آ گئے..''

چونکہ وہ مخالف سمت سے آ رہے تھے، اُدھر سے آئے تھے جدھر ہم جا رہے تھے تو ہم نے درپیش راستوں اور اُن راستوں میں پڑتے ٹھکانوں کے بارے میں سوال کیے۔

''یہاں سے آگے واٹسن لیک تک سوائے ویرانی کے اور کچھ نہیں.. کچھ آبادی نہیں۔ صرف کول ریور کے مقام پر ڈونا ہے.. اور وہ کیسی پیاری اور کام آنے والی ڈونا ہے۔'' عورت نے اپنے مرد سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں ہاں.. ڈونا.. پیاری اور گھریلو ڈونا.. اگر آپ تاریکی اترنے سے پہلے پہلے کول ریور پہنچ جاتے ہیں تو وہ آپ کو کچھ خوراک مہیا کر سکتی ہے لیکن کچھ خواب نہ دیکھیے گا کہ یہ یوکان ہے۔ ڈونا آپ کو جنگلی بھینسے بسون کے گوشت کے برگر کھلا سکتی ہے۔ اگر آپ تاریکی اترنے سے پیشتر وہاں تک پہنچ جائیں.. ویسے وہ بہت مہنگی ہے.. جتنی قیمت وہ وصول کرتی ہے میرا یقین ہے کہ اتنی قیمت میں ایک پورا بھینسا خریدا جا سکتا ہے..''

''یہ جو ہمارے آج کی منزل واٹسن لیک ہے وہاں آپ تو ٹھہر کے آئے ہیں تو ٹھہرنے کے لیے وہاں کونسا مناسب اور شریفانہ مقام ہے..''

''ایئر فورس میس..'' عورت نے سفارش کی۔ ''ہم نے پچھلی شب وہیں بسر کی.. صفائی ستھرائی میں بے مثال.. لیکن صرف ایک قباحت ہے کہ غسل خانے برآمدوں میں ہیں، کمروں کے ساتھ ملحق نہیں ہیں۔''

''آپ الاسکا سے لوٹ رہے ہیں تو ہمیں بتایئے کہ ان راستوں میں وہ کونسے منظر تھے جنہوں نے آپ کے قدم روک لیے۔''

''ٹیلر روڈ..'' وہ دونوں بیک آواز پکارے۔ ''ٹاپ آف دی ورلڈ روڈ..''

پاکستان واپسی پر ایک شب میں نے اُس کارڈ پر درج شدہ نمبر گھمایا جو اُس جوڑے نے مجھے عطا کیا تھا.... کیا آپ واقعی وہ پاکستانی ہیں جو ہمیں الاسکا ہائی وے پر ملے تھے.. اور آپ نے ہم دونوں کو یاد رکھا اور ہم اکثر تذکرہ کرتے تھے کہ کیسے واٹسن لیک سے آتے ہوئے آپ ہمیں اُس گیس سٹیشن پر ملے تھے۔ کیا آپ وہی ہیں۔ یقین نہیں آتا، اگر کبھی آپ کا دوبارہ کینیڈا آنا ہوا تو آپ جانتے ہیں کہ ہم کہاں ہیں اور آپ کے منتظر ہیں۔

ہم نے سفر اختیار کیا۔

شام ڈھلتی تھی۔ آس پاس کے گھنے شجر ذخیرہ کی سیاہی جیپ کے اندر تک چلی آتی تھی..

○●○●○

’’کوئلہ دریا..ڈونا پھوپھی کا کیبن اور بھینسا برگر‘‘

ایک مسلسل اکلاپے کی مسافت کے بعد کول رِور یا کوئلہ دریا کے نام کے علاقے کے آثار اُس ڈھلتی شام میں ظاہر ہوئے۔

گونج اظہار تو نہ کرتی تھی پر اُس کے پُرتھکاوٹ سے ڈھیلے پڑ چکے تھے..چند چوبی اور بے حد اداس کیبن شاہراہ کے کناروں پر کسی کے بھی منتظر نہ تھے۔وہ اتنے تنہا اور شب کے ڈھلنے کی اداسی میں تھے..پس منظر میں ایک بھائیں بھائیں کرتا گھنا جنگل تھا..

اور بس یہی کول رِور تھا..کوئلے کا دریا تھا..

ایک خستہ حال چوبی عمارت کے جنگلے کے ساتھ ایستادہ بورڈ پر ایک عبارت رقم تھی..

"FRESH HOME MADE CINNAMON BUNS AND PIES."

یہ سنامین جانے کیوں ہر امریکی اور ہر کینیڈین کے حواس پر سوار ہو گئی تھی۔اسے..سنامین کو..نہ صرف کیکوں اور پیسٹریوں..بلکہ بے شمار خوراکوں میں شامل کیا جاتا تھا..

اور یہ جادوئی شے سنامین کیا تھی؟

اپنی..دیسی دار چینی تھی جو ہزاروں برسوں سے ہماری خوراک کے ایک لازمی جزو کی حیثیت سے چلی آتی تھی۔ مغرب نے اسے دار چینی کو ابھی حال ہی میں دریافت کیا تھا اور وہ اس کے چلبلے ذائقے کا اسیر ہو گیا تھا..

وہاں زندگی کے کوئی آثار نظر تو نہ آتے تھے..

کیبن کے دروازے کو دھکیلا تو وہ ایک بیزار چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔اندر ایک نہایت گھریلو اور دیہاتی قسم کا ماحول تھا۔چوکور چوبی چوکھٹے جو کھڑکیوں کا کام دیتے تھے اور اُن کے آگے دیہاتی سے پھولدار پردے...پرانے شیشے کے ایک شوکیس میں سجے وہ بَن اور پائیاں جو اس ادارے کی خصوصیت تھیں۔کچھ بے رُوح سے کیک..چاکلیٹ..چیونگم اور...آتش بازی کا کچھ سامان..انار اور پھول جھڑیاں وغیرہ..

اس شوکیس کاؤنٹر کے پیچھے حرکت کرتی سفید ٹی شرٹ اور جین میں اپنی پونی ٹیل لہراتی ایک خاتون جو کہ ڈونا تھی لکڑی کے دروازے کے دھکیلنے سے جو چرچُوں ہوئی تھی اُس کی آواز سن کر ہماری جانب متوجہ ہو چکی تھی۔اس کاؤنٹر کے علاوہ بقیہ کیبن میں معمولی نوعیت کی کچھ لکڑی کی کرسیاں جو اپنی طبعی عمر پوری کر چکی تھیں اِدھر اُدھر پڑی تھیں..فرش پھولدار ریکسین سے ڈھکا ہوا تھا..

اس گھریلو ریستوران کے ایک کونے میں تعداد میں پورے پانچ نہایت ہٹے کٹے مشٹنڈے، بھاری تن و توش کے، دبیز سرخ گردنوں والے مقامی حضرات جن میں سے کوئی ایک بھی اگر کسی ویران گلی میں رات کے وقت آپ کے سامنے نمودار ہو جائے تو آپ اپنی پیاری جان کے تحفظ کی خاطر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھیں..اور وہ حیرت انگیز طور پر شراب تو کیا بیئر بھی نہیں پی رہے تھے بلکہ منرل واٹر کی بوتلوں کو تھامے پانی کی چسکیاں لگا رہے تھے..دھیمی آواز میں گپ شپ کر رہے تھے..گھسی پٹی جینوں، بدرنگ اور ادھڑتے ہوئے فُل بوٹوں میں، بوسیدہ جیکٹوں میں..لگتا تھا کہ نہ تو برسوں سے نہائے ہیں اور نہ ہی شیو بنانے کا تردد کیا ہے..

ایک بار تو اُن کی ہیبت سے ہراساں ہو کر فوری طور پر وہاں سے فرار ہو جانے کا سوچا اور پھر اپنے بھوکے پیٹ کا خیال آیا کہ اگلے کئی سو کلومیٹر تک اسے بھرنے کا کچھ سامان میسر نہ تھا..

لکڑی کے دروازے کی چرچُوں نے اُنہیں بھی متوجہ کر لیا تھا کہ سرِشام کول رِور کی اس کیبن میں کون آ گیا ہے..

مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں ایک تعجب آیا..پھر اُن کی نظریں گونج پر ٹھہر گئیں۔اُسے نظر بھر کے دیکھا اور پھر بظاہر ہم سے غافل ہو کر پانی کا ایک ایک گھونٹ بھر کر واپس اپنی دھیمی گفتگو میں چلے گئے..

اُنہوں نے جس طور نظر بھر کر گونج کو دیکھا تھا مجھے اچھا نہ لگا..مجھے اُن کی نیت پر شک ہوا کہ جانے یہ مشٹنڈے یونہی کول رِور کی اس کیبن میں سرِشام آ بیٹھتے ہیں اور جو مسافر یہاں آ رُکتے ہیں اُنہیں..

’’آپ ڈونا ہیں؟‘‘ میں نے اپنا ہراس پوشیدہ رکھنے کی خاطر کاؤنٹر کے پیچھے چلتی پھرتی دیہاتن سے دریافت کیا۔

’’تم کیسے جانتے ہو کہ میں..ڈونا ہوں۔‘‘ ایک متحیر مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔میں اُن پانچ مشٹنڈوں کے ڈر میں آیا ہوا کچھ زیادہ ہی چلبلا ہو گیا۔’’ویل لیڈی..میں پرندوں سے باتیں کر سکتا ہوں، اُن کی بولی سمجھ سکتا ہوں تو ایک نہایت مختصر پور برابر پرندے نے گنگناتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ جب تم پنک ماؤنٹین سے آگے اُس جنگلی تنہائی میں سفر کرو گے جہاں سینکڑوں کلومیٹر تک نہ تو کوئی آبادی ہو گی اور نہ ہی کوئی ریستوران..تو ہمت نہ ہارنا..وہاں ڈونا ہو گی..کول رِور کے کنارے ایک مہربان خاتون ڈونا نام کی ہو گی جس کے کیبن ریستوران میں تمہیں پناہ کے علاوہ کچھ کھانے کو بھی مل جائے گا..‘‘

’’میں اتنی بھولی نہیں ہوں کہ پرندے والی کہانی پر یقین کر لوں۔‘‘ وہ ہنسنے لگی۔’’مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے کیسے جانتے ہو..ابھی دو گھنٹے پیشتر الاسکا سے لوٹتے ایک میاں بیوی میرے ریستوران میں آئے تھے..وہ ڈاسن کریک کی جانب جا رہے تھے..وہی تمہیں کہیں راستے میں ملے ہوں گے۔اس شاہراہ پر بہت زیادہ مسافر نہیں ہوتے۔‘‘

میں نے مسکراتے ہوئے ہُوں ہاں کرتے اقرار کر لیا۔

’’بہر طور خوش آمدید..آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟‘‘

اُس نے کاؤنٹر سے باہر آ کر ہمیں اُن پانچ مشکوک مشٹنڈوں کے برابر میں ایک میز پر جا بٹھایا اور اُن کم بختوں نے کن اکھیوں سے گونج پر جو نظر ڈالی، بری نظر ڈالی۔’’آپ کے ہاں کھانے کے لیے کیا کیا ہے؟‘‘

’’میں آپ کو جنگلی بسون کے گوشت کے برگر کھلا سکتی ہوں لیکن ساتھ میں سلاد نہیں ہو گی۔آملیٹ بھی مل سکتا ہے۔‘‘

’’اور اس کے علاوہ کچھ اور؟‘‘

''یہ کول ریور ہے..'' وہ مسکرائی۔ ''اس کے علاوہ یہاں اور کچھ نہیں ہے..اور یہ جنگلی بسون آج صبح ہی شکار کیے گئے تھے جن کے برگر میں آفر کر رہی ہوں۔''

میرا چہرہ اُتر گیا۔

مجھے کم از کم ایک بڑے، دبیز، پنیر سے لتھڑے ہوئے پیزے کی دستیابی کی توقع تھی اور زیادہ سے زیادہ ایک سالم روسٹ چکن کی خواہش تھی۔ بہت برس گزر چکے تھے اس قصے کو جب صرف آتش بلکہ آتش کے نزدیکی دوست بھی جوان تھے جب میں خاور زمان اور طیب حسن کو بہلا پھسلا کر کوہ نوردی پر مائل کر کے وادیٔ کاغان میں پارس کے گاؤں کے اوپر گھنے جنگلوں میں بسیرا کرتے ہوئے شاران بنگلے تک لے گیا تھا۔ ہم تینوں شدید گرمی میں ایک عمودی پہاڑ پر چڑھنے کی مشقت کرتے..سارا دن ہانپتے چڑھتے بھوک سے اتنے نڈھال کہ اوندھے ہو کر گہرائی میں رواں دریائے کنہار میں گرنے سے بال بال بچتے..میں اپنے آپ کو اور وہ دونوں مجھے کوستے..راستے میں ایک گڈریا ملتا ہے..صاحب غم نہ کرو..بھوک لگا ہے۔ ابھی اوپر پہنچے گا تو وہاں ایک بازار ہے جہاں کھانے کو دنیا جہان کا چیز ملے گا..

''پراٹھا اور انڈہ ملے گا؟'' طیب پوچھتا ہے۔

''دنیا جہان کا خوراک ملے گا صاحب۔''

بالآخر ہم اُس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ پہنچ کر ڈھیر ہوئے۔ پھر بھوک اور پیاس سے مغلوب ہو کر ذرا گردنیں بلند کر کے آس پاس دیکھا۔ ذرا فاصلے پر لکڑی کا ایک عارضی کھوکھا نظر آیا اور وہ بھی مقفل تھا اور یہی بازار تھا۔ کچھ دیر بعد اس کھوکھے کا مالک ازار بند اُڑستا کہیں سے نمودار ہوا تو ہم نے رب کا شکر ادا کیا۔

طیب نے پرشوق ہو کر پوچھا ''خان صاحب، کچھ کھانے کو ملے گا؟''

''کیوں نہیں ملے گا صاحب..دنیا جہان کا کھانا ادھر ہے..'' خان صاحب نے ازار بند کو اُڑسنے سے فارغ ہو کر ہمیں خوشخبری سنائی۔ کھوکھے پر لگے قفل کو کھولا، پھر اُس کے اندر براجمان ہو کر چند پچکے ہوئے ٹینوں کے ڈھکن اٹھائے ''صاحب..بُھنا ہوا چنا ہے..گڑ کا ڈھیلی ہے اور کشمش کا میوہ بھی ہے..تو کھاؤ۔''

خاور زمان نے ان مدتوں کے بعد..آئی جی سندھ اور آسٹریلیا میں پاکستان کے سفیر ہونے کے باوجود اور طیب نے فیڈرل سیکرٹری فنانس ہونے کے باوجود مجھے آج تک اُس کوہ نوردی کے لیے نہیں بخشا..اور نہ ہی وہ اُس خان صاحب کو بھولتے ہیں جنہوں نے ہمیں دنیا جہان کی خوراک بُھنے ہوئے چنے، گڑ اور کشمش کی پیشکش کی تھی۔

شاہراہ الاسکا کے سفر میں پڑتے ہوئے کولے کے ایک دریا مقام پر جب ایک کیبن میں وہ ڈونا ہمیں بسون بھینسے کے برگر اور آملیٹ کی نوید دیتی ہے تو مجھے وہی وادیٔ کاغان کے ازار بند اُڑستے خان صاحب یاد آ جاتے ہیں کہ صاحب اِدھر دنیا بھر کی خوراک ہے۔

یہ خاتون ڈونا اور وہ خان صاحب دراصل ایک ہی تھے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ ڈونا اپنا ازار بند اُڑستی نہ تھی۔ یہ کیسا المیہ ہے کہ ان خطوں میں ازار بند نہیں ہوتے۔

○●○●○

''جنگلی بھینسوں اور بارہ سنگھوں کے پانچ شکاری''

گونج خاصی پرشوق ہو کر اپنے بسون برگر پر ٹھونگیں مارتی رہی اور میں ایک سادہ سے آملیٹ اور چند فرنچ فرائز سے اپنی دھما چوکڑی مچاتی بھوک کی تشفی کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا..کوکا کولا یا پیپسی نوعیت کا کوئی مشروب بھی میسر نہ تھا کہ بقول ڈونا ان مشروبات کو یہاں تک ٹرانسپورٹ کرنے پر بہت خرچہ اٹھتا تھا اور جب بل آیا تو اپنے ہمراہ تھوڑی سی بے ہوشی بھی لایا..وہی جواز کہ انڈے، آلو اور ڈبل روٹی وغیرہ ان ویرانوں تک لانے پر..بہت خرچہ اٹھتا تھا..

کھانے کے دوران اُن پانچ میں سے ایک مشٹنڈے نے جو ڈیل ڈول میں بقیوں سے تجاوز کرتا تھا، مجھ سے نہیں گونج سے مخاطب ہو کر نہایت مؤدب ہو کر پوچھا ''لیڈی جنگلی بھینسے بسون کا برگر کیسا ہے؟''

''اِٹس او کے..'' گونج نے بے دلی سے جواب دیا۔

اس محض ''اِٹس او کے'' نے اُسے بے حد پُرمسرت کر دیا۔ ''اسے میں نے شکار کیا تھا..اور یہ اتنا زور والا تھا کہ زخمی ہونے کے باوجود مجھ پر چل پڑا تھا..کیوں ڈونا؟''

''ہاں بل..'' ڈونا اُن سے بے تکلف تھی اور پھر وہ ہم سے مخاطب ہوگئی۔ ''بل اور اس کے چاروں ساتھی نزدیکی جنگلوں میں رہتے ہیں اور ان کے پاس جنگلی بھینسوں اور بارہ سنگھوں کے شکار کا سرکاری اجازت نامہ ہے..یہ ان کا گوشت، کھالیں اور سینگ فروخت کر کے روزی کماتے ہیں..یہ پروفیشنل ہنٹرز ہیں..''

جتنی دیر میں گونج نے اپنا برگر اور میں نے اپنا آملیٹ اور آخری قتلہ کھایا، وہ پانچوں ہمارے دوست ہو چکے تھے۔

''جیسا کہ ڈونا نے آپ کو بتایا ہے ہم کول ریور کے گھنے جنگلوں میں ایک سو کلومیٹر کے دائرے کے اندر اندر الگ الگ اپنے لکڑی کے کیبنوں میں رہتے ہیں۔ بسون اور بارہ سنگھوں کا شکار کرتے ہیں کہ یہ ہمارا آبائی پیشہ ہے..ہفتے میں ایک شب ہم اپنے اپنے لینڈ کروزروں پر سوار اپنی الگ الگ تنہائی سے نکل کر الاسکا شاہراہ پر واقع ڈونا کے اس کیبن کیفے میں جمع ہوتے ہیں..اس کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے گھریلو سنامین کیک کھاتے ہیں اور ایک پرلطف وقت گزار کر واپس چلے جاتے ہیں..ہم پورا ہفتہ گنگ رہتے ہیں کہ وہاں کون ہے جس کے ساتھ ہم بات کریں اور پھر یہاں آ کر خوب خوب باتیں کرتے ہیں اور یہ زیادہ تر اُن جانوروں کی باتیں ہوتی ہیں جنہیں ہم نے پچھلے ہفتے کے دوران شکار کیا ہوتا ہے..''

ہم دیکھ سکتے تھے کہ ڈونا اُن کی ایک قسم کی مہربان پھوپھی ہے..ان ویرانوں میں اُن کی واحد پناہ گاہ..وہ

معصوم بچوں کی مانند اُسے دیکھ کر محبت کی غرغوں غرغوں آوازیں نکالتے تھے اور وہ بھی اُن پر ایک پُر شفقت انداز میں نچھاور ہوتی تھی..

"یہ کیسی زندگی ہے جو آپ گزارتے ہیں.."

اُن میں سے ایک کی شکل اداکار وُڈی ایلن سے ملتی تھی کہ وہ دیگر کے مقابلے میں قدرے ناتواں اور مفلک تھا۔"زبردست..اس کے سوا کوئی اور زندگی بھی ہوتی ہے، یہ ہم نہیں جانتے اور جاننا بھی نہیں چاہتے..تم الاسکا سے واپسی پر آؤ ہم سے ملاقات کرنے..لیکن کم از کم پانچ روز کے لیے کہ ہم پانچ ہیں..یہ جو رچرڈ ہے.."اُس نے ایک نہایت مہربان موٹے کی جانب اشارہ کیا جو اب ہمیں مشٹنڈہ نہ لگتا تھا"اس کا کیبن ایک جھیل کے کناروں پر ہے..اور تم وہاں بے دھڑک ہو کر کپڑوں کے بغیر نہا سکتے ہو.."

گونج ذرا سی جھینپ گئی..

"اور موسم سرما میں آپ کیا کرتے ہیں..یہاں برف میں دب تو نہیں جاتے..کیا کرتے ہیں؟"

"ہاں وہ تو ایک الگ بال گیم ہے..ہم اپنے اپنے آبائی گھروں کو..بال بچوں اور ظاہر ہے بیویوں کو لوٹ جاتے ہیں..لیکن..وہ زندگی راس نہیں آتی..جس کیبن میں میں تنہا رہتا ہوں وہاں راتوں کو سوائے جنگلوں میں سے گزرتی ہواؤں کی سرسراہٹ اور جنگلی جانوروں کی آوازوں کے اور کچھ نہیں ہوتا..تمہیں معلوم ہے کہ گیدڑ بہت ہاؤ ہُو کرتے ہیں اور جو بھیڑیے ہوتے ہیں وہ چاندنی راتوں میں بہت روتے ہیں..اور جب میں موسم سرما بسر کرنے کے لیے اپنے قصبے کو لوٹتا ہوں..تو سڑکوں پر رواں ٹریفک کے ہارنوں کی گھسٹ مجھے اذیت سے دوچار کرتی ہے۔گھر کے اندر ٹیلی ویژن کی آواز میرے اعصاب کو منتشر کرتی ہے یہاں تک کہ راتوں کو فریج میں سے جو مدھم گھوں گھوں مسلسل برآمد ہوتی ہے وہ مجھے سونے نہیں دیتی۔مجھ میں اتنی تنہائی اور خاموشی بسیرا کر چکی ہے کہ ایک سگریٹ لائٹر کی کلک بھی مجھے آزار دیتی ہے...تم دونوں کبھی ملاقات کے لیے آؤ۔"

انسان کیسے ایک اور انسان کی شکل، لباس، ڈیل ڈول اور چہرے کے تاثر کو دیکھ کر فوری طور پر ایک حتمی رائے قائم کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہی عقل کُل ہے..فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ تو مخدوش مشٹنڈے اور بدنیت لوگ ہیں جن کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور وہ کیسے اتنا باطل ثابت ہو جاتا ہے کہ شرمندہ بھی نہیں ہو سکتا۔یہ جو پانچوں بظاہر وحشت ناک اور تُند خو شکاری تھے اندر سے کیسے بھولے، نرم مزاج، مہربان اور پُر خلوص نکلے تھے..اُن جنگلوں کی تنہائی نے انہیں بقیہ دنیا کے حرص اور لالچ اور خود غرضی سے بچائے رکھا تھا۔

میں نے اُن کے ہمراہ خصوصی طور پر چند تصویریں اُتروائیں اور وہ کیمرے کی جانب مسکراتے ہوئے تکتے ہیں، ہاتھوں میں منرل واٹر کی بوتلیں ہیں اور چہروں پر ایک ایسی معصوم مسکراہٹ ہے جو صرف غرض کی اس دنیا سے کٹ کر جنگلوں میں رہنے والے چہروں پر ہوتی ہے۔

"تم واقعی پے بکس تان سے آل دے وے یہاں تک آئے ہو؟" اُن میں سے وہ جو مجھے ڈونا کی کیبن میں داخل ہوتے ہوئے سب سے خونخوار لگا تھا، ہکول کے ایک بچے کے بھولپن سے بولا"کیا واقعی؟"

"ہاں..میں آل دے وے فرام پاکستان..یہاں آیا ہوں۔"

"تم کبھی ملاقات کے لیے آنا.."

اس مہربان دعوت میں اتنا خلوص تھا کہ اگر میں سیاحوں کے اس گروپ میں نہ بندھا ہوتا تو یقیناً گونج کو کہتا کہ اٹھ میلے کو چلتے ہیں..ترک کر الاسکا..کچھ روز ان میں سے کسی ایک مشٹنڈے کی کیبن میں گزارتے ہیں..خاص طور پر وہ مشٹنڈہ جس کی کیبن ایک جھیل کے کناروں پر ایستادہ ہے اور پھر اُس کے پانیوں میں بے لباس تیرتے ہیں۔

"اگر ہم واپسی پر تمہارے ہاں آنا چاہیں تو کیسے آئیں۔آپ لوگوں کا تو نہ کوئی پوسٹل ایڈریس ہوگا اور نہ ہی کوئی فون نمبر.."میں نے یونہی اُن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

اور وہ سنجیدہ ہو گئے"یہ ڈونا تمہیں راستہ بتا دے گی۔میری لکڑی کی کیبن تک یہاں سے صرف دو گھنٹے کی آسان ڈرائیو ہے..راستہ ظاہر ہے کچا ہے.."

اُس میں سے ایک ہنس دیا"اور اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ راستے میں کچھ ریچھ نہ ہوں لیکن تم اُنہیں بتا دینا کہ تم ہمارے مہمان ہو تو وہ تمہیں کچھ نہ کہیں گے۔"وہ سب ہنسنے لگے۔

"تمہارا رُخ الاسکا کو ہے لیکن آج کی منزل کونسی ہے.."مجھے محسوس ہوا کہ ڈونا اپنی دکانداری سمیٹ کر اس کیبن کیفے کے پچھواڑے میں واقع اپنے عارضی گھر میں جانے کی متمنی تھی۔

"واٹسن لیک.."

"اگر تم یہ رات یہاں گزارنا چاہتے ہو تو میرے پاس تین نہایت آرام دہ شہتیروں سے تعمیر کردہ پُر آسائش کمرے بھی ہیں۔بستر کی چادریں دُھلی ہوں گی اور صبح سویرے گرم پانی بھی شاورز میں ہوگا..تم انہیں دیکھ سکتے ہو۔"

وہ تین کمرے کیسے دلکش گڑیا گھر تھے..میں اُن پر مر مٹا کہ اُن کے پس منظر میں ان چھوٹے جنگلوں کے گھنے پن کے سوا اور کچھ نہ تھا اور وہ ایک ایسی ویرانگی میں پُر آسائش تھے جس کے آس پاس سینکڑوں کلومیٹر تک کوئی گھر نہ تھا..اگرچہ میں تو مائل تھا لیکن ہمارے سفری گروپ کے اراکین ایسی اُن کے نزدیک ڈراؤنی تنہائی میں رات بسر کرنے سے کتراتے تھے۔یوں بھی ہم سب جتنے تھے اُن تین کمروں میں سما نہیں سکتے تھے..

ہمارے انکار پر پھوپھی ڈونا کے ماتھے پر ایک بل بھی نہ آیا..اور جب ہم رخصت ہونے لگے تب ڈونا نے کہا"واٹسن لیک کے راستے میں..یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر..اُدھر سے آنے والے ایک سیاح نے خبر کی ہے کہ وہاں..بسون بھینسوں کا ایک ریوڑ بہت دیر سے شاہراہ کے عین درمیان میں بیٹھا ہوا ہے..وہ وہاں براجمان ہیں..نہایت خطرناک..آپ لوگ جب اُن کے نزدیک پہنچیں تو رُک جائیں..اُنہیں قطعی طور ڈسٹرب نہ کریں..جب تک کہ وہ اپنی من مرضی سے اُٹھ کر واپس جنگل میں نہ اُتر جائیں۔آپ اپنی جیپیں روکے رکھیں..اگر وہ آپ کی موجودگی سے خطرہ محسوس کریں تو وہ حملہ آور بھی ہو سکتے ہیں۔وہ اپنی جانب بڑھتی ہوئی کسی جیپ کو..اور ایسا متعدد بار ہو چکا ہے..دشمن جان کر اپنے مڑے ہوئے سینگوں اور چوڑے ماتھے سے دھکیل کر اوندھا بھی کر سکتے ہیں تو پلیز آپ احتیاط کیجیے گا.."

اگر ہم کول ربور کی اُس ویران شام میں یہ خبر پا کر قدرے خوفزدہ اور حواس باختہ ہو گئے تو کیا آپ ہمیں

مورد الزام ٹھہرا سکتے ہیں۔

پردیس میں.. اور وہ بھی کہیں وادیٔ یُوکان میں.. کول رِور سے آگے آپ جنگلی بھینسوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جائیں تو یہ تو کوئی مناسب موت نہیں۔

''ڈونا۔'' وہ اپنی دکانداری سمیٹ رہی تھی اور وہ پانچوں بھی رخصت ہونے کو تھے۔ ''اگر وہ.. دسون وہاں شاہراہ پر براجمان رہے۔ اُسے خالی کر کے جنگل میں نہ اُترے تو ہم کیا کریں گے؟''

''انتظار..'' ڈونا پھوپھی نے مشورہ دیا ''ہاں تم واپس آ کر میرے اُن تین کمروں میں شب بسر کر سکتے ہو لیکن میں تمہارے لیے امید کرتی ہوں کہ وہ چلے جائیں گے اور تم آج رات واٹسن لیک پہنچ ہی جاؤ گے۔''

اُن پانچوں نے ہمیں ایک نہایت پُرخلوص خدا حافظ کہا ''کبھی ملاقات کے لیے آنا۔''

○●○●○

''کوئلہ دریا کی شام میں جنگلی بھینسوں کا ریوڑ ہماری جیپ کا راستہ روکتا ہے''

کول رِور سے آگے کا سفر جھجک اور چوکنے پن کا سفر تھا کہ جانے کس لمحے اُن جنگلی بھینسوں سے مڈھ بھیڑ ہو جائے۔

ہم اُس شام میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے، ہم تو کیا ہماری جیپیں بھی خوف کے سانسوں میں مبتلا دیکھ بھال کر چلتی تھیں.. سرکتی تھیں..

یہ کہنے کی چنداں حاجت نہیں کہ اجنبی پہاڑوں کی اُس شام کے اندر اُس شاہراہ پر سوائے ہمارے اور کوئی مسافر نہ تھا اور اجاڑ پن ایسا تھا کہ کسی آبادی کا ظہور ناممکن نظر آتا تھا۔

ہماری آنکھیں ونڈ سکرین میں ہولے ہولے دفن ہوتے ویران اور تاریک ہوتے راستے کو تکتی تھکتی تھیں کہ جانے کس لمحے وہاں کچھ سیاہ آسیب نظر آنے لگیں..

''ہمیں ڈونا کی میزبانی سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا.. ان بھینسوں کا خدشہ مول لینے کی بجائے بہتر تھا کہ ہم وہیں ٹھہر جاتے.. ذرا تصور کرو کول رِور کے ایک کیبن کمرے میں ایک بے پناہ ویران تنہائی کے سناٹے میں رات بسر کرنا کیسا ہوگا..''

''تم تنہائی کے متمنی رہتے ہو.. میں دیکھ سکتی ہوں کہ اگر ہم کسی خوش نظر مقام پر رُکتے ہیں تو تم ہمیشہ ذرا الگ تھلگ میرے وجود سے غافل ہو کر اُس مقام کے فریب کے اندر سرایت کر جاتے ہو.. اور اُن لمحوں میں اگر تمہارے ہم سفر تمہیں وہیں چھوڑ کر چلے جائیں تو بھی تمہیں خاصی دیر بعد اس کی خبر ہو.. تو یہ آرزو کیا ہے؟''

''میں اس کا جواز پیش کرنے سے قاصر ہوں.. میرا خیال ہے کہ یہ فنا کے خوف کی تنہائی ہے جو ہر انسان کے وجود میں ازل سے بھر دی گئی ہے.. بیشتر لوگ اس کا اقرار نہیں کرتے اور نہ ہی اظہار.. اور میں کر دیتا ہوں.. ایک مسلسل ہول اور تنہائی میرے اندر بچپن سے ہی مقیم ہے۔ یہ ایک احساس کمتری بھی ہو سکتا ہے کہ میں دنیا کا، حقائق کا سامنا نہیں کر سکتا اور تنہائی میں فرار حاصل کرتا ہوں۔ شاید میں پہلے بھی تذکرہ کر چکا ہوں کہ میرے کوہ نوردی کے زمانوں میں جب بھی شام ڈھلے ہم کسی منزل پر تھکے ہارے پہنچتے تھے.. پورٹر خیمے نصب کرنے اور رات کا کھانا تیار کرنے میں مشغول ہو جاتے تھے، ہم سفر گھاس پر لیٹ کر اپنی تھکن اُتارتے تھے تو میں اُن سے کہیں زیادہ تھکاوٹ سے منتشر اپنے آپ پر جبر کر کے اُن سے الگ ہو کر یا تو نشیب میں اُتر جاتا تھا اور یا پھر ذرا بلندی پر پہنچ کر.. جہاں اُن کی آوازیں مجھ تک نہ پہنچ سکیں تنہا ہو جاتا تھا اور

یہ کیسے بیش قیمت لمحے ہوتے تھے.. اور وہ جو کول رور کے تین کیبن کمرے تھے وہ پہلو میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو اور ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو کی ایک تفسیر تھے.. اور اُس خاموشی میں جائیں اتنے بلند نالے.. کی خوابنا کی تصویر تھے اس لیے وہ مجھے اپنے جانب بلاتے تھے.. کول رور کے وہ کیبن کمرے اقبال کے وہی پہلو میں کوہ کے چھوٹے سے جھونپڑے تھے۔"

اور پھر وہ نظر آ گئے..

شاہراہ کے دُھندلکے میں وہ سیاہ آسیبوں کی مانند ظاہر ہونے لگے۔ اُس ڈھلتی شام میں، کول رور سے تقریباً دس گیارہ کلومیٹر کی مسافت کے بعد.. وہ عظیم الجثہ سیاہ حیوان، کالے شاہ.. گھنے یاک کے بالوں ایسے گھنے سیاہ بالوں والے، بے دریغ وحشی خصلت والے بسون بھینسے نظر آنے لگے.. اگرچہ ابھی تاریکی مکمل نہ ہوئی تھی لیکن اُن کی مہین آنکھیں شعلوں کی مانند روشن بھڑکتی تھیں..

وہ ایک سیاہ ناقابل عبور دیوار کے مانند حائل تھے..

اُن میں سے تین بھینسے تو شاہراہ کے عین بیچ میں تسلی سے براجمان کسی گیان دھیان میں گُم تھے اور انہوں نے ہماری رُکتی جیپوں کی جانب کچھ دھیان نہ کیا.. اُن کے درجن بھر سنگی ساتھی شاہراہ کے کناروں پر تھوتھنیاں جھکائے گھاس چرتے تھے یا شغل کے طور پر اُس پر مُنہ چلاتے تھے.. بے حد گھنی اور موٹی گردنوں والے.. سر جھکائے.. اور وہ بھی ہم سے لاتعلق رہے.. وہ سب آگاہ ہی نہیں تھے کہ اُن کے سوا وہاں ہم بھی ہیں۔

اور وہ ایک وحشی قرار میں.. اُس شب کی نیم تاریکی میں ہولے ہولے ڈولتے تھے.. ہماری موجودگی سے غافل اپنی حیات کرتے تھے..

ظاہر ہے ہم مکمل طور پر ساکت ہو کر سانس بھی آہستہ لیتے تھے۔

ہم ذرا فاصلے پر رک گئے تھے.. اُن کے قرار اور دھیان میں خلل ڈالنے کا خدشہ مول نہیں لے سکتے تھے..

مجھ میں جو خوف اور ہراس تھا وہ اُنہیں دیکھ کر رخصت ہو گیا تھا کہ یہ سیاہ معجزے تھے جو مجھ پر صحیفوں کی مانند اُتر رہے تھے..

بس یہی تو ہے ایک بے مقصد زندگی اور آوارگی کا خصوصی ہمارے رب کی جانب سے اُتارا ہوا انعام.. جو تمہاری نظروں کے سامنے سیاہ ہو رہا ہے..

یہی ہیں وہ معجزے جو صرف ایک آوارہ گرد کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں، اُس کی مسافتوں کے راستوں میں کہیں کہیں نمودار کر دیے جاتے ہیں کہ آوارہ گرد.. ایک کوہ نورد، سمندروں میں تنہا ایک کشتی میں اتر جانے والا بھی تو ایک نوعیت کا اگرچہ بھٹکا ہوا پیغمبر ہوتا ہے۔ جس پر کرشمے اُتارے جاتے ہیں، جسے معجزے عطا کر دیے جاتے ہیں.. دراصل یہ تخلیق کار کی ذاتی شکرگزاری کے عکس ہوتے ہیں کہ تم نے ایک آسودہ حیات کو ترک کیا، مخلوق جو ایک راہٹ میں جُتے بیل کی مانند ہوس اور حرص کے حصول کے لیے پھیرے لگاتی تھی اور تمہیں بے مقصد اور حقیر جانتی تھی تم نے اُسے تیاگ کر اپنا منہ موڑا اور میری تخلیق کے نظاروں کے لیے ایسا پُر خطر سفر اختیار کیا جس سے تمہیں دنیاوی طور پر کچھ حاصل حصول نہیں ہو گا

تو میں شکرگزار ہوتا، تمہارے سامنے ایسے منظر اُتارتا ہوں جو کسی کے تصور میں نہیں آ سکتے.. تمہیں معجزے انعام کرتا ہوں.. مجھے دیکھو اور پھر میری تحسین کرو..

الاسکا ہائی وے کے بے انت فاصلوں کے اندر اُس شام میں، اُس سرمئی نیم تاریکی کے اندر کیسے سیاہ وجود حرکت کرتے تھے جن کی مہین آنکھوں میں الاؤ بھڑکتے تھے.. متعدد کالے سیاہ وجود.. ہمارے راستے کی دیوار ہوتے، گھاس پر جھکے، اُس شام میں.. درجن بھر بھاری بھرکم عفریتیں، اپنے بے مُہار تکبر میں..

مسافتوں کی شطرنج کی بساط پر بہت سی رکاوٹیں ہوتی ہیں، تمہارے بادشاہ ہار جاتے ہیں، ملکائیں مات کھا جاتی ہیں اور پھر کوئی ایک پیادہ ایسا سامنے آتا ہے جو تمہیں بادشاہ بنا دیتا ہے اور تم الاسکا ہائی وے کی شام میں جنگلی بھینسوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے ہو.. اور آس پاس سینکڑوں کلومیٹر کی شدھ ویرانی ہے۔

اُن میں سے ایک ذرا مشقت سے اپنے بھاری وجود کو سنبھالتا اٹھا۔ اُس کی موٹی اور پلی ہوئی گردن جھکی ہوئی تھی اور اُس کی دبیز تھوتھنی میں دو مہین آنکھیں چمکتی تھیں۔ وہ کاہلی سے اٹھا اور ہولے ہولے ہماری جیپ کی جانب آنے لگا۔ ہم اُس پر نظریں جمائے دم روکے بیٹھے رہے کہ اس کی نیت جانے کیا ہے..

"اپنی جانب کا شیشہ چڑھا دو مستنصر.." گونج تشویش میں پھڑ پھڑائی اور اس مسافت کے دوران اُس نے پہلی بار مجھے میرے نام سے پکارا تھا اور وہ عام انسانوں کی مانند میرا نام لیتے ہوئے اٹکی نہیں، یوں روانی سے ادا کیا جیسے جیون بھر اسی نام کی مالا جپتی رہی ہو۔

اور ہاں ہم جب سے رکے تھے میں اپنی ڈیجیٹل کیمرے کو آنکھوں سے لگائے مسلسل اُس کا بٹن دبا رہا تھا اور اُس میں سے فلیش کی روشنی برآمد ہو کر باہر کی نیم تاریکی کو چندھیاتی جاتی تھی۔

"اور مستنصر.. پلیز فلیش آف کر دو ورنہ یہ بسون جو ہماری جانب بڑھ رہا ہے، اشتعال میں آ سکتا ہے۔"

وہ ہولے ہولے چلتا آیا اور میری جانب کے دروازے کے ساتھ تقریباً لگ کر کھڑا ہو گیا، اتنا قریب کہ میں کھڑکی کا وہ شیشہ جسے میں اوپر کر چکا تھا نیچے کر کے ہاتھ باہر نکال کر اُس کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے "ہیلو بلیک بیوٹی" کہہ سکتا تھا۔ اُس نے سر اُٹھا کر میری جانب دیکھتے ہوئے میرا جائزہ نہیں لیا، بس وہیں کھڑا رہا.. وہ اتنا نزدیک تھا کہ مجھے اُس کے بھاری سانس کے چلنے کی خرخراہٹ سنائی دے رہی تھی..

"خبردار.. تم نے شیشہ نیچے کر کے بھینسے کی پشت پر تھپکی نہیں دینی.."

"نہیں نہیں۔" میں نے سرگوشی کی.. وہ کیسے جان لیتی تھی کہ میرے دل میں کیا ہے لیکن میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے سرکا دیا.. میں نے اُس بھینسے کو فوکس میں لانا چاہا تو کیمرے کی سکرین پر اُس کی سیاہی اندھیر ہو گئی.. میں نے ذرا پیچھے ہو کر بمشکل اُسے زوم آؤٹ کیا تو وہ پورے کا پورا فوکس میں آ گیا..

اُس بھینسے کی وہ شاندار قربت والی تصویر اس لمحے میرے سامنے ہے۔ جس میں اُس کے سیاہ گتھے ہوئے گھنے بالوں کا ایک حصہ قدرے بھورا لگ رہا ہے.. آنکھوں میں لگتا ہے کہ دیے جلتے ہیں، چھوٹے چھوٹے مڑے ہوئے سینگ اور تھوتھنی میں ناک کے گیلے سوراخ.. اُس کے وجود کے پس منظر میں اُس کی سیاہی سے بھی بڑھ کر شب میں ڈھلتا ایک سیاہ

جنگل ہے جو ایک تاریک دیوار کی صورت ایستادہ ہے..

ایک بسون بھینسا میرے قیاس کے مطابق ایک ہاتھی سے کہیں بڑھ کر طاقت والا اور اشتعال بھرا ہوتا ہے. ایک دبیز سیاہ چٹان جس کی گردن اور تھوتھنی اُس کے بقیہ بدن سے الگ نہیں ہوتے.. ارنسٹ ہیمنگوے جو شراب سے بھی زیادہ شکار کا رسیا تھا، اُس کا بھی یہی کہنا تھا کہ شیر اور ہاتھی سے کہیں بڑھ کر خطرناک شکار جنگلی بھینسے کا ہوتا ہے..

اور یہ جو بظاہر کاہل سے اور کالے کلوٹے حضرت جیپ کی باڈی کے ساتھ لگے کھڑے تھے ہمارے لیے اگر ذرہ بھر کدورت رکھتے تو ذرہ بھر زور لگا کر اسے ایک کھوے کی مانند اوندھا گرا سکتے تھے.. لیکن جونہی اُن کی یہ شاندار تصویر اُتر گئی.. جیسے وہ آئے ہی اس تصویر کو اُتروانے کے لیے تھے، خصوصی پوز بنا کر سکوت میں رہے اور پھر اس کے اترتے ہی حرکت میں آئے اور رخصت ہو گئے۔

اُن کی رخصتی پر گونج کی جان میں جان آئی.. ''تم ہمیشہ سے ہی ایسے تھے؟''

''ایسے کیسے؟''

''یہ جو تم نے میرے خبردار کرنے کے باوجود کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے اپنا آدھا دھڑ باہر نکالے اُس کی ناک سے ناک ملائے تصویر اتارنے میں مشغول تھے اور تم میں کچھ ڈر نہ تھا، حالانکہ یہ حماقت کے سوا اور کچھ نہ تھا.. بس ایسے..''

''ہمارے آباؤ اجداد سکھ سردار تھے جو کر گزرنے کے بعد سوچتے تھے کہ او ہو یہ کیا کر بیٹھے.. تو میں بھی اب سوچتا ہوں تو واقعی یہ حماقت تھی جو ہو گئی.. لیکن گونج تم کیمرہ سکرین پر ذرا دیکھو تو سہی کہ تصویر کیسی شاہکار اتری ہے..''

''یُو آر امپاسیبل..'' اُس نے چونچ چڑھائی..

''آئی ایم این امپاسیبل پرسن..''

''ویری فنی..''

ان دو دنوں کے سفر کے دوران جب کبھی میں کوئی ایسی حرکت کرتا جسے گونج حماقت سمجھتی تو وہ ہمیشہ چڑچڑی ہو کر کہتی.. یُو آر امپاسیبل... اگر میں رُکو رُکو کی دوہائی دے کر کسی اداس جھیل کے قریب جانا چاہتا ہوں تو.. یُو آر امپاسیبل.. ہرنوں کو پیار کرنا چاہتا ہوں یا بہت فاصلوں پر واقع کسی دھواں جھیل، کبوتر یا سمندری بگلا جھیل تک پہنچنے کی آرزو کرتا ہوں.. یا پھر ڈاسن کریک میں صبح سویرے کافی کا ایک مگ پی کر چپکے سے جوگرز پہن کر سیر کے لیے نکل جاتا ہوں تو.. یُو آر امپاسیبل.. لیکن جب میں نے اقرار کیا کہ ہاں.. آئی ایم این امپاسیبل پرسن تو اُس کے ردعمل میں اُس نے بھنا کر کہا تھا کہ.. ویری فنی.. تو اس کا بھی ایک خاص پس منظر تھا۔ گونج ظاہر ہے ایک پرندہ ہونے کی حیثیت سے مجھ سے الگ ایک خصوصی خصلت اور جبلت کے تابع تھی... ہم دونوں کی پسند اور ناپسند میں کچھ مطابقت نہ تھی۔ مثلاً میں ستمبر کے زرد کرشموں میں آئے ہوئے درختوں کے ایک جھنڈ میں خیمہ زن ہو کر شب بسر کرنے کی تجویز پیش کرتا تو وہ کہتی.. آئی ایم ناٹ اے کیمپنگ پرسن.. جب میں کسی بے انت ندیوں بھری وسعت کو دیکھ کر کہتا کہ ذرا پیدل چل کر ان ندیوں کے پار ہوتے ہیں تو.. آئی ایم ناٹ اے واکنگ پرسن..

یہاں تک کہ میں جب کبھی کسی گھاٹی پر کھلے تہ در تہ صد رنگ پھولوں کے انبار دیکھ کر ذرا سستی رومانویت کا شکار ہو کر پیشکش کرتا کہ کیا میں ان میں سے کچھ پھول توڑ کر تمہیں پیش کردوں تو وہ انتہائی ناگواری سے چونچ چڑھا کر میری رومانویت پر اوس ڈال دیتی کہ.. آئی ایم ناٹ اے فلاور پرسن..

تو میں نے بھی جب یہ کہا کہ.. آئی ایم این امپاسیبل پرسن.. تو یہ ایک ردعمل تھا..

شام جو ڈھل رہی تھی، ڈھل گئی۔

اور وہ جو سرمئی نیم تاریکی تھی، تاریک ہو گئی۔

اور جب ہم اس جنگلی بھینسا صورتِ حال کی سنگینی سے سمجھوتہ کر چکے تھے کہ یہ تو اب رات بھر ہمارے راستے میں پڑے رہیں گے، یہ سیاہ گُل محمد جُنبد نہیں ہونے والے.. اور ہم پھوپھی ڈونا کی جانب پلٹ چلیں تو اُن میں سے ایک شاہراہ پر ڈھیر بھینسا جنبد ہوا، کرم فرما ہو کر اٹھا اور شاہراہ کے کناروں کی گھنی گھاس میں ڈولتا ہوا جنگل کے اندر اُتر کر روپوش ہو گیا۔ شاید وہ بقیہ بھینسوں کا پیر و مُرشد تھا کہ وہ سب باری باری اٹھنے لگے.. اپنا گیان دھیان ترک کر کے اُس کے پیچھے پیچھے جانے لگے اور چند لمحوں بعد الاسکا ہائی وے پر کوئی ایک بھی سیاہ رکاوٹ نہ تھی..

مجھے اُن کی رخصتی سے اگرچہ از حد اطمینان ہوا لیکن ایک گونا ملال بھی ہوا کہ اگر وہ یونہی حائل رہتے، شاہراہ پر سے اٹھنے کا نام نہ لیتے تو ہم کول رِور واپس جا کر ڈونا کے دشت تنہائی میں واقع اُن کیبنوں میں جا بسرام کرتے۔

شاہراہ اُن کے شاندار سیاہ وجودوں سے خالی ہوئی تو ایک بھائیں بھائیں کرتے سناٹے میں چلی گئی اور ہم پھر سے تاریکی میں مدغم ہوتی الاسکا ہائی وے کے مسافر ہو گئے..

گا میرے منوا گاتا جارے.. جانا ہے ہم کو دُور..

○●○●○

کے درجنوں گلدستے جھولتے تھے.. اس قدیم میس کی شکل وجہ کو نہایت نفاست اور خوش ذوقی سے ایک نیا تازہ پھولوں روپ دینے والے ایک جرمن میاں بیوی تھے جنہیں رات کے اس پہر ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ اپنے خالی موٹل کا سرخ دروازہ کھولیں گے اور باہر درجن بھر تھکے ماندے گاہک جیپوں سے اُتر رہے ہوں گے.. وہ طمانیت سے مسکرائے اور..

"پلیز ڈاؤن کاؤشن.. آپ براہ کرم اپنے جوتے اتار دیجیے.."

ہم سب ٹھٹک گئے..

یہ جو جرمن ہوتے ہیں ان کی صفائی ستھرائی اور تنظیم نہ صرف ہم ایسے تیسری دنیا کے باشندوں کے لیے ایک اذیت ہوتی ہے بلکہ بیشتر یورپی اقوام کے لیے بھی ایک دردِ سر ہوتی ہے۔ اکثر گھر ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے اندر قدم رکھتے ہوئے آپ مُجرم محسوس کرتے ہیں کہ کیا پتہ آپ کے جوتے کے تلے کے ساتھ ایک ذرہ چلا آئے اور اُن کے کنوارے قالین کا ستیاناس کر دے.. صوفوں پر بیٹھنے سے ڈر لگتا ہے کہ اُن پر بچھے گرد پوش پر کوئی سلوٹ نمودار نہ ہو جائے.. کھانسنے سے بھی اجتناب کہ کھڑکی کے آگے جو پردے کھنچے ہیں وہ بے آرام نہ ہو جائیں اور سب سے اعلیٰ اذیت اُن کے دمکتے غسل خانے، اُن میں کچھ بھی کرنے سے شرمندگی ہوتی ہے.. ہیمبرگ میں ایک جرمن دوست کے گھر میں بے دھیانی سے سگریٹ سلگا لیا تو اہلِ خانہ ایش ٹرے تھامے میرے آس پاس تعینات ہو گئے..

فرائی برگ کے نواح میں مشہورِ عالم بلیک فارسٹ کے ایک دیدہ زیب قصبے میں جتنے بھی گھر تھے اُن کے سامنے پھولوں کی کیاریاں بہار دیتی تھیں.. کیاریاں تو بہرطور سب کی سب طول و عرض میں یکساں تھیں لیکن سبحان اللہ پھولوں کے رنگ بھی ہو بہو ایک جیسے تھے.. مجھے یقین ہے کہ اگر میں اُن پھولوں کی گنتی کرتا تو مجال ہے کسی گھر کے سامنے کسی دوسرے گھر کی نسبت ایک پھول بھی زائد ہوتا.. میں تو ابھی تک یہ تعین نہیں کر سکا کہ جرمن بچے کیسے پیدا کر لیتے ہیں بنی بستر کی چادر میں ایک بھی شکن کے بغیر..

تو واٹسن لیک کا یہ جرمن جوڑا بھی اسی نوعیت کا تھا.. البتہ ایک قباحت تھی کہ غسل خانے کمروں سے منسلک نہ تھے، راہداری میں واقع اجتماعی تھے.. اور ویسے ہی تھے جن میں کچھ بھی کرتے ہوئے آپ مجرم محسوس کرتے تھے، کم از کم میں نے تو شب بھر ضبط کیا کہ اُنہیں آلودہ کیا کرتا.. کمرے بے شک مختصر تھے اور اگلی سویر ایک امریکی جوڑے نے شکایت کی کہ ان کے بستر بھی اتنے مختصر تھے کہ ہم دونوں رات بھر اِدھر اُدھر لڑھکتے رہے.. کروٹ بدلنے سے ہم میں کوئی ایک اوندھا ہو کر زمین پر جا گرتا.. لیکن اُن بستروں پر جو چادریں بچھی تھیں دھلی ہوئی نویں نکور تھیں ایسی کہ اُن میں تو بے بھی کوئی شکن جنم نہ لے سکتی تھی.. اور تکیے اتنے پیارے اور نرم کہ اُنہیں سر تلے رکھنے کی بجائے گود میں لے کر تھپکتے ہوئے لوری سنانے کو جی چاہتا تھا..

کونج اس دوران اس موٹل کی تلاش کر دی کر آئی اور اُس نے رپورٹ دی کہ اس کے پچھواڑے میں دور تک ایک جنگل ہے جس کے آخر میں وہ جھیل ہے جس کے نام پر یہ قصبہ آباد ہے.. وہ قصبہ جانے کہاں تھا پر کہیں تو تھا جو واٹسن لیک کہلاتا تھا.. اور اُس نے اپنی شب بسری کے لیے اس جھیل کنارے سرکنڈوں کے ایک گھنے جھنڈ کو منتخب کر لیا تھا.. وہ کہاں ایک مختصر کمرے کی گھٹن میں شب بھر قیام کرنے والی تھی..

"واٹسن لیک کا ایئر فورس میس.. پاکستان میرا گھر.. زیرو کلومیٹر"

"پلیز ڈاؤن کاؤشن.. آپ براہ کرم اپنے جوتے اتار دیجیے.."

ہم سب ٹھٹک گئے۔

ہم کسی موٹل میں داخل ہو رہے تھے یا کسی کوہِ طور میں.. کہ اپنے جوتے اتار دو تم ایک مقدس زمین پر قدم رکھنے والے ہو..

اُن دونوں کی.. دونوں میاں بیوی کی مسکراہٹیں رات کے اس پہر.. شاید گیارہ بجنے کو تھے.. نہایت تروتازہ معصوم تھیں جب اُنہوں نے بصد ادب ہمیں ایئر فورس لاج کے داخلے پر ہم سے جوتے اتارنے کی درخواست کی۔

ہماری آج شب کی منزل واٹسن لیک ایک ایسا قصبہ نہ تھا جس میں داخل ہونے پر کچھ روشنیاں.. کچھ پاتھ پر چلتے کچھ لوگ.. کوئی ایک ریستوران یا شراب خانہ اس کے آثار کا پتہ دے.. الاسکا ہائی وے کی تاریکی میں سے نکلے تو ایک اور بجھی ہوئی تاریکی تھی اور نقشے خبر کرتے تھے کہ واٹسن لیک کے قصبے کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس گم شدہ اور خوابیدہ قصبے کے آغاز میں دائیں جانب ایک بورڈ روشن نظر آ گیا

"WELCOME TO, THE HISTORIC "AIR FORCE LODGE"

BUILT 1942.... EVERYONE WELCOME"

بورڈ کے کونے میں دوسری جنگِ عظیم کے کسی برطانوی پائلٹ کی شبیہ تھی جس کے اوپر کینیڈا کا چار رنگ پرچم لہراتا تھا.. نہ جانے پھڑپھڑاتا تھا، ایک مُردنی میں اُس بورڈ سے لپٹا ہوا تھا..

کول رود سے ذرا پہلے اُس گیس سٹیشن پر جب مہربان کینیڈین جوڑے سے ملاقات ہوئی تھی جس نے ہمیں وہاں کے کیبن بکنے کی خبر کی تھی اُنہوں نے ہی واٹسن لیک کے اس "ایئر فورس لاج" کو شب بسری کے لیے نہایت موزوں قرار دیا تھا.. اگرچہ کچھ اچھے تنک سیانے سیاحوں نے واٹسن لیک میں گھوم پھر کر دیگر قیام گاہوں کا اتہ پتہ کر لینے کا مشورہ دیا تھا.. اُنہیں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا کہ ہم سب اتنے نڈھال ہو چکے تھے کہ اگر دو قدم کے فاصلے پر بھی کوئی ہم وقت ہوتا ہمیں لیجانا اٹھائے کر لانا نہ سکتے تھے..

[illegible] میں سے تعمیر کردہ.. اطراف میں نیلی چھتوں والی ایک قدیم طرز کی عمارت جو کبھی برطانوی ایئر فورس کا میس [illegible] تھی.. نیم تاریک کا صدر دروازہ تاریکی میں بھی نمایاں ہوتا تھا اور اس کے اردگرد

اُس شب میں تو بستر پر گرتے ہی ایک مکمل مدہوش پن میں یوں غرق ہوا کہ کچھ خبر نہ ہوئی.. ہاں اُس مدہوشی میں مجھے شاید گیدڑوں یا بھیڑیوں کی آوازیں سنائی دیں لیکن وہ کہیں بہت دور اپنے آبائی جنگلوں میں ہاؤ ہو کرتے تھے.. اس کے سوا ایک سیاہ بھینسے کی روشن آنکھیں نیم خوابی میں دکھائی دیتی رہیں.. اور عجیب فضول قسم کے فلمی گانے نیم خوابیدہ ذہن میں اُس بھینسے کی آنکھوں کے حوالے سے گونجتے رہے کہ.. اکھیاں ملا کے جیا برما کے چلے نہیں جانا.. یا.. بے ایمان تیرے نینوا ہندیا نہ آئے.... لیکن مجھے نیند آ گئی، آنکھ تب کھلی جب کمرے کی چوکور کھڑکی کے پردوں میں سے سرایت کرتی ہوئی دھوپ میرے پپوٹوں پر اُترنے لگی..

شب بھر تو اجتناب کرتا رہا تھا لیکن ہر ذی روح کی مانند صبح سویرے بیدار ہونے کے بعد مجھے بھی ایک غسل خانے میں جانے کی حاجت ہو رہی تھی.. اور مجھے مجبوراً جانا پڑا..

اور وہ ایسے تھے کہ ابھی ابھی کسی فیکٹری میں مینوفیکچر ہونے کے بعد پالش شدہ حالت میں لش پش کر رہے تھے.. اُن میں اپنے آپ کو عیاں کرنا ایسا تھا جیسے ایک معصوم دوشیزہ کے سامنے آپ بے لباس ہو جائیں.. مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جونہی کوئی مہمان ان غسل خانوں میں فارغ ہو کر باہر آتا ہے تو اُسی لمحے خاتونِ موٹل ایک لمبا سا برش اور ایک بالٹی تھامے اندر چلی آتی ہیں اور فرش پر گرے پانی کے آخری قطرے کو بھی پونچھتی ہیں، شاور کی ہر ٹونٹی کو چمکاتی ہیں کہ کہیں اُن پر انگلیوں کے نشان نہ ہوں اور پھر کوئی جرمن ایئر فریشنر چھڑکتی ہیں..

بے شک یہ تنظیم، یہ صفائی ستھرائی ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی لیکن جب ہم ناشتے کے کمرے میں داخل ہوئے ہیں تو تمام کلفتیں ڈھل گئیں.. وہ کیا ہی نئی نکور اور چلبلاتی سویر تھی.. کھلی کھڑکیوں میں سے.. اور باہر پھولوں کے انبار سویر کی ہوا میں سرد ہوتے جھول رہے تھے... نرم دھوپ داخل ہو رہی تھی.. میزوں پر آرائش کردہ پھولوں کو نکھارتی.. ہم سب کے چہروں کو تاباں کرتی.. جرمن میاں بیوی آخری پیالی اور پلیٹ کو دل جمعی سے پونچھنے اور چمکانے میں مصروف تھے.. ٹیبل کلاتھ کی آخری شکن درست کرتے تھے، اُن کا بس چلتا تو وہ فرش پر پڑتی دھوپ کی کرنوں کو بھی پُونچھ دیتے کہ کہیں اُن میں مٹی کا ایک ذرہ نہ چلا آیا ہو..

ناشتے کے کمرے میں صفائی ستھرائی کی شفافی میں تازہ سیاہ کافی کی مہک تیرتی تھی.. فرائی انڈوں کی گرم زردیاں چھوٹے چھوٹے سورجوں کے روپ میں طلوع ہوتی تھیں.. اور تازہ ڈبل روٹی میں سے خمارِ گندم کی مہک اُٹھتی تھی۔ ایئرفورس لاج کا منتظم وہ جرمن جوڑا گفتگو میں کچھ زیادہ منظم نہ تھا.. بے حد باتونی تھا.. ہم اپنے اپنے فرائی انڈوں اور کافی کی گرماہٹ میں مگن رہے لیکن وہ باتیں کرتا رہا..

”ہم دونوں تب بہت نوجوان اور بے دریغ تھے.. ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا تو تھے لیکن شادی شدہ نہ تھے.. ہم دونوں میں چرس اور آوارہ گردی کا بندھن بہت مضبوط تھا.. ہم یونہی ان آوارگیوں کے دوران ادھر وادیٔ یُوکان میں آ نکلے.. اور ظاہر ہے آپ کے علم میں ہو گا کہ آپ ابھی تک برٹش کولمبیا میں سفر کر رہے تھے اور جونہی آپ وانسن لیک میں داخل ہوئے ہیں تو وادیٔ یُوکان کا آغاز ہو گیا ہے.. یہاں پہنچ کر ہم دونوں کے تو پاؤں پگھل گئے.. ہم تو چلنے کے قابل نہ رہے، اپاہج ہو گئے کہ ہم آج تک ایسی بے انت جنگلوں اور جھیلوں کی ویرانیوں سے شناسا نہ ہوئے تھے.. تو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم بقیہ زندگی یہیں بسر کریں گے..“

وہ دونوں جرمن یقیناً ایسے تھے جنہوں نے کوّے کھائے ہوئے تھے اور اس لیے چپ نہ ہوتے تھے۔ ہم اپنے ناشتے میں مگن رہے اور وہ ہم سے باتیں کرتے رہے۔

”آپ کی اطلاع کے لیے وانسن لیک کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد پر مشتمل۔ اور اس میں ہم دونوں شامل ہیں۔ معاف کیجیے گا آج اس کی آبادی میں اپنے آپ کو بھی شامل کر لیجیے یعنی ڈیڑھ ہزار اور آپ کتنے ہیں.. بارہ افراد..“

”تو آپ دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ آپ بقیہ زندگی یہیں بسر کریں گے؟“ کسی نے لقمہ دیا..

”اوہ ہاں.. تو ہم دونوں یُوکان پر عاشق ہو گئے اور ہم نے سوچا کہ زندگی اتنی مختصر ہے کہ اسے برلن کی بھیڑ بھاڑ اور عمارتوں کے دم گھونٹنے والے جمگھٹے میں تو نہیں گزارنا چاہیے.. تو ہم نے اپنی جمع پونجی سے برطانوی ایئرفورس کا یہ کب کا متروک ہو چکا میس بلکہ اس کے کھنڈر کو خرید لیا اور اس میں پائلٹوں اور جہازوں کی چند تصاویر بھی تھیں.. ہر کسی نے یہاں وانسن لیک میں.. اور اُن دنوں تو یہاں سو دو سو لوگ بھی نہ تھے ہمیں پاگل سمجھا.. پہلے تو ہم نے اس کے بوسیدہ کمروں میں اُن گیدڑوں کو بھگایا جو رات بھر یہاں ادھم مچاتے تھے..“

”گیدڑوں کی آوازیں تو رات بھر آتی رہیں..“ میں نے کہا۔

”بالکل..“ وہ بہت پُر مسرت ہوئے۔ ”یہ وہی گیدڑ ہوں گے یا اُن کے بچے ہوں گے جو ہر شب احتجاج کے طور پر کہ ہم نے انہیں کیوں بے گھر کیا، ہاؤ ہُو کرتے ہیں.. تو ہم دونوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کھنڈر نما میس کو از سر نو تعمیر کیا.. اس کی آرائش کی.. پچھواڑے میں ایک باغیچہ ترتیب دیا اور اب یہ ہمارا گھر ہے.. اگر آپ لاج کے پچھواڑے میں جا کر دیکھیں تو تقریباً نصف کلومیٹر دور ایک ندی ہے اور کناروں پر ایک گھنا جنگل ہے جو ہم اپنے تصرف میں لا سکتے ہیں... اور ہمارے پاس پانچ نہایت اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہیں.. کیا آپ یقین کر سکتے ہیں؟“

”اکٹھے پانچ گھوڑے.. آپ اُن کا کیا کرتے ہیں؟“

”وہ مجھے جنگل میں چرتے ہوئے بہت بھلے لگتے ہیں، ایک تصویر لگتے ہیں اور جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس تصویر میں جو پانچ گھوڑے ہیں، وہ میری ذاتی ملکیت ہیں تو مجھے اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آتا.. ہم ہر برس ایک دو ماہ کے لیے موسم سرما کے دوران برلن جاتے ہیں اور جب میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بتاتا ہوں کہ ایک ندی تک پھیلی ہوئی چراگاہ میرے تصرف میں ہے اور اُس میں میرے پانچ گھوڑے چرتے ہیں تو وہ مجھے کیسی رشک آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں.. جرمنی میں تو اچھے بھلے متمول لوگ ایک گھوڑا رکھنا بھی افورڈ نہیں کر سکتے..“

”برطانوی رائل ایئرفورس نے تو دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی کے کیسے کیسے نادر اور تاریخی شہروں اور قصبوں کو ملیامیٹ کر دیا تھا تو آپ ایک جرمن ہیں اور ماضی کے حریفوں کی تشہیر کرتے ہیں..“

”بزنس از بزنس..“ وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا کہ وہ میرے اعتراض سے لطف اندوز ہوا تھا.. ”ویسے ہماری لُفٹ وافا یا جرمن ایئرفورس نے کہیں بڑھ کر تباہی مچائی تھی، لندن کا چہرہ بگاڑ دیا تھا لیکن ماضی کی دشمنیوں کو نہ بھولنے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں.. اور ذرا نوٹ کیجیے کہ میں نے اس موٹل کا نام صرف ”تاریخی ایئرفورس لاج“ رکھا ہے، رائل ایئرفورس لاج نہیں اور باہر اس کے بورڈ کے کونے میں جس پائلٹ کی شبیہہ ہے وہ جرمن ایئرفورس کی وردی میں ہے..“

لونج ڈائننگ روم کی ایک کھڑکی میں بیٹھی بے تابی سے پَر پھڑ پھڑا رہی تھی.. میں اُس جرمن سے جان چھڑا کر کھڑکی کے قریب ہوگیا ''رات کیسی گزری؟''

''اچھی نہیں گزری.. یہ ایک بے خواب رات تھی.. سردی بڑھتی جاتی ہے.. جوں جوں ہم الاسکا کی جانب بڑھتے جارہے ہیں۔ میں اپنے گرم موسموں اور حدّت بھرے آسمانوں سے دور ہوتی جارہی ہوں.. رات کے پچھلے پہر تو میں اُن سرکنڈوں میں سردی کی شدت سے ٹھٹھرنے لگی.. اور اُن سرکنڈوں میں کچھ مقامی پرندے بھی تھے اور وہ لفنگوں کی مانند سیٹیاں بجاتے میرے گرد ہوگئے کہ یہ کہاں سے آگئی ہے.. بڑی مشکل سے اُن سے جان چھڑا کر آئی ہوں..''

''تمہاری شکل ہی ایسی ہے کہ اچھے بھلے شریف الطبع پرندے بھی لفنگے ہوجاتے ہیں..''

''ویری فنی.. اب چلیں؟''

''مجھے اس جرمن جنٹل مین سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی مہلت دے دو پھر چلتے ہیں۔''

اس دوران جرمن جنٹل مین کے سرخ وسپید چہرے پر جو تغیر رونما ہوا اُس میں حیرت کے سوا ایک خوف بھی تھا ''آپ.. یہاں کھڑکی کے قریب کھڑے ہوکر کس سے باتیں کررہے تھے؟''

''کسی سے بھی نہیں۔'' میں نے اُس کی ڈھارس بندھائی۔ ''ہم مشرقیوں کو خود کلامی کی عادت ہوتی ہے.. میں آئندہ سفر کے حوالے سے اپنے آپ سے باتیں کررہا تھا..''

اُسے یقین تو نہ آیا لیکن ایک اچھے کاروباری کی حیثیت سے اُس نے ایک گاہک سے بحث کرنا بھی مناسب نہ جانا۔ ''آپ پاکستانی ہیں؟''

''جی ہاں..''

''کینیڈا میں مقیم ایک پاکستان ہیں؟''

''نہیں.. میں پاکستان میں ہی مقیم ایک پاکستانی ہوں.. اور صرف آوارہ گردی کی خاطر ان خطوں میں آیا ہوں..''

''تو پھر آپ واٹسن لیک کے اس لاج میں شب گزرنے والے پہلے پاکستانی ہیں.. مجھے امید ہے کہ آپ کی رات آرام دہ رہی ہوگی۔''

''گیدڑوں کی آوازوں کی شب بھر دہائی کے علاوہ کیا آپ کے بستر فرش سے قدرے اونچے اور چوڑائی میں کچھ مختصر نہیں ہیں.. ایک بار تو میں بھی لڑھک گیا تھا۔''

''ہاہا..'' وہ اس شکایت سے خجل نہ ہوا بلکہ پُرفخر ہوگیا ''ہم نے ان بستروں کی اونچائی اور لمبائی چوڑائی کو جوں کا توں رکھا ہے.. یہ رائل ایئرفورس کے پائلٹوں کے لیے بنائے گئے تھے جو کبھی کروٹ نہیں بدلتے.. تو آپ نے کروٹ بدلی ہوگی؟''

''ہاں.. سوتے میں ممکن ہے کہ کروٹ بدل لی ہو۔'' میں نے شرمندگی سے اقرار کیا۔

''بس.. نہیں بدلنی چاہیے تھی.... ہم نہایت آسانی سے ان بستروں کو ذرا وسیع بھی کرسکتے تھے لیکن ہم روایت کے تسلسل کو قائم رکھنا چاہتے تھے.. تاریخ کو جُوں کا توں رہنا چاہیے چاہے اس میں کچھ بے آرامی بھی ہو۔''

''صحیح..'' میں اور کیا کہتا۔

''اور پلیز ہمارے اس یُوکانی قصبے کو معمولی نہ سمجھیے گا۔ یہاں بہت سی شاندار جھیلیں اور حیرتوں اور ریچھوں سے بھرے جنگل ہیں۔ آدر لیک ہے.. وائی لیک ہے اور اس قصبے کا سب سے پُرفخر سرمایہ ''سائن پوسٹ جنگل'' ہے جو اتنا منفرد ہے کہ آپ اُسے دیکھے بغیر چلے جائیں گے تو اپنے آپ پر ظلم کریں گے۔''

چین کا سب سے پُرفسوں اور شاندار شہر شی آن.. جہاں سے شاہراہ ریشم کا آغاز ہوتا تھا اور جہاں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ''مٹی کے سپاہیوں کی فوج'' حنوط ہے وہاں ایک ''پتھروں کا جنگل'' تھا جہاں آج سے ڈھائی ہزار برس قبل کے زمانوں سے لے کر تقریباً پانچ سو برس پیشتر تک پتھروں پر جتنے بھی شاہی فرمودات، بُدھ کے فرمان، کنفیوشس کے اقوال، عظیم چینی شاعروں کی شاعری اور راہبوں کے روزنامچے کندہ کیے گئے.. نقش ہوئے وہ سب ایک جنگل کی صورت نمائش پر تھے تو یہاں اگر وادیٔ یُوکان میں ایک ''سائن پوسٹ جنگل'' موجود تھا تو وہ کس نوعیت کا تھا..

''جن دنوں الاسکا ہائی وے کی تعمیر ہورہی تھی اور آپ جانتے ہیں کہ یہ ڈھائی ہزار کلومیٹر طویل شاہراہ صرف آٹھ ماہ بارہ دنوں کے اندر اندر تکمیل کے مراحل طے کرگئی تو اس کے تعمیری عمل میں شامل ایک امریکی مزدور جی آئی لنڈلے یہاں واٹسن لیک کی بے مہر اور سرد ویرانی میں اپنے گھر کے لیے.. ہزاروں کلومیٹر دور امریکہ کی کسی ریاست میں واقع اپنے گھر کے لیے اتنا اداس ہوا کہ اُس نے ویرانے میں ایک بورڈ نصب کردیا کہ یہاں سے واٹسن لیک سے میرا گھر اتنے کلومیٹر دوری پر واقع ہے.. پھر وہاں اُس شاہراہ کی تعمیر میں شامل جتنے بھی اپنے اپنے گھر کے لیے اداس ہونے والے لوگ تھے اُنہوں نے ایسے بورڈ نصب کرنے شروع کردیے کہ میں ہنری جیکسن.. اپنے اوریگان کے گھر سے.. تین ہزار کلومیٹر دور ہوں.. اور یوں سائن پوسٹوں کا ایک جنگل نمودار ہوتا گیا اور لمحۂ موجود میں وہاں پچاس ہزار سے زائد سائن پوسٹ ایستادہ ہیں... یہاں سے گزرنے والے کئی سیاح بھی اپنے گھر سے دوری کے فاصلوں کے سائن پوسٹ اُن میں شامل کردیتے ہیں.. اگر تم چاہو تو وہاں یُوکان سے اپنے گھر کی دُوری کے فاصلے رقم کرکے ایک سائن بورڈ نصب کرسکتے ہو.. کیا تم جانتے ہو کہ تم اپنے گھر سے کتنے دور ہو؟''

''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اُس سائن پوسٹ جنگل کے پچاس ہزار سے زائد سائن پوسٹوں میں کوئی ایک بھی ایسا سائن پوسٹ نہیں جس پر اتنے طویل فاصلے درج ہوں گے جتنے میرے اور میرے گھر کے درمیان میں ہیں.. صرف فاصلے نہیں کئی سمندر اور براعظم راستوں میں حائل ہیں.. نہیں.. مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ میں اپنے گھر سے کتنی دُوری پر.. یہاں اس یُوکانی قصبے واٹسن لیک میں ہوں..''

ہمارا قافلہ ناشتے سے فارغ ہوکر ایئرفورس لاج سے نکلا تو ابھی جیپوں کے انجن گرم نہیں ہوئے تھے جب دائیں جانب وہ ''سائن پوسٹ جنگل'' نظر آگیا.. میرا جی چاہا کہ ہم رُک جائیں اور میں وہاں ایک سائن بورڈ آویزاں کردوں جس پر رقم ہو..

پاکستان.. میرا گھر.. زیرو کلومیٹر.. کہ وہ میرے دل میں ہے..

○●○●○

’’سونے کا دیس یُوکان اور.. مولوی غلام رسول عالم پوری‘‘

1897ء میں فرینک واٹسن نام کا ایک چودہ سالہ لڑکا اپنے باپ کے ہمراہ کیلیفورنیا سے نکلتا ہے اور سونے کی ہوس اُنہیں وادئ یوکان تک لے آتی ہے.. وہ دونوں اس وادی کی بیابان وحشتوں میں قدم رکھنے والے پہلے سفید فام ہیں.. فرینک واٹسن کسی اڈیلا سٹون نامی خاتون سے بیاہ کرتا ہے اور کسی ’’مچھلی جھیل‘‘ کے کنارے ایک جھونپڑا ڈال کر آباد ہو جاتا ہے... وہ سونا تلاش کرتا ہے اور جنگلی جانوروں کو ہلاک کر کے خوراک کا بندوبست کرتا ہے.. اور یہی ’’مچھلی جھیل‘‘ آج کا واٹسن لیک ہے.. واٹسن لیک وادئ یُوکان کا دروازہ کہلاتا ہے..

تقریباً پاکستان کے رقبے جتنی اس وادی کی کُل آبادی شاید پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ واٹسن لیک کے قصبے کی آبادی بہت بڑھا چڑھا کر بھی بیان کی جائے تو ڈیڑھ ہزار سے نہیں بڑھتی اور وہ جو اس وادی کا صدر مقام وہائٹ ہارس ہے وہاں تو ایک خلقت آباد ہے جن کی گنتی کریں تو پورے تیس ہزار افراد شمار میں آتے ہیں.. ڈاسن سٹی.. یعنی ڈاسن قصبہ نہیں ایک شہر.. پورے اٹھارہ ہزار لوگ.. ان کے سوا ہر قصبہ پانچ سات سو یا ہزار بارہ سو..... بیورو کریک کی آبادی پورے ایک سو بیس باشندے.. آپ جان گئے ہوں گے کہ اس وادی کا سب سے بڑا مسئلہ کثرتِ آبادی ہے..

امریکہ کی بیابانیاں اور کائناتی وسعتیں کچھ کم نہیں لیکن کینیڈا میں تو بے انت ویران جہان اور پانیوں کے سمندر ذخیرہ ہیں.. میں اگر ڈیلفی کے اوریکل کی مانند مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا تو کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کیا دیکھتا.. آئندہ صدیوں میں صرف وہی ملک ثروت مند وجود میں قائم رہیں گے جن کے پاس وسیع بے آباد رقبے ہیں جن میں پانیوں کے بے بہا ذخیرے ہیں.. دنیا کے بیشتر ممالک جن میں بہر طور ہندوستان اور پاکستان شامل ہیں، ان کی آبادی میں اتنا بے قابو اضافہ ہوگا کہ زمین بھر جائے گی اور لوگ کیڑوں مکوڑوں کے مانند کسی حد تک سمندروں میں گرنے لگیں گے.. صرف وہی ملک زندہ رہیں گے.. جن کی آبادی مختصر اور زمین کا بے آباد پھیلاؤ بے انت ہوگا.. ان میں ظاہر ہے امریکہ، کینیڈا کے علاوہ کچھ جنوبی امریکی اور افریقی ممالک شامل ہوں گے، یہ اپنا باقاعدہ وجود قائم رکھ پائیں گے کہ صرف ان کے پاس مزید انسانی آبادی کو سہارنے اور اُسے زندہ رکھنے کے لیے خوراک اور پانی کی گنجائش ہوگی..

یہ ایک آوارہ گرد کا قیاس ہے جو.. سراسر باطل بھی ثابت ہو سکتا ہے..

مجھے تو ایشیا کے بخت کے آثار اچھے دکھائی نہیں دیتے، ابھی نہیں دو چار سو برس بعد.. ویسے تو یورپ بھی ڈوب سکتا ہے لیکن شاید وہ اپنی تنظیم اور عقلیت سے آبادی کے پھیلاؤ کو اپنے جغرافیائی مختصر پن میں محدود رکھنے میں کامیاب ہو جائے

لیکن ہم تو ڈوبے ہی ڈوبے..

’’ایئر فورس لاج‘‘ سے نکل کر ’’سائن بورڈ جنگل‘‘ پر ایک نظر ڈالتے واٹسن لیک کے بکھرے ہوئے گھروں اور دو تین شاہراہوں کو عبور کرتے جب ہم ایک مرتبہ پھر الاسکا ہائی وے کے مسافر ہوئے تو ایک سنگِ میل پر ’’اینکراتیج... 1620 کلومیٹر‘‘ درج دکھائی دیا اور ہم اس طویل مسافت کے خوف میں چلے گئے کہ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا.. اور آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا..

واٹسن لیک سے الاسکا کی سرحد تک کا فاصلہ بھی کچھ کم نہ تھا.. 912 کلومیٹر.. البتہ ہمیں کچھ طمانیت اس خیال سے ہوئی کہ ہم کیلگری سے تقریباً دو ہزار کلومیٹر دور ہو چکے تھے..

سونے کی وادی.. یُوکان.. سفر کے دوران یہ ہمارا شائبہ تھا یا حقیقت تھی کہ کبھی کبھار سورج کی کرنیں مسافروں کے چہروں پر پڑتیں تو وہ سونے میں ڈھلے چہرے لگتے اور وہ جو گُونگ چپ بیٹھی تھی اُس کے سفید پر ان کرنوں کے اثر سے گندھارا عہد کے کسی راہب خانے میں سے برآمد ہونے والے سونے کے جھمکے کی مانند سنہرے دکھائی دینے لگتے..

اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یُوکان سونے کا دیس تھا..

سونے کی کان تھا..

اور اس سنہری پیلی دھات کا سحر بھی کیا ہے جس نے حضرت انسان کو ہمیشہ سے اس کے حصول کے لیے حواس باختہ اور دیوانہ بنائے رکھا.. عہد قدیم سے لے کر عہد موجود تک انسان کی ہوس میں جنس کے علاوہ یہ سونا ہے جس کا تسلسل جاری ہے.. وہ بے شک کبھی مصر میں بلیّوں، مگرمچھوں، سانپوں اور بھیڑیا خداؤں کے سامنے سرنگوں ہوا.. کبھی یونان میں زیوس اور اپالو کی پرستش کی.. اژدھوں کو خدا مانا.. بندروں اور ہاتھی کی سونڈھ والے دیوتاؤں کے سامنے جھکا.. بے انت دیوی دیوتاؤں کے چرن چھوئے... معبدوں، کلیساؤں اور مسجدوں میں سجدہ ریز ہوا لیکن اس حضرت انسان نے اگر کسی ایک خدا کی دل و جان سے پرستش کی، اُس پر مکمل ایمان لایا تو وہ سونا تھا.. نسل انسانی کا یہ واحد مشترکہ خدا تھا..

بیشتر خدا.. دیوی اور دیوتا زمانوں کی دُھول میں گم ہو گئے.. لیکن سونے کا خدا ایسا ہے جو آج تک متروک نہیں ہوا.. اگرچہ گورکی نے اسے زرد شیطان کا نام دیا لیکن وہ بھی جب اسے کسی اخباری انٹرویو میں ملنے والے ڈالروں کے معاوضے میں دیکھتا تو فدا ہو جاتا تھا..

کیمیا گری کے جنون میں کیسے کیسے حکماء اور بزرگان دین.. صرف ایک آنچ کی حسرتِ ناتمام لیے مر گئے.. پیتل سے سونا بنانے کا جنون مدھم نہیں ہوا.. جھیل صد پارہ کا وہ چشمہ جو اُس جھیل پر ڈیم بننے سے شاید اب ڈوب چکا ہو اُس کے پانیوں کی ریت میں سونے کے ذرے ستاروں کی مانند چمکتے تھے اور مطیع الرحمن ایک مدت تک اُس ریت کی پوٹلی اپنے سینے سے لگائے پھرا کہ شاید میں اس میں سے سونا کشید کر سکوں.. دریائے سندھ کے کنارے ’’سونے والوں‘‘ کے متعدد افلاس زدہ غربت میں غرق گاؤں ہیں جن کے مکین ہزاروں برسوں سے سندھ کی ریت چھانتے اُس میں سے کسی ایک بڑی سونے کی ڈلی کی آرزو میں زندگی اجاڑ دیتے ہیں.. اُنہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، سوائے چند ذرّوں کے لیکن وہ فاقے کرتے پھر بھی اپنی چھلنیوں میں ریت چھانتے رہتے ہیں، وہ سونے کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکتے.. آلِ اسرائیل اپنے عقیدے کو

سلامت رکھنے کی خاطر مصر کے گھر بار اور کھیت چھوڑ دیتی ہے.. در بدر اور رسوا ہوتی ہے لیکن جونہی اُن کے سامنے سامری ایک سونے کا بچھڑا پیش کرتا ہے تو وہ اپنے موسےٰ کو فراموش کر دیتے ہیں جو کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے گفت و شنید کرنے گیا ہوا ہے اور اُسے.. سونے کے ایک بچھڑے کو خدا مان کر سجدے کرنے لگتے ہیں..

سونے کے سحر کے کیسے کیسے صحیفے نسل انسانی کی تاریخ میں درج ہیں..

ہمارے ہاں بھی اُسی بہو کی قدر ہوتی ہے جو سونے کے زیورات میں لدی چلی آئے.. اور جو محبوب گلے میں سونے کا کینٹھا ڈالے صحن میں اُترتا ہے تو مُیار صرف اُسی کے لیے اپنی ماں سے سفارش کرتی ہے کہ دیکھو تو سہی.. ہمارے صحن میں سونے کا کینٹھا پہنے ایک مہمان آیا ہے.. اس کا سواگت کرو..

چنانچہ نسل انسانی کا اگر کوئی ایک دائمی اور متفقہ خدا ہے تو وہ سونا ہے.. سونے کے اس خدا نے بھی اس وادیٔ یُوکان میں اپنا ظہور کیا تھا.. تین نہایت غلیظ، بدبودار، ہر مقام پر بالوں سے بھرے سفید فام.. شوکم جم، ڈاسن چارلی اور جارج کارمک یُوکان کی ایک ندی میں گھٹنوں تک آتے برفیلے پانیوں میں کھڑے ہیں.. اگرچہ اُنہیں پانیوں سے کچھ شغف نہ تھا کہ وہ تقریباً ایک برس سے نہائے نہیں تھے، اُن کے بدنوں پر ایک برس میں ایک چھینٹا بھی نہ پڑا تھا کہ یہ نہانا دھونا.. ہر مقام کو مصفا رکھنا.. یہ گرم حمام، یہ ایرانی یا تُرکی حمام وغیرہ صرف مشرقی تہذیب کے گناہ تھے۔ صرف اُندلس میں یہ قباحت مسلمانوں کے نزول کے باعث در آئی ورنہ پورا یورپ سراسر پاک اور برسوں سے نہایا نہیں تھا.. شاہی خاندانوں کے افراد بھی پانی سے ایک سگ گزیدہ کی مانند ڈرتے تھے اور اپنے شاہانہ لبادوں میں سے سرایت کرنے والی بدبو کو پاؤڈر اور عطریات کے چھڑکاؤ سے مدھم کرتے تھے پر پانی سے پرہیز کرتے تھے... ایسی راہبائیں بھی تھیں جو اپنی پاکیزگی کی دلیل پیش کرتے ہوئے اقرار کرتی تھیں کہ اُن کے پوتر بدن کو آج تک پانی نے نہیں چُھوا.. جب غرناطہ کا آخری مُور آنسو بہاتے ہوئے رخصت ہوا تو اُس کے بعد اُن ''کفار'' کو ملک بدر کرنے کے لیے یہی جواز کافی ہوتا کہ یہ لوگ ایک حمام میں غسل کر رہے تھے..

جن زمانوں میں راقم الحروف انگلستان میں تھا تو وہاں بھی ہمارے ہوسٹل کے سکاٹ وارڈن یہ سمجھ نہ پائے کہ آخر یہ پاکستانی ہر اتوار کو غسل خانے میں جا کر چھپاک چھپاک نہاتا کیوں ہے... اور ٹب کو لبریز کر کے اُس میں ڈبکیاں یوں کیوں لگاتا ہے کہ پانی ٹب کے کناروں سے ابھر کر غسل خانے کے فرش کو پانی پانی کر دیتا ہے..

یہ صرف امریکی تھے جنہوں نے ہر بیڈ روم سے ملحقہ ایک غسل خانے کی قباحت کو فروغ دیا.. خوب نہانے دھونے لگے.. ہر روز شاور کرنے لگے..

لیکن یہ نہانے دھونے کے قصّے تو بہت بعد کے ہیں، ابھی 1896ء ہے جس میں یہ تینوں سفید فام گھٹنوں تک آتے پانیوں میں سونے کی آرزو میں ریت چھان رہے ہیں اور پھر ایک روز اُن میں سے کسی ایک کی چھلنی میں سونے کی ایک ڈلی جھب دکھلانے لگتی ہے جس کی قیمت اُن زمانوں میں ایک آدھ نہیں پورے چھ ڈالر تھی..

اس ایک ڈلی کے نمودار ہونے کی خبر یورپ اور امریکہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ کسی وادیٔ یُوکان سے کوہ طور پر سونے کا خدا جلوہ گر ہوا ہے اور یوں کم از کم ایک لاکھ افراد اپنے گھر بار ترک کر کے اس خدا کے حصول کے لالچ

میں نکل کھڑے ہوئے... اُن میں سے بیشتر کو یہ خدا نہ ملا.. برفوں، جنگلوں اور ویرانیوں میں بھٹکتے موت سے ہمکنار ہو گئے..

شاید میرے کچھ پڑھنے والے مجھ سے کچھ بدگمان ہو رہے ہوں کہ یہ شخص اپنے سفرِ الاسکا کے مناظر ذرا کم بیان کر رہا ہے، اِدھر اُدھر نکل جاتا ہے.. بھٹک جاتا ہے، راہ راست پر نہیں آتا تو میرے یوں بھٹک جانے کا ایک جواز ہے۔ ان لمبی مسافتوں کے دوران.. یہ جو مناظر ہیں، لینڈ سکیپ ہیں، زمین پر جو کچھ بچھا ہوا ہے اور جو سر بلند ہے اور نشیب میں ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اُن عمیق جنگلوں میں جو اتنے گھنے ہیں کہ اُن میں دھند بھی سرایت نہیں کر سکتی اور اس کے باوجود اُن کے اندر جو حیات ہے، چرند پرند ہیں، جو پکھیرو چہکتے ہیں اور جو حیوان حرکت کرتے ہیں.. اور پھر جتنے پانی ہیں، وسیع ذخیرے بھی اور گونجتے برفانی دریا بھی.. یہ سب اگر کبھی کبھار وقفوں کے بعد نظر کے سامنے آئیں تو انسان اُنہیں بیان بھی کرے.. لیکن وہ تو ایک ایسے تسلسل کے ساتھ چلے آ رہے ہیں کہ دم ہی نہیں لینے دیتے تو پھر میں کیونکر مسلسل اُنہیں بیان کر سکتا ہوں.. اور مناظر کے اس قافلۂ ہائے رنگ و بُو کی بزم آرائیوں اور رعنائیوں کو بیان بھی کروں تو کہاں تک کروں.. اور کن لفظوں میں کروں جو کہ انوکھے اور نئے ہوں.. ان کی تصویر کشی کے لیے کہاں سے وہ رنگ لاؤں جو ابھی استعمال نہیں ہوئے اور وہ بُرش کہاں سے دستیاب ہوں گے جنہیں تحریر کے کینوس پر لگاؤں تو وہ تصویر زندہ ہو جائے۔

حروف تہجی بھی تہی دامن ہو جائیں تو پھر کس کا دامن تھاموں..

مجھ تہی دامن کی بجائے مولوی غلام رسول عالم پوری کو وادیٔ یُوکان اور الاسکا کا سفر اختیار کر کے اس کا قصہ ضبطِ تحریر میں لانا چاہیے تھا.. وہ جو حضرت یوسفؑ کے حسن کو بیان کرنے میں قدرت رکھتے تھے صرف وہی اِس حُسن کو گرفت میں لا سکتے تھے..

میں نے جب مولوی صاحب کا قصہ یوسف زلیخا پڑھا اور بصد دقت پڑھا کہ اپنی ہی مادری زبان سے غفلت اور دُوری آڑے آتی تھی.. تو جب اس قصّے میں پہلی بار حضرت یوسف کا ظہور ہوتا ہے تو مولوی صاحب نے اُن کے حُسن کی توصیف میں کیسی کیسی نادر تراکیب اور تشبیہات دریاؤں کی روانی کی مانند بہا دیں، جانے کہاں سے ایسے ہیرے موتی لے آئے جنہیں وہ دامنِ یوسف میں ٹانکتے ہی چلے جاتے تھے.. اُن کے سوہنے پن کی صفت میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے اور مجال ہے کسی ایک ترکیب یا تشبیہہ کو دوبارہ برتا ہو.. اور ہر مصرع یُوکان کے سونے کی ایک ڈلی سے بھی کہیں بڑھ کر سنہری اور دمکتا ہوا.. قصہ آگے بڑھتا ہے.. حضرت یوسف کا چہرہ ایک مرتبہ پھر اپنی توصیف طلب کرتا ہے تو مولوی صاحب ایک مرتبہ پھر اُن کی شکل صورت کی ہزاروں من موہنی تصویریں بناتے چلے جاتے ہیں اور ہر تصویر دوسری تصویر سے رنگوں اور رعنائیوں میں جدا.. جب میں اس قصّے کے درمیان تک پہنچا اور اس دوران مولوی صاحب متعدد بار حضرت یوسف کی مدح میں دیوان کے دیوان تحریر کر چکے تھے، کل لغت، ساری گرائمر اور سارے حروف تہجی اِستعارے، اشارے اور تشبیہات صرف کر چکے تھے تو میرے چہرے پر کسی حد تک ایک طنزیہ مسکراہٹ آئی کہ مولانا.. آپ کی کُل قادر الکلامی تمام ہوئی.. اب اگر حضرت یوسف کا بیان آ گیا تو کیا کرو گے.. اور جب ایسا ہوا تو مولوی غلام رسول عالم پوری ایک مرتبہ پھر حُسن کے ایسے استعارے اور ایسے اشارے جانے کہاں سے لائے جو آج تک کسی کاغذ پر کہاں اُترے ہوں گے.. اُنہوں نے کوئی دسویں مرتبہ حُسنِ یوسف کو کچھ یوں بیان کیا کہ اگر میں مصری کنیزوں میں سے ایک ہوتا تو اپنی اُنگلیاں کاٹ لیتا..

دراصل مولوی صاحب حُسنِ یوسف کو بیان کرنے کے لیے ایک اپنا اور منفرد حروف تہجی ایجاد کرنے پر قادر تھے۔ وہ اُس حسن بے مثال کے لیے ایک نئی زبان تراشتے تھے.. جہاں حروف تہی دامن ہو جاتے تھے وہاں وہ اپنے نئے پیکر تخلیق کر سکتے تھے۔ بے شک وارث شاہ نے ہیر کے حسن کو جن جادوگر شعروں میں بیان کیا ہے اُس کی مثال دنیا بھر کے ادب میں نہیں ملتی لیکن.. وہ پھر بھی مولوی غلام رسول کی مدح یوسف کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے..

تو اے مجھ سے بدگمان قارئین میں مولوی غلام رسول عالم پوری نہیں ہوں کہ حُسنِ یوکان اور سحر الاسکا کو عام لفاظی اور تشبیہات سے کنارہ کش ہو کر ایک نئی زبان تراش کر بیان کر سکوں.. اس لیے معذرت.. اور کسی حد تک شرمندگی..

''تم بے وجہ ایک تخلیقی احساسِ کمتری کے شکار ہو رہے ہو۔'' کونج میرے ذہن کی تختی پر نقش ہونے والے ہر خیال تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ ''ہر جانور اپنی اپنی بولی بولتا ہے اور اڑ جاتا ہے۔ وہ یہ پرواہ نہیں کرتا کہ جس نجر کے گھنے پن میں وہ بولتا ہے وہاں کچھ اور پکھیرو بھی چہکتے ہیں جو اُس سے بڑھ کر خوش آواز ہیں.. اگر وہ پرواہ کرنے لگے تو ہمیشہ کے لیے تو منقار زیر پر ہو جائے.. موازنہ کرنے سے انسان موت سے ہمکنار ہو سکتا ہے اس لیے اپنی بولی بولو اور اڑ جاؤ۔''

''کونج..'' میں روہانسا ہو گیا۔ ''میں واقعی شدید تخلیقی احساس کمتری کا شکار ہو گیا ہوں.. مُجھے اس سے پیشتر بہت زعم تھا کہ کون ہے جو مجھ سے زیادہ منظروں کو محسوس کر سکتا ہے اور اُنہیں بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہے.. اگر میں نے درجن بھر کتابیں صرف پاکستان کے شمال کے مناظر کی توصیف میں لکھی ہیں تو میں قدرت رکھتا ہوں لیکن یہاں آ کر اس وادیٔ یوکان میں مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں زبان و بیاں کے حوالے سے ایک مُخنث ہو گیا ہوں.. میں تشفی کرنے کے قابل نہیں رہا۔ میں قدرت کی ان عجوبہ نیرنگیوں اور کرشموں کو اور مناظر کے ان معجزوں کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک مخنث ہو گیا ہوں..''

''چل جھوٹے..'' کونج نے جانے کیوں ذرا نخریلی ہو کر کہا..

○●○●○

''بادۂ گُل رنگ کا ساغر کُھلا... ٹسلن جھیل کی قوسِ قزح''

ڈاسن کریک کے زیرو میٹر سے آغاز ہونے والی الاسکا ہائی وے جب تقریباً ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ ہماری جیپوں کے ٹائروں تلے طے کر چکی تو ایک منظر کُھلا..

چونکہ میں مولوی غلام رسول کی ہمسری کرنے سے عاجز تھا اس لیے اپنے چاچا جی یعنی مرزا اسداللہ خان غالب سے رجوع کیا کہ کیسا منظر کُھلا..

موتیوں کا ہر طرف زیور کُھلا
بادۂ گُل رنگ کا ساغر کُھلا
رکھ دیا ہے اِک جامِ زر کُھلا
میری حدِ وسع سے باہر کُھلا

اور

کس نے کھولا، کب کُھلا، کیوں کر کُھلا..

واٹسن لیک سے رخت سفر باندھا ہے تو راستے میں رانچیریا نام کی بستی کے چند جھونپڑوں کے بعد کوئی نرم خو دریا.. یعنی سوفٹ رور آیا ہے.. دو ہزار میٹر بلند ڈاسن پیک نظر آئی ہے اور گزر گئی ہے.. اور پھر آنکھوں میں ٹسلن لیک پھیلنے لگی ہے جس پر ایک طویل کماندار پُل.. شاہراہ الاسکا کا سب سے طویل پُل ایستادہ نظر آنے لگتا ہے اور ابھی ہم بلندی پر ہیں اور یہ جھیل بہت نشیب میں ایک نیلے قالین کی مانند بچھی ہے جب ہم اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک ایسے مقام پر رکتے ہیں جہاں لکڑی کا ایک خوش نما کیبن سیاحوں کی سہولت کے لیے ایستادہ ہے.. اور اُس کے ماتھے پر ''ولیج آف ٹسلن'' رقم ہے۔ بارش کو میں بیان نہیں کر سکا لیکن وہ ابھی تک مسلسل برستی جا رہی ہے اور اب یکدم تھم گئی تھی، رُک چکی تھی اور ہوا میں ایک سرد گیلا ہٹ تیرتی تھی..

آگ بھڑکی، مینہ اگر دم بھر کُھلا

مینہ ابھی دم بھر پہلے کُھلا تھا اور ونڈ سکرین پر اُس کی بوندیں پھسلتی تھیں..

ٹسلن.. ایک یورپی نام نہیں ہے.. کینیڈا کے قدیمی ٹلونگٹ قبیلے کی آبائی زبان میں ''طویل مختصر پانیوں'' کو ٹسلن کہتے ہیں.. اس جھیل کی لمبائی تو سوا سو کلومیٹر تک چلی جاتی ہے لیکن چوڑائی کہیں بھی دو تین کلومیٹر سے زیادہ نہیں اس لیے..

طویل مختصر پانیوں کی جھیل..

اور جہاں وہ کم سے کم مختصر تھی وہاں ایک کماندار پُل شاہراہ الاسکا کو پار لے جاتا تھا..

بارش ابھی ابھی رُکی تھی..

جھیل ٹسلن پر بادل امڈتے تھے اور اُس کے کناروں پر جو شجر ہجوم کرتے تھے وہ دوہرے ہوتے دکھائی دیتے تھے کہ وہاں اب بھی بارش کی بوچھاڑ ہو رہی تھی.. دور دور تک کوئی نفس نہیں..

دور دور تک ایک بھیگی ہوئی تنہائی..

میں نے اپنے سفرنامے ''یاک سرائے'' میں آوارہ گردوں کے حقوقِ ملکیت کے بارے میں ایک شق پیش کی تھی کہ جو بھی دنیا سے اوجھل، ان دیکھے منظر ہوتے ہیں، گمنام جھیلیں ہوتی ہیں جب ایک کوہ نورد اُن تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اُس کی ملکیت ہو جاتی ہیں تو اس قانونی نکتے کی رُو سے چونکہ یہ موتیوں کا ہر طرف زیور، بادۂ گُل رنگ کا ساغر، جامِ زرِ مجھ پر کھلا اس لیے میں اس کی ملکیت کا دعویٰ دائر کر سکتا ہوں..

بے شک میں اس سفرِ حیات میں زیادہ متمول اور صاحب جائیداد نہیں ہو سکا لیکن خواب و خیال کی روشنائی سے ورقِ دل کے اشٹام پر پکّی سیاہی سے رقم میری ملکیت میں ان گنت جھیلیں اور بے انت وادیاں تھیں.. بے شک میں کسی دنیاوی عدالت میں یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ یہ میری ذاتی جائیداد ہیں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ یہاں سود و زیاں کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا..

گونج.. جیپ کی عافیت میں پَر سمیٹے بہت دیر سے بیٹھی میری منتظر تھی کہ میں ٹسلن جھیل کے منظر کے اندر ایسا گیا تھا کہ لوٹتا نہ تھا.. اُس نے بے زار ہو کر اپنا ایک پَر جیپ کے ہارن پر رکھ دیا..

ٹسلن کی ساری وادی میں اُس کا شور برپا ہوا.. شاید جھیل کنارے جو شجر تھے اُن میں روپوش پرندے اس ہارن کی آواز سے ہراساں ہو کر ذرا پھڑ پھڑائے..

''ہم پہنچ چکے الاسکا.. اگر تم ہر دل فریبی پر یونہی تادیر رُکتے رہے تو ہم الاسکا نہیں پہنچنے والے.. یاد رکھو کہ یہ ستمبر کے اوائل کے دن ہیں اگر ہم مسافت کے دوران یوں اٹکتے اور ٹھہرتے رہے تو الاسکا میں برفباری کا آغاز ہو جائے گا اور برفانی ریچھ اینکر ایج کی گلیوں میں اُتر آئیں گے.. چلیں؟''

بہت جی چاہا کہ جیپ میں بیٹھے ہوئے اُسے ڈانٹوں کہ اے ناواقفِ آدابِ آوارہ گردی گونج.. تو نہیں جانتی کہ یہ جھیل ٹسلن بھی میری ملکیت میں آ چکی ہے اور میں اپنی اس ذاتی جائیداد کا معائنہ کر رہا تھا.. لیکن میں نے اجتناب کرنا مناسب جانا.. وہ پہلے سے ہی میری ذہنی حالت کے بارے میں.. تمام اُلفت اور رغبت کے باوجود شکوک میں مبتلا تھی تو اُسے مزید مشکوک کیا کرنا!

جیپ بلندی کے اُس منظر سے نشیب میں ڈھلتی، سرو نما درختوں کی پہریداری میں سے گزرتی بالآخر جھیل پر ایستادہ سفید کماندار پُل کے اندر داخل ہو گئی.. پُل کا آہنی وجود دھڑ دھڑ گزرنے لگا اور اُس کی محرابوں میں سے جھیل ٹسلن کے پانی آزردگی سے جھانکنے لگے کہ آسمان گدلے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا جو اُس کی نیلاہٹ کو مٹیالا کرتے تھے..

پُل کے پار دائیں ہاتھ پر ''یوکان موٹل'' کی ڈھلواں سبز چھتوں والی ایک خوش نظر چوبی عمارت نظر آئی..

اور اُس پر بھی بادۂ گُل رنگ کا ایک منظر کھلا تھا..

ایک قوسِ قزح رنگین خمار میں یوں اترتی تھی کہ وہ جھیل ٹسلن کے پانیوں میں سے جنم لیتی جھولا جھولتی بلند ہوتی تھی اور ایک نیم دائرہ تخلیق کرتی یوں محسوس ہوتا تھا کہ بلندی سے اُتر کر اس موٹل کے دل کش کمروں کے اندر گم ہو رہی ہے.. یہ ست رنگا منظر یوں کھلا تھا کہ بارش ابھی ابھی رُکی تھی اور بادلوں میں روپوش سورج کی چند کرنیں اُن کی قید سے فرار ہو کر اس رنگین سراب کو جنم دینے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں..

میں نے ایک بار اسلام آباد جاتے ہوئے گوجر خان سے ذرا آگے اور تب بھی بارش رُک رُک کر تھم چکی تھی سطح مرتفع پوٹھوہار کے تہہ در تہہ سرسوں کے کھیتوں کی ڈھلی ہوئی زردی پر ایک ایسی قوسِ قزح اُترتی دیکھی تھی جس کا شوخ زرد رنگ یوں لگتا تھا جیسے سرسوں کے پھولوں میں سے کشید ہوتا آسمانوں کو چھوتا تھا.. جھیل ٹسلن میں سے جنم لینے والی اس قوسِ قزح میں جو نیلا رنگ تھا وہ بھی یوں لگتا تھا جیسے جھیل کے پانیوں میں سے نیلاہٹ مستعار لیتا آسمانوں کو چھوتا، ایک نیم دائرے میں اُترتا ''یوکان ہوٹل'' کے کمروں میں سرایت کرتا جا رہا ہے.. اور اِن میں سے کسی ایک کمرے میں اس ازلی تنہائی کی وسعت میں واقع اس موٹل کے کسی ایک کمرے میں جب کہ ایک قوسِ قزح اُس کے اندر چلی آتی ہو، کچھ وقت بسر کرنا کیسا ہوگا.. کمرے کی آرائش کی ہر شے.. فرش پر بچھا قالین، بستر، ٹیبل لیمپ، پردے.. یہاں تک کہ واش روم کا کموڈ بھی کیسے کیسے رنگوں میں رنگا جائے گا.. اور اُس کا مکین جب آئینے کے روبرو ہو تو کیا اُس کے چہرے پر بھی وہی سات رنگ کھیلتے ہوں گے..

مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے گونج سے اس درپردہ خواہش کا اظہار کیا تو وہ مجھے صرف مشکوک نہیں مجذوب بھی جانے گی... اظہار کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ میری خواہش کی تختی پر درج رنگین عبارت پڑھ چکی تھی.. اُس کے ردِعمل میں ایک حیرت انگیزی مُضمر تھی.. ''ہاں واقعی.. وہاں جھیل میں سے جنم لینے والی ایک رین بو تو ہے لیکن یہ تمہارا تخیل ہے کہ وہ ''یوکان موٹل'' کے کمروں میں اُتر کر اُن میں گم ہو رہی ہے۔''

''گونج یقین کرو۔''

وہ بے اختیار ہنس دی اور میں اُس کی اس بے سبب ہنسی کا جواز نہ جان سکا ''مستنصر.. جب بھی تم بے دھیانی میں مجھ سے کہتے ہو کہ یقین کرو تو.. یقین کرو تم میرا دل موہ لیتے ہو..... پلیز ایک مرتبہ پھر کہو کہ.. یقین کرو۔''

''تم بے شک یقین نہ کرو۔'' میں ذرا خفا ہو گیا لیکن اس خفگی میں شرماہٹ کی جو آمیزش ہونے والی تھی اُسے میں نے بمشکل روکا کہ اس عمر میں اگر ایک شخص شرمائے تو وہ کیسا شاندار قابل رحم بُغد لگے گا۔ ''لیکن.. میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ قوسِ قزح واقعی موٹل کے کمروں پر اُترتی اُن کے اندر اثر کر رہی ہے.. اور اگر اس لمحے اُن میں سے کسی ایک کمرے میں تم ہوتیں تو.. یقین کرو تم بھی ست رنگی ہو جاتیں.. آزمائش شرط ہے۔''

اب گونج کے شرمانے کی باری تھی، اُس کے سفید پروں پر شفق کی سُرخی ایسا پوچا پھر گیا۔ ''چلو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ الاسکا سے واپسی پر ہم اسی ''یوکان موٹل'' میں ایک شب بسر کریں گے.. لیکن تب اس کے کمروں پر اُترتی

قوس قزح نہ ہوگی.. یا تو ایک شفاف آسمان ہوگا اور یا رات ہوگی.."

"کیا واقعی.." میں تو ایک بچے کی مانند خوش ہو گیا..

"پرامس.." اُس نے بھی بچوں کی مانند اپنا پَر میری ہتھیلی پر رکھ کر کہا۔

"اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہماری واپسی تک یہ قوس قزح جس کے رنگ اب پھیکے پڑنے لگے ہیں اور فضا میں تحلیل ہونے کو ہے.. یہ یونہی ہماری واپسی تک جوں کی توں قائم رہے گی.. تحلیل نہ ہوگی.. یقین کرو.."

"ہمیں چلنا ہے.. ابھی ہمیں یوکان کے صدر مقام وہائٹ ہارس تک پہنچنا ہے اور پھر وہاں سے آگے بھی ایک طویل مسافت ہے جو ہمیں رات گئے ڈاسن سٹی تک لے جائے گی.. اور کل سویرے ہم امریکہ کی سرحدی چوکی پوکر کریک سے ہو کر الاسکا میں داخل ہوں گے.. اور تم جانتے ہوناں کہ ہم "ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ" یعنی ٹیلر روڈ کے مسافر ہوں گے جو شنید ہے کہ دنیا کی سب سے خوش نظر اور خوش منظر روڈ ہے.. تو ہمیں چلنا ہے۔"

میں کچھ دھیان نہیں کر رہا تھا کہ میں تو الاسکا کو فراموش کر کے وہاں سے واپسی کا منتظر ہو گیا تھا جب ہم اس "یوکان موٹل" میں ایک شب بسر کریں گے۔ "گونج.. نہ صرف یہ کہ ہم واپس آئیں گے تو یہ رین بو یونہی موجود ہوگی بلکہ تم بھی سَت رنگی ہو جاؤ گی.."

"چل جھوٹے.." یہ گونج یقیناً لاہوری تھی ورنہ یوں ذرا بازاری انداز میں نخریلی نہ ہوتی..

"یقین کرو.."

○●○●○

"وہائٹ ہارس... ایک گلابی گھوڑا کیوں نہیں"
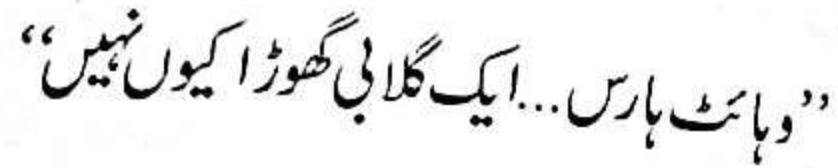
یہ جو قافلہ الاسکا تھا.. جس میں شامل سیاح سفر کے آغاز میں کیسے چلبلے اور کھلنڈرے ہوئے جاتے تھے، چہلیں کرتے تھے اور دوستانوں کی خواہش میں قربت کے متلاشی تھے.. آج مسلسل مسافت کے تیسرے دن... قطب شمالی کے یخ سمندروں کے کناروں پر پڑے ہوئے گوشت کے سیاہ ڈھیر سیلوں کی مانند کاہلی اور مایوسی کے شکار اپنی اپنی نشستوں پر ڈھیر پڑے تھے.. کبھی کبھار کروٹ بدلتے اور پھر ڈھیر ہو جاتے... وہ اپنی اپنی حیات کے پچھلے برس میں کنجوسی کر کے.. رقم جمع کرتے رہے تھے کہ اس سفر الاسکا کے اخراجات کسی بھی ثروت مند کو کنگال کر سکتے تھے.. اور انہوں نے اتنی قربانیاں صرف اس لیے دی تھیں کہ اُن کے تصور کے مطابق ایڈمنٹن سے نکلتے ہی کچھ دیر بعد اُن کی جیپوں کے باہر برفانی ریچھ نہایت کثرت میں ٹہلنے لگیں گے.. اپنے دونوں پنجوں پر ایستادہ ہو کر کھڑکی کے شیشوں پر تھوتھنیاں جما کر انہیں "ہاؤ ڈو یو ڈو" کہیں گے... اور پھر اسکیموز کے برفانی گھر "اِگلو" بھی تو دکھائی دینے لگیں گے.. یہ اسکیمو اپنی برفانی رتھوں پر سوار جنہیں درجنوں بھیڑیا نما کتے کھینچتے ہوں گے پل دو پل رُک کر اُن کے شکر گزار ہوں گے کہ آپ ہمارے قطب شمالی میں آئے تو کیا ہم آپ کو روسٹ شدہ رینڈیر گوشت پیش کریں.. اور آج مسلسل مسافت کو تیسرا دن آ چکا تھا اور الاسکا کے سفید خواب کا دور دور تک کچھ شائبہ نہ تھا.. اس لیے وہ سُست اور مایوس ہو کر اپنی اپنی نشستوں پر سیلوں کی مانند ڈھیر پڑے تھے..

وہ تو سیاحتی گائیڈ بکس اور پوسٹروں کی تصاویر کے فریب میں آ گئے تھے، ہرگز آگاہ نہیں تھے کہ یہ برفانی ریچھ، برف زار اور اِگلو گھر.. اگر آپ ایک انجن کا طیارہ کرائے پر حاصل کر کے فیئر بینکس سے اڑان کر کے نہایت طویل مسافتوں کے بعد کسی ویران بستی میں جا اترتے ہیں تو وہاں بھی آپ کو اطلاع ملے گی کہ جی ہاں.. پرسوں شام یہاں ایک برفانی ریچھ دیکھا گیا تھا اور اسکیمو؟.. وہ تو کب کے اپنے اِگلو گھر ترک کر کے آرام دہ فلیٹوں میں رہتے ہیں اور مائیکل جیکسن اور میڈونا کے گیتوں پر سر دُھنتے ہیں... آپ کیسے بے وقوف ہیں جو سیاحتی پوسٹروں پر اعتبار کر لیا اور نیشنل جیوگرافک کی اُن دستاویزی فلموں پر ایمان لے آئے جو برف زاروں کے کہیں اندر برسوں کی مشقت کے بعد وجود میں آتی ہیں..

کونسے برفانی ریچھ اور کیسے اسکیمو..

چنانچہ میں بھی الاسکا کے اس سفرنامے کو نہایت چاؤ سے پڑھنے والوں کو ابھی سے بتائے دیتا ہوں کہ اس سفرنامے میں کسی ایک برفانی ریچھ کی بھی توقع نہ رکھئے گا.. البتہ کم از کم ایک اسکیمو کی توقع رکھ لیجیے گا... وہ اینکریج کے ایک بنچ پر بیٹھا پاکستانی گولڈ لیف سگریٹ کے سُوٹے لگا رہا ہوگا..

ہم جھیل ٹسلن کے ست رنگے سراب سے باہر آئے اور ایک سفید گھوڑے کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔۔
وہی مسلسل بیابانیاں۔۔مسافت کی بے حسابیاں، جنگلوں، کوہساروں اور دریاؤں کی بے انتہائیاں۔۔

"ہے گائیز۔۔یہ وہائٹ ہارس جو اس نہ ختم ہونے والی وادئ یوکان کا صدر مقام ہے تو یہ ایک وہائٹ ہارس، ایک سفید گھوڑا کیوں ہے۔۔ایک گلابی یا جامنی گھوڑا کیوں نہیں ہے۔۔؟"

سب لوگوں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔۔

طویل مسافتوں سے اکتا چکا یہ ایک ایسا امریکی سیاح تھا جس نے اپنے سفری بیگ میں کینیڈین بربن وسکی کی ایک بوتل صرف اس لیے سنبھال رکھی تھی کہ جونہی وہ الاسکا کے ایک برفزار میں مٹر گشت کرتے ایک پولر بیئر کے روبرو ہو گا تو وہ ایک جام بنا کر اُس ریچھ سے مخاطب ہو کر کہے گا "چیئرز"۔۔اور اگر وہ ریچھ کچھ رسیا ہوا تو اُسے بھی ایک گھونٹ پلا دے گا۔۔

اور وہ امریکی سیاح تین روز کے مسلسل سفر کے بعد جب اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا، اتنا عاجز آیا کہ اُس بوتل کے منہ سے منہ لگا کر طویل گھونٹ بھرتا خاصا غتربود ہو چکا تھا اور یہ وہی تھا جس نے پکارا تھا کہ۔۔وہائٹ ہارس ایک سفید گھوڑا کیوں ہے، ایک گلابی یا جامنی گھوڑا کیوں نہیں ہے۔ وہ خمار کی اُن سرمستیوں میں تھا جہاں سفید تو کیا، سیاہ اور بھورے گھوڑے بھی گلابی اور جامنی دکھائی دینے لگتے ہیں۔۔

جیپیں آگے پیچھے ہوتی رُکنے لگیں۔۔

ہمارے گائیڈ نے اشارہ کیا کہ اُتر آئیے، ایک قابل دید مقام ہے۔

ستمبر کی خزاں کی زرد آلودگی میں کچھ جھاڑیاں۔۔ایک چیڑ نما گھنے درخت تلے، ایک کھنڈر احاطہ۔۔جس پر چھت نہ تھی، آسمان کھلا تھا اور وہاں ایک معلوماتی بورڈ آویزاں تھا۔۔

"مانٹیگ روڈ ہاؤس۔۔ہسٹارک سائٹ"

یعنی مانٹیگ کا تاریخی مقام۔

یہ پناہ گاہ۔۔ایک کوٹھڑی کی سرائے۔۔جن شہتیروں سے تعمیر کی گئی تھی وہ زمانوں اور موسموں کے مارے ہوئے بوسیدہ ہو کر بکھر بکھرے ہو رہے تھے، ہمارے گائیڈ کے مطابق یہ ایک کوچ سٹیشن تھا جہاں پچھلے وقتوں میں گھوڑا گاڑیاں، گھڑ سوار اور سونے کے متلاشی پریشان حال ٹھہرتے تھے یا تازہ دم ہو کر آگے چلے جاتے تھے۔۔

یہ تاریخی ورثہ تقریباً سو برس پرانا تھا۔۔

ہر خطے میں قدامت کے معیار اُس خطے کے تہذیبی تسلسل کے پیمانوں کے مطابق ہوتے ہیں۔۔

میری رائٹنگ ٹیبل جو اتنی وزنی ہے کہ ایک بچہ ہاتھی کے دھکیلنے سے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتی تقریباً اسی برس پرانی ہے۔ میرے والد صاحب نے جب "کسان اینڈ کمپنی" کا آغاز کیا تو زراعت کی کتابیں تحریر کرتے ہوئے اسی میز پر کاغذ رکھ کر اسی طور اس پر جھکے جیسے میں آج جھکا ہوا ہوں۔۔کاروبار ذرا جدید آرائش میں ہوا تو یہ بھاری۔۔غالباً شاہ بلوط کی لکڑی سے بنی ہوئی میز متروک ہو کر سٹور میں چلی گئی جہاں سے میں نے [illegible]

اسی طرح ہمارے گھر میں لکڑی کا بھاری کُنڈے اور پیتل کے کوکوں سے آراستہ ایک صندوق ہے جو میری بیگم میمونہ کی دادی جان اپنے جہیز میں لائی تھیں اور یہ بھی تقریباً اُن زمانوں میں ساخت ہوا تھا جب مرزا غالب کوچہ بلی ماراں میں شراب پیتے تھے، جوا کرواتے تھے اور شعر کہتے تھے۔۔یہ صندوق بھی میرے سسرال کے ہاں کاٹھ کباڑ میں دھول جمع کر رہا تھا اور میں اسے اٹھا لایا۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس پرانا۔۔

امریکہ میں ایک ڈنر کے دوران ایک خاتون مجھ سے محو گفتگو ہوئی اور میں نے اپنے تعارف میں کہا کہ میں ایک لکھنے والا ہوں اور اس کے سوا مجھے قدیم نادر اشیاء یعنی اینٹیک وغیرہ جمع کرنے کا شوق ہے....میں نے گندھارا تہذیب کا حوالہ دیا کہ مثلاً ڈیڑھ ہزار برس پرانے برتن، مجسمے، مُہریں، بُدھ بھکشوؤں کی راکھ والے منقش پیالے وغیرہ۔۔تو وہ خاتون شدید متعجب ہوئی۔۔یہ تو قدامت نہیں ہے۔۔کچھ اور ہے۔۔ہمارے ہاں تو اگر کسی کُرسی کو ساخت ہوئے سو برس ہو جائیں تو وہ اینٹیک کہلاتی ہے....ڈیڑھ ہزار برس تو قدامت نہیں ایک معجزۂ قدرت ہے۔۔کیا واقعی تمہارے ہاں ایسے مجسموں اور برتنوں تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے جو ڈیڑھ ہزار سال پرانے ہوں۔۔

میں اُسے کیا بتاتا کہ ہم ایسے معجزہ ہائے قدرت اور قدامت کو روزانہ روندتے رہتے ہیں۔۔اپنا ایمان سلامت رکھنے کی خاطر جہان آباد کی بلند چٹان پر کندہ ایک الوہی بُدھ مہاتما کو بارود سے اُڑاتے رہتے ہیں۔ بامیان کے دنیا کے سب سے عظیم اور بلند بُدھ مجسموں پر ایئر فورس سے بمباری کر کے ملیامیٹ کرتے رہتے ہیں۔۔

ہمارا اگلا پڑاؤ۔۔سفید گھوڑا تھا۔۔

''وادیٔ یُوکان کا صدر مقام..سفید گھوڑا''

وہائٹ ہارس..سفید گھوڑا..وادیٔ یوکان کا سب سے بڑا شہر، اس کا صدر مقام جس کی آبادی انیس ہزار اٹھارہ افراد پر مشتمل تھی..اور جونہی ہمارا قافلۂ الاسکا اس کی حدود میں داخل ہوا تو اس کی آبادی انیس ہزار ستر افراد سے تجاوز کر گئی..

وہائٹ ہارس کا خمیر بھی سونے کی دمک سے اٹھا تھا..اور یہ سونا دریائے یُوکان کی ریت اور پانیوں میں اپنی سنہری چھب دکھلاتا اُن آوارہ گردوں کی آنکھیں خیرہ کرتا تھا جن کی لالچی آنکھیں اس کی چمک سے چندھیا جاتی تھیں اور وہ اندھوں کی مانند گرتے پڑتے اس دریائے یُوکان کی ریت چھانتے، مچھروں اور جنگلی جانوروں کا شکار ہوتے، ہولناک اجنبی بیماریوں سے مرتے، بھوک سے پنجر ہوتے محض ایک ڈلی سونے کی حاصل کرنے کی خاطر در بدر ہوتے تھے...وہ ایک ڈلی جو اُن ہزاروں میں سے کسی ایک کی چھلنی میں ایک زرد سورج کی مانند طلوع ہو کر لڑھکنے لگتی..یُوکان..کوہستانی دریاؤں کی خصلت کے مطابق کسی چٹانی بلندی سے جب نیچے گرتا ہے اور پھر اتنا پُرشور اور پُرغضب ہو جاتا ہے کہ ہر شے کو تہس نہس کر دیتا ہے تو اُس مقام کو وہائٹ ہارس کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہاں دریا کے ٹھاٹھیں مارتے اُبلتے پانی ایک سفید گھوڑے کی ایال کی مانند سفید جھاگ میں بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ بیشتر سونے کے پجاری اس مقام سے دریا عبور کرنے کی سعی میں ڈوب جاتے ہیں اور شاید وہ ڈوب کر بھی دریا کی تہہ میں بیٹھے ہوئے اُس کی ریت میں اُنگلیاں چلاتے ہوں گے کہ کیا پتہ وقت نزع سونے کی کسی ڈلی پر ہاتھ پڑ جائے..چنانچہ دریائے یُوکان جہاں ایک قوس کی مانند دوہرا ہوتا ہے وہاں اُس کی آغوش میں جو بستی آباد ہوئی وہ..وہائٹ ہارس کہلائی..

یہ وہائٹ ہارس اور اسی نوعیت کی چھوٹی چھوٹی بستیاں گمنامی میں گم رہیں اور پھر وُہی شاہراہِ الاسکا کی تعمیر کا آغاز ایسا ہوا کہ ان کے بھاگ جاگ گئے۔ تعمیراتی فرموں کے مزدور..منصوبہ ساز، انجینئر اور فوجی اس خطے میں آئے اور وہائٹ ہارس کو ٹھکانہ کیا اور اگر یہاں ریستوران، کلبوں، شراب خانوں کی بُہتات ہے، ان کا کچھ حساب نہیں تو صرف اسی لیے کہ دور دیسوں سے آنے والے، گھر کے لیے اداس پردیسی لوگ جب یُوکان ایسے ویرانے میں مجبوراً قدم رکھتے ہیں تو وہ اپنا اگلا قدم لامحالہ کسی شراب خانے یا قحبہ خانے میں رکھتے ہیں کہ اس نوعیت کے اشغال کے بغیر وہ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے۔

وہائٹ ہارس..کینیڈا کی رائل کینیڈین پولیس..گھڑ سوار نہایت اکڑی ہوئی وردی میں ملبوس پولیس کا مقامی ہیڈکوارٹر بھی ہے۔ آپ کو ان جوانوں اور ان کے گھوڑوں کی تصویریں کینیڈا کے ہر تعارفی کتابچے، کیلنڈر اور سیاحتی پمفلٹ میں ملیں گی..آپ مجھ سے قدم بہ قدم پیچھے کر میں نے کینیڈا کے طول و عرض میں سفر کرتے ہوئے..کسی قصبے میں، کسی ویرانے میں رائل ماؤنٹیز کی ایک جھلک بھی دیکھی ہو...وہ کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوں گے اور کبھی کبھار اپنی پوشیدہ پناہ گاہوں میں سے ظاہر ہو کر باوردی، گھوڑوں پر سوار، پوسٹ کارڈوں، سیاحتی پوسٹروں وغیرہ کے لیے تصویریں اُتروا کر پھر سے رُوپوش ہو جاتے ہوں گے..

کوچ کی پچھلی نشست پر تقریباً ڈھیر وہ سیاح جس نے ایک فکر انگیز سوال اٹھایا تھا کہ یہ وہائٹ ہارس، سفید ہی کیوں ہے..گلابی یا جامنی گھوڑا کیوں نہیں ہے کوچ کے رُک جانے کے دھچکے سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ''کیا ہوا ہے؟''

''ہم وہائٹ ہارس پہنچ چکے ہیں..''

اُس نے اپنی لڑکھڑاہٹ کو سنبھالا دے کر چہرہ کھڑکی کے ساتھ لگایا..اُس کھڑکی کے پار اُسے جو کچھ نظر آیا اُس کے دل پسند نہ ہوا اور وہ پھر سے اپنی نشست پر ڈھیر ہو کر بولا ''مجھے یہ سفید گھوڑا درکار نہیں۔ آپ لوگ اسے دیکھ آئیں میں تو یہاں پڑا سوتا ہوں۔''

اُس نے، اُس امریکی سیاح نے، دریائے یوکان جہاں ایک کمان بنائے دوہرا ہوتا ہے..اُس قوس کے اندر..دریائے یُوکان کی خاموشیوں کے گھیرے میں آئی ہوئی ایک بستی تھی..جس کے گھر سادہ اور سفید رنگت تھے..عمارتیں زمین کے ساتھ بچھی ہوئی تھیں کہ وہاں کوئی عمارت دو تین منزلوں سے زیادہ بلند نہیں ہوتی تھی اور یوں آسمان اطمینان سے سانس لیتا تھا اور ان گھروں اور عمارتوں کے پس منظر میں وہ جنگل نمایاں ہوتے تھے جن کی ہریاول میں خزاں کے زرد بوسے جگہ جگہ تھے..وہاں پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا زرد زرد تھا..اور یہ بستی کچھ شہر آثار نہ تھی، ایک وسیع چمنِ آتش بار تھی، پھولوں سے بھری..اور اسے دریائے یُوکان بہت دھیما اور ذرا خاموشی اختیار کیے ہوئے ذرا اداسی سے گلے لگاتا ہوا، آغوش میں لیتا ہوا..یہ شہر ایک جنت گم گشتہ وادی یوکان میں روپوش یوں کہ باہر کے زمانوں کو خبر ہی نہ تھی کہ اُس کا وجود ہے اور اُسے بھی باہر کے زمانوں کی کچھ پرواہ نہ تھی کہ اُس کے اپنے دنیا جہان سے الگ تھلگ منقطع زمانے تھے..تو اُس نے اُس امریکی سیاح نے..اگر اس شہر کو کھڑکی میں سے ایک نظر دیکھ کر رد کر دیا تھا تو وہ اسے نیویارک یا مونٹریال کے شہری پیمانوں پر پرکھ رہا تھا..جب کہ اس بستی کو پرکھنے کے لیے آنکھوں میں دمکتے دریائے یُوکان کے سونے کے ذرے درکار ہیں، ایک بڑی تنہائی میں روپوشی کی ایک اداس چاہت درکار ہے..

اگر آپ دل گرفتہ اور دنیا کو مکمل طور پر ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتے ہیں..اور شرط یہ بھی ہے کہ ہم سے جنگلوں اور بیابانوں میں بھٹکنے والی درویشی نہیں ہوتی، کچھ سہولتیں اور چند چہرے درکار ہیں تو وہائٹ ہارس یقیناً وہ گوشہ ہے جس کے قفس میں آرام بہت ہے..جہاں سے ہمیں بھی ہماری خبر نہیں آتی، شہر کی چوڑی سڑکوں پر کبھی کبھار کوئی ایک آدھ کار رینگ جاتی ہے، یہاں تک کہ ٹورسٹ انفرمیشن سنٹر کو تلاش کیا تو وہاں دروازے پر ایک زنجیر تو نہیں ایک قفل پڑا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔ وہائٹ ہارس کے ایک سُپر سٹور میں یونہی مٹرگشت کرتے میں نے ایک شرٹ کے کالر تلے ''میڈ اِن پاکستان'' دیکھا تو دل راضی ہو گیا..من مندر کے مور نے اپنے رنگین پَر پھیلا دیئے کہ میرا پاکستان وہائٹ ہارس میں بھی ہے..

وہ وہائٹ ہارس کا شاید سب سے وسیع اور مقامی پیمانے کے مطابق سب سے پُر رونق ریستوران تھا جہاں میرے اور گونج کے درمیان پہلی رنجش اور پہلی چپقلش نے جنم لیا..میں اس سفر کے دوران مسلسل پیزا، پاستا اور برگر وغیرہ کھا کھا کر اتنا عاجز آچکا تھا کہ مجھے اُن کے تصور سے ہی ابکائی آنے لگتی تھی..اور جب گونج نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر ایک مرتبہ پھر پاستا کا آرڈر کر دیا تو میں ایک بچے کی مانند بُوتھی بنجائے ناراض ہو گیا..کہ پلیز میری زبان سُوکھ گئی ہے، حلق میں کڑواہٹ ہے ایسی بے روح خوراکوں کے نگلنے کے نتیجے میں تو..پلیز..یہاں میکلوڈ روڈ کی نکاٹن چانپیں اور مزنگ کی تلی ہوئی مچھلی تو ملنے سے رہی..اور میں نے جان بوجھ کر اپنے پسندیدہ گردوں کپوروں کا حوالہ نہ دیا کہ آخر کو وہ ایک نسوانی گونج تھی اور میں اُسے کم از کم کپوروں کے بارے میں تو یہ معلومات فراہم نہ کر سکتا تھا کہ وہ کیا ہوتے ہیں اور کہاں ہوتے ہیں..تو پلیز مجھے کسی چینی ریستوران میں ہی لے چلو، مجھے کچھ چینی چاول ہی کھلا دو جن پر میں سویا ساس، ہری مرچوں کے علاوہ سرخ مرچوں کا چھڑکاؤ میں خود کر لوں گا۔میرے حلق کی کڑواہٹ کچھ تو کم ہو..اس معصوم سی آرزو کے ناراض اظہار پر گونج تو سخت رنجیدہ ہو گئی ''تم اپنے کو ایک آوارہ گرد کہتے ہو سرحدوں کو خاطر میں نہ لانے والا ایک خانہ بدوش کہتے ہو اور اس کے باوجود تمہیں قطعی طور پر یہ احساس نہیں کہ تم دنیا کے آخری سرے پر واقع الاسکا کی جانب سفر کرتے ہوئے ایک وہائٹ ہارس نام کے یوکانی شہر میں ہو اور ایسے ندیدے ہو کہ چاولوں اور سُرخ مرچوں کے لیے مرے جاتے ہو..تم کیسے آوارہ گرد ہو کہ مقامی خوراک سے مفاہمت نہیں کر پائے..ایسے ندیدے ہو۔''

''تم یہ سلاد کا گھاس پھونس چرتی رہتی ہو ناں اس لیے..تم نے کبھی میکلوڈ روڈ کے گردے کپورے نہیں کھائے ناں اس لیے..اور اُن کے ہمراہ مکھن سے چُپڑا ہوا نان نہیں کھایا ناں اس لیے..''

''آئی ہیٹ یُو..'' یہ کہہ کر گونج انتہائی خفگی کی حالت میں اُٹھی اور مجھے ترک کر کے دھڑ دھڑ کرتی ریستوران کی سیڑھیاں چڑھتی جانے کہاں چلی گئی اور اُس لمحے مجھ پر یکدم ایک لاچار اور متروک ہو چکے یتیم بچے کی سوگوار تنہائی غالب آگئی۔اگر گونج ناراض ہو کر مجھے وادیٔ یوکان کی اس بے سروسامانی میں تنہا چھوڑ کر اپنے گرم موسموں کی جانب پرواز کر گئی تو کیا ہوگا..بے شک سیاحتی گروپ کے اراکین بدستور ہم سفر رہیں گے لیکن میں اپنا حالِ دلِ زار کس سے بیان کروں گا، اُس کی رفاقت، اُلفت، رغبت اور..ہمسائیگی کے بغیر الاسکا تک کی طویل مسافتیں کیونکر برداشت کر سکوں گا..محض سرخ مرچوں کے چٹخارے نے مجھے اُس سے جدا کر دیا تھا..وہ تو اب واپس آنے والی نہ تھی..وہ ایک اڑیل گونج تھی..

اور جب میری آس امید کے محل منارے ڈھے چکے تھے اور ان کے ساتھ میں بھی تقریباً مسمار ہو چکا تھا تو وہ انہی سیڑھیوں پر سے اُترتی دکھائی دی، نہایت مطمئن چال سے چلتی آئی اور میرے سامنے بیٹھ کر اُس کمبخت پاستا کو جو اس دوران خاتون ویٹر میز پر رکھ گئی تھی، نہایت اشتیاق سے کھانے لگی..

''کہاں گئی تھیں؟''

''یہ سوال صنفِ نازک سے نہیں پوچھا جاتا..اُن کے بھی بدنی مسائل ہوتے ہیں..تم تو سفر کے دوران یکدم جیپ رُکوا کر کسی جھاڑی کے عقب میں روپوش ہو جاتے ہو یا کسی جنگل میں اُتر جاتے ہو جب کہ ہم..ہم ایسا نہیں کر سکتیں..اگر تم نے پوچھنا ہی ہے تو..میں واش رُوم میں گئی تھی..''

میری جان میں جان آئی..اس نے خفگی کا محض بہانہ کیا تھا..

سفر کی طوالت سے بھی نڈھال ہو چکے تھے اور اُن میں سرفہرست وہ امریکی سیاح تھا..بیشتر سیاح ہمیں وہائٹ ہارس میں شب بسر کرنے کی صلاح دیتے تھے لیکن کچھ سیانے ایسے تھے جنہوں نے مشورہ دیا کہ بے شک تھکاوٹ ہمیں زیر کرتی ہے لیکن ہمیں ہمت کر کے بہر صورت ڈاسن سٹی تک پہنچنا چاہیے اور اُن کا مشورہ صائب تھا، اگر ہم آج رات کے کسی بھی پہر ڈاسن سٹی پہنچ جاتے تھے تو کل صبح ہم دنیا کی سب سے خوشنما ''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ'' ٹیلر روڈ پر سفر کرتے ہوئے کینیڈا کی سرحد امریکی چوکی پوکر کریک سے پار کر کے الاسکا میں داخل ہو کر کل رات شاید فیئر بینک میں بسر کر سکتے تھے..

میں اس کوچ اور قیام کے تنازعہ میں قطعی طور پر بظاہر غیر جانبدار تھا۔میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ میں وہائٹ ہارس میں شب بسر کر لوں پر میرے جی کا کیا اعتبار...یہ تو ہر منظر ہر بستی پر ٹھہر جاتا تھا۔رُک جاتا تھا..

''تم کہو..'' میں نے گونج سے رجوع کیا۔

''کوچ کرتے ہیں..''

سو ہم نے رختِ سفر جو بندھا تھا اُسے نہ کھولا..بندھا رہنے دیا..

اور جب ہم کوچ کرتے تھے تو دریائے یوکان کے برابر میں جو ویران شاہراہ تھی اُس پر رواں ہوتے تھے، دریا کے پانیوں میں ایک قدیم وضع کا سٹیمر لنگر انداز تھا..ایک بھاپ سے چلنے والا سٹیمر..ویسا ہی جو دریائے مسس پی میں بھونپو بجاتا، موٹی چمنی میں سے دھواں خارج کرتا، آہستہ خرام مارک ٹوین کے کرداروں کو پار لے جاتا تھا..اور یہ بھاپ کے زور سے رواں ہونے والا سٹیمر وہائٹ ہارس کا سب سے امتیازی لینڈ مارک تھا..

ایک نووارد سیاح جو امریکہ سے اور خاص طور پر نیو یارک سے کینیڈا میں داخل ہوتا ہے تو یکدم اُس کے کان سناٹے میں آجاتے ہیں، ایک ٹھہراؤ اور سکوت کا احساس ہوتا ہے..ایک پُرامن کیفیت بدن میں مبتلا ہو جاتی ہے، نہ کوئی شور وشغب، نہ کوئی مار دھاڑ ہنگامہ..جیسے آپ کسی ہنگامہ خیز شاہراہ کی بھاگ دوڑ میں سے یکدم کسی ذیلی راستے پر اتر جاتے ہیں اور وہاں ایک امن کی وادی ہے..چُپ کھیت اور کھلیان ہیں جن کے بُوٹے کسی شور یا ہنگامے سے ناآشنا ہیں..اور صرف کینیڈا کی لینڈ سکیپ ہی نہیں اس کے باسی بھی امریکہ کی نسبت قدرے سستی سے حرکت کرتے ایک دیہاتی انداز میں سکھ چین کی بنسری بجا رہے ہیں..

امریکہ..ایک طوفان میل ہے، پوری رفتار سے چھک چھک کرتی چلی جا رہی ہے نہ کہیں دم لیتی ہے نہ رُکتی ہے..اور اگر آپ نے اس تیز رفتار گاڑی پر سوار ہونا ہے تو اُسی رفتار سے بگٹٹ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیے اور اگر آپ کے بھاگ اچھے ہیں تو اس پر چڑھنے میں کامیاب ہو جایئے ورنہ زندگی کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جایئے اور اپنی معاشی محرومیوں کا ماتم کیجیے۔

اور کینیڈا..اور وہاں بھی وادیٔ یوکان..اور اُس میں بھی وہائٹ ہارس...ایک مال گاڑی..چھک چھک کرتی نہیں..ایک چھک کرتی اور پھر مدتوں بعد نہایت سُستی سے ایک اور چھک مجبوراً کرتی..نہ صرف ہر سٹیشن پر تادیر رُکتی بلکہ ہر کراسنگ پر چاہے ہر سگنل ڈاؤن ہو تب بھی رُکتی..اور جب تک پلیٹ فارم پر منتظر آخری مسافر بھی سوار نہ ہو جائے رُکی رہتی..اور اگر

کسی مسافر سے یہ مال گاڑی چھوٹ بھی جائے تو وہ اس چلتی گاڑی کے ہمراہ کچھ دور بھاگ کر آسانی سے اس میں سوار ہو سکتا ہے.. بلکہ آپ آسانی سے نزدیکی جنگل میں گھوم پھر آیئے اور پھر بھی نہایت سہولت سے اس سست رو گاڑی میں سوار ہو سکتے ہیں..

ویسے.. چاہے ہجر ہو یا وصال.. دونوں کی الگ الگ لذتیں ہیں.. امریکہ کی طوفان میل ہو یا کینیڈا کی مال گاڑی.. ان دونوں کی بھی الگ الگ لذتیں ہیں..

وہاں دل فرصت کے وہی رات دن مانگتا ہے اور یہاں آپ تصورِ جاناں کیے پڑے رہیں.. تو پڑے رہیں..

دریائے یوکان کے قوس کنارے پر ہم ایک مختصری گلی میں داخل ہوئے جس کے دائیں بائیں بمشکل پندرہ بیس گھر ہوں گے.. یہ بھی چپ سے گھر جیسے گڑیا گھر، لکڑی سے بنے ہوئے قدیم وضع کی بالکونیوں والے سفید سفید گھر کہ وہ سب سفید تھے.. نہ کوئی اُن کے دروازوں کے باہر کھڑا تھا اور نہ کوئی کھڑکیوں میں سے جھانکتا تھا.. ان میں کون لوگ ہوں گے جو حیات کرتے ہوں گے.. ان کی خوشنمائی اور خاموشی کو تکتے ہوئے مجھے وہ سارے گھر یاد آ گئے..

دنیا بھر میں بکھرے ہوئے وہ گھر جو مسافتوں کے دوران ایک لمحے کے لیے میری سیاہ آنکھوں میں تصویر ہوئے اور پھر اگلے لمحے اوجھل ہو گئے.. وہ پیچھے رہ گئے لیکن میرا تصور اُن کے بند دروازوں پر دستک دیتا رہا کہ اندر کون ہے.. اس گھر میں کون رہتا ہے.. میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس گھر کے مکین مجھ سے اگر مختلف ہیں تو کیسے مختلف ہیں.. ان کے خواب اور ایمان کیسے ہیں، کس عقیدے کو آخری سچ سمجھتے ہیں.. کیا یہ بھی سوگواری اور سرخوشی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور کیا اس گھر کے اندر ایک ماں بھی ہے.. اگر ہے تو کیا میری ماں جیسی ہے.. اُس جیسی تو نہیں ہو سکتی کہ صرف میری ماں ہی میری ماں جیسی ہو سکتی ہے۔

لاہور سے کراچی جاتے ہوئے سورج کب کا غروب ہو چکا تھا اور چند کچے مکانوں کی ایک بستی ہے جو ٹرین سے باہر کی شب میں ڈوبنے والی ہے اور وہاں کسی ایک گھر میں ایک دِیا روشن ہو چکا ہے تو وہاں اُس کچے گھر میں کون رہتا ہے.. افغانستان، ایران یا شام میں سفر کرتے ہوئے جب رات کی سیاہی اتر آتی ہے تو اُس رات میں.. کسی ویرانے میں ایک گاؤں.. گزرتا جاتا ہے.. کوہ آرارات کی سفیدی کے دامن میں ایک گاؤں اور اُس میں ایک گھر جس میں سے سفید دھواں اٹھ رہا ہے.. سویڈن کے گھنے جنگلوں کے اندر.. قرمونہ سے اشبیلیہ جاتے ہوئے مالٹوں کی زرد کھٹی مہک بس کی کھڑکی میں سے اندر آ رہی ہے اور اُس کے دوش پر سوار گٹار کی ایک دُھن ہے جو مالٹے کے ایک باغ میں پوشیدہ گھر کے اندر سے جنم لے رہی ہے اور وہاں ایک ٹمٹماتا بلب جل رہا ہے.. تو اُس گھر میں کون ہے، کون ہے جو گٹار کی تاروں کو چھیڑ رہا ہے..

ان سب گھروں میں مجھ ایسے لوگ تھے.. وہ کیسی کیسی محبتوں، اُلفتوں اور اذیتوں میں مبتلا تھے جن سے میں آگاہ نہ تھا اور وہ بھی تو آگاہ نہ تھے کہ اُس لمحے میں وہاں سے گزرتا ہوں.. کون دیکھتا ہے..

لیکن میرا یہ تصور اُن کے دروازوں پر ایک بار تو دستک دیتا ہے..

اور یونہی وہائٹ ہارس کی اس مختصر گلی میں سے گزرتے ہوئے ان خاموش سفید گھروں کو ایک پل اپنی آنکھوں پر

نقش ہوتے اور اگلے پل اس نقش کے زائل ہونے پر میں ہمیشہ کی طرح دل گرفتہ کہ آخر کار جہاں اتنا دراز کیوں نہیں ہے کہ میں ہر ایسے دروازے پر دستک دے کر اُس گھر کے اندر جا سکتا اور اُن سے دریافت کر سکتا کہ کیا تم بھی مجھ ایسے ہو.... ہم ایک ہی دنیا کے باسی ہیں تو پھر کیوں ایک دوسرے سے آگاہ نہیں..

وہائٹ ہارس کی اُس مختصر گلی میں سے گزرتے ہوئے یہ دل گرفتگی کی آزردگی کچھ سوا ہوئی کہ اب بقول بابا فرید.. داڑھی چٹی سفید ہو چکی تھی، پیچھا بہت دور رہ گیا تھا اور آگا نزدیک آ رہا تھا تو اب میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا کہ میں اُن تمام گھروں کے دروازوں پر دستک دیتا اور پوچھتا کہ اندر کون ہے.. یہ حیات کا ایسا محدود پن تھا جو مجھے ہر دروازے پر دستک دینے کی مہلت نہ دیتا تھا..

میں نے بنا دستک دیئے ہی رخصت ہو جانا تھا..

○●○●○

''الاسکا ہائی وے پر سگریٹ کے ساتھ سیکس مت کرو''

وہائٹ ہارس کے مختصر پن سے نکلے ہیں تو سورج دن بھر کی مسافت سے تھک ہار کر ایک مرد بیمار کی مانند جس کا چہرہ موت کی زردی سے رنگا جاتا ہے، ڈھلتا جا رہا تھا۔ بلندیوں پر یوں بھی شام کی سرمئی دیوی یکدم آسمانوں سے اُترتی ہے اور تمہارے آس پاس براجمان ہو جاتی ہے۔ جیپ کے اندر آ کر تمہیں اپنے سرمئی پن میں رنگ لیتی ہے.. اور ایک بلخر ہے پانیوں کا ذخیرہ ساتھ ہو لیتا ہے۔ جیپ اس جھیل کے کناروں پر چلی جاتی ہے اور یہ وہ سماں ہے جب دن اندر باہر ہو رہا ہو ہے.. اس کی روشنی اندر باہر ہوتی یکدم بجھ جاتی ہے اور وہ بجھ گئی تو اُس لمحے برابر میں گزرتی جھیل کے وسیع سمندر پانی سیاہی میں یوں ڈوبے کہ اُن کی سطح پر چراغ روشن کرنے کا وقت آ گیا۔ پر کون ہے جو اپنی رواں جیپ میں سے نکل کر پانیوں پر چراغ جلانے چلتا۔ گروپ میں شامل مسافر سب کے سب وہائٹ ہارس کی چُپ ساتھ لے کر آ گئے تھے.. آس پاس جو تاریکی میں ڈھلتے منظر تھے اُن سے غافل ہو کر یا تو اونگھ رہے تھے اور یا پھر اپنی اپنی تمناؤں کی دنیا میں اُتر کر بے خبر ہو چکے تھے۔

صرف کُونج تھی جو غافل نہ ہوئی تھی اور نہ اُس کی سیاہ بھوری آنکھوں میں نیند کا کچھ شائبہ تھا..

''کیا تم خوش ہو؟'' اُس نے یکدم پر پھڑپھڑا کر مجھے مخاطب کیا۔

''چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں۔''

''کونسی مرغابیوں کا..'' حیرت زدگی سے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں.. اُن مرغابیوں کا..''

''صحیح..'' اُس نے ایک دانش مند نانی جان کی مانند متانت سے سر ہلایا ''میں سمجھ سکتی ہوں۔''

''کیا؟'' پتہ نہیں وہ کیا سمجھ رہی تھی۔

''تمہیں توقع نہیں تھی کہ الاسکا کا یہ سفر اتنا طویل اور کٹھن ہو گا، تم اگر بہک گئے ہو تو میں تمہیں دوش نہیں دے سکتی... جو بھی تم جیسے آشفتہ سر آوارہ گرد ہوتے ہیں وہ اپنی طویل مسافتوں کے دوران کبھی نہ کبھی حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ اوڈیسس جب سنہری کھال کی تلاش میں سرگرداں اپنی کشتی.. آرگو پر سوار ایجئین سمندروں میں گیا تو وہ بھی حسین چڑیلوں کے گیت سُن کر اور ایک 'یک چشم عفریت کو سمندر میں اُبھرتے ہوئے دیکھ کر حواس کھو بیٹھا تھا، مارکو پولو کو صحرائے گوبی کی ریت کی دہشت میں سے جنم لینے والے آسمان تک بلند ہوتے جن دکھائی دیتے تھے.. ابن بطوطہ کا بھی یہی حشر ہوا تھا.. کوہ نوردوں کو بدمعاش آدمی 'یے تی' دکھائی دینے لگتے ہیں اور سنولیک کے سفر کے دوران تم بھی تو اس واہمے کا شکار ہوئے تھے ہر تمہاری سفید سوزوکی درہ بیسپر کی برفوں کے سائے میں ہارن بجاتی تمہیں متوجہ کرتی ہے.. تو اگر تمہیں اس سفر الاسکا کے دوران جانے کونسی مرغابیاں دکھائی دینے لگی ہیں تو یہ آشفتہ سری کے معجزے اور سراب ہیں..''

میں نے اگرچہ اس سفر کے دوران اپنی تمباکو نوشی کو بے حد محدود کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود گولڈ لیف کے سگریٹوں کا ذخیرہ ختم ہونے کو تھا.. میرے پاس اب صرف ایک پیکٹ موجود تھا جسے میں بچانا چاہتا تھا تا کہ الاسکا پہنچ کر وہاں کی شفاف فضا کو پاکستانی تمباکو سے آلودہ کر سکوں.. تو مجھے سگریٹ درکار تھے..

امریکہ کی مانند کینیڈا میں بھی تمباکو دشمنی حماقت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے.. ان کا بس چلے تو ہر اُس شخص کو سنگسار کر دیں جس کے منہ سے دھواں برآمد ہو رہا ہو چاہے وہ دھواں نہ ہو برفیلے موسموں میں منہ سے خارج ہونے والی بھاپ ہو اور کینیڈا میں تو یہ رویہ نہایت دل آزار ہو جاتا ہے یعنی وہاں سگریٹوں کے جتنے بھی جانے پہچانے برانڈ ہیں اُن کے پیکٹوں پر.. کینسر، پھیپھڑوں اور گلے کے سرطان، پھوڑوں، ناسوروں اور مُردوں کے ڈھانچوں کی ہولناک تصویریں چھپی ہوتی ہیں تا کہ سگریٹ نوش اُنہیں دیکھ کر لرزہ براندام ہو کر توبہ تائب ہو جائے.. سگریٹ پینے والے شائقین نے اس کا ایک آسان حل دریافت کر لیا ہے.. وہ خوفناک تصویروں سے مزین سگریٹ کا پیکٹ خریدتے ہیں اور فی الفور سگریٹ نکال کر سگریٹ کیس میں منتقل کر کے پیکٹ کو کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیتے ہیں..

مجھے شبہ ہے کہ تمباکو کے خلاف اس جہاد کے علم بردار اپنے سردار حضرات ہیں جن کے مذہب میں اور کچھ حرام نہیں سوائے بال تراشنے اور تمباکو نوشی کے.. چونکہ سردار کینیڈا پر راج کرتے ہیں بلکہ ایک صوبے کے وزیر اعلیٰ بھی ایک سردار منتخب ہوئے تھے تو اس تمباکو دشمنی کی جڑیں اُن کی گھنی جھاڑی داڑھیوں میں سے پھوٹتی ہیں.. ویسے حرام ہے کہ سگریٹوں کے پیکٹوں پر موت کے بعد کے ان منظروں کو نقش کرنے سے ان کی ہولناکی سے خوفزدہ ہو کر کسی ایک شخص نے بھی سگریٹ نوشی ترک کی ہو یا اُن کی فروخت میں کچھ کمی واقع ہوئی ہو..

ہماری جیپ رُکی تو بقیہ جیپوں کے ٹائر بھی تھمنے لگے..

''شاید یہاں سے تمہارے سگریٹ مل جائیں.. اس ویرانے میں اگر ایک عمارت میں ابھی تک روشنی ہے تو یقیناً وہاں ایک چھوٹا سا سٹور ہے۔''

مجھے اب کُونج سے باقاعدہ ڈر لگنے لگا تھا.. اگر لمحۂ موجودہ میں دل کی تختی پر جو آرزو نقش ہوتی تھی وہ اُسے پڑھ سکتی تھی تو کیا پتہ ماضی میں جو کچھ اُس پر تحریر ہوا تھا، وہ بھی ابھی تک موجود ہو اور کُونج اس سے بھی آگاہ ہو تو وہ کیسے کیسے راز افشا کرنے پر قادر ہے.. اُس سے ڈرنا ہی چاہیے تھا.. ''تم جان گئیں کہ میرا سگریٹوں کا ذخیرہ اختتام کو پہنچ رہا ہے؟''

''اور تم نے ایک پیکٹ صرف اس لیے سنبھال رکھا ہے کہ تم الاسکا پہنچ کر پاکستانی سگریٹ کا ایک کش لگا کر اپنے وطن سے دوری کا کچھ مداوا کر سکو.. جاؤ۔'' وہ تحکمانہ انداز میں بولی ''اب ایک کُونج تو سگریٹ خریدتے ہوئے اچھی نہیں لگتی.. ویسے بھی کینیڈا میں سگریٹ اور شراب خریدنے کے لیے آپ کو اپنا شناختی کارڈ پیش کر کے ثابت کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ ہے.. میں تو ابھی بہت کم سن ہوں.. اور تم.. اٹھارہ برس سے کچھ زیادہ برسوں کے ہو تو جاؤ۔''

اُس نے یہ "جاؤ" اسی بے رُخ بدتمیزی سے کہا جیسے وہ اس سفر کے دوران.. بولو.. چلو.. کھاؤ.. وغیرہ کے احکام صادر کرتی تھی اور واقعی اُس عمارت کے اندر ایک مختصر سا سٹور تھا جس کی چپٹی ناک والی فربہ مالکن مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر ذرا چونکی ہو گئی کہ اس رات میں یہ گندمی رنگت کا غیر متوقع اجنبی جانے کون ہے اور کس نیت سے میرے سٹور میں داخل ہوا ہے.

وہ بھی سگریٹ کی اسیر تھی، کش لگا رہی تھی "پلیز.."

"مجھے سگریٹ درکار ہیں۔ آپ کے پاس ہیں؟"

"کونسا برانڈ؟"

"کوئی سا بھی.."

اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اِدھر اُدھر بہت سی چیزوں کو اتھل پتھل کیا، کچھ دراز کھولے.. چند کارٹن الٹ پلٹ کیے اور بالآخر چند پیکٹ برآمد ہو ہی گئے۔

"کہاں کے ہو؟"

"میں بہت دور کے ملکوں سے آیا ہوں.. پاکستان!"

"میں بھی خاصی دور سے آئی ہوں.. فلپائن.. موسم گرما یہاں یوکان میں الاسکا ہائی وے کے کنارے اس سٹور کو چلانے میں گزرتا ہے اور سردیوں میں واپس اپنے وطن اور بال بچوں کے پاس چلی جاتی ہوں.. یہ ایک بہت ہی تنہا زندگی ہے.." جانے وہ کتنی دیر سے یونہی تنہا کسی گاہک کی آمد کی منتظر بیٹھی سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہی تھی تو وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی.. "میرے پاس دو نہایت ستھرے اور آرام دہ کمرے بھی کرائے کے لیے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ تم لوگ یہاں نہیں ٹھہرو گے، ڈاسن سٹی میں جا کر ہی دم لو گے.. اگر پھر کبھی یہاں سے گزر ہوا تو شب یہیں بسر کرنا تمہیں بہت لطف آئے گا.."

"یہاں اس شاہراہ کے کنارے جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں۔ یوں اکیلے اور مکمل سکوت میں رہنا کیسی زندگی ہے؟"

"گزر جاتی ہے.. آمدنی مناسب ہے.. راتوں کو کبھی ریچھ آ جاتے ہیں اور کبھی بھیڑیے خوراک سونگھتے چلے آتے ہیں لیکن وہ گزند نہیں پہنچاتے.. اگر میں یوکان کی بجائے کسی بڑے شہر میں ہوتی تو بالکل فارغ اور بیکار رہوتی.. یہاں کی تنہائی اور ویرانی ہی میرے رزق کا سبب بنتی ہے، جو کچھ بھی اِدھر سے گزرتا ہے، رُک جاتا ہے کہ اس یکسر ویرانے میں کون دوکان سجائے بیٹھا ہے اور کچھ نہ کچھ خرید لیتا ہے.. میرے پاس بیئر کے کچھ ٹین ہیں، اگر تم دلچسپی رکھتے ہو تو.. ان علاقوں میں شراب کے بغیر تنہائی نہیں کٹتی.." میرا خیال ہے کہ میری آمد سے پیشتر وہ صرف سگریٹ ہی نہیں پی رہی تھی.. اپنے اکلاپے کا بھی ایک گونہ بے خودی والا علاج کر رہی تھی۔

جیپ کا ہارن رات کے اُس اندھیرپن میں غُل کرتا مجھ تک آیا.. گونج میری طویل غیر حاضری سے مضطرب ہو گئی تھی..

"تم نے اتنی دیر لگا دی.. میں دیکھ سکتی تھی کہ وہاں کوئی چپٹی ناک والی موٹی لومڑی سی عورت ہے جس کے ساتھ تم فلرٹ کر رہے تھے.. ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔"

"خدا کے لیے گونج.." میں اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا کہ وہ بھی کیسے کیسے وسوسوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ "وہ محض اپنی داستانِ حیات بیان کر رہی تھی اور وہ ایسی ہرگز نہ تھی کہ میں اُس کے ساتھ فلرٹ کرتا.."

"ہر مرد.. چاہے وہ کسی بھی عمر کا ہو.. نوجوان ہو یا بوڑھا.. فلرٹ ہوتا ہے.. یہ کبھی نہیں دیکھتا کہ عورت موٹی، یا بھدی ہے، فوراً بچھ جاتا ہے... ایک مور کی مانند اپنی ساری طاقت صرف کر کے اپنے پروں کی نمائش کرنے لگتا ہے.. یہ پر بوسیدہ ہو کر ماند پڑ چکے ہوں تب بھی باز نہیں آتا.. اُس کے گرد رقص کرنے لگتا ہے۔"

کیا وہ حسد کی آگ میں جلتی تھی یا اُس کی حیات میں جتنے بھی نر گونج آئے تھے وہ بے وفا اور فلرٹ تھے.. اور یوں وہ کسی بھی نر کا اعتبار نہ کرتی تھی..

سفر جاری ہوا تو میں نے نہایت اشتیاق سے ایک پیکٹ کھولا اور اُس میں سے ایک سگریٹ کھینچ کر نکالا.. میری عادت ہے کہ میں.. جیسے باتیں کرتے ہوئے انگوٹھے اور اُنگلی سے اپنے ہونٹوں کے کناروں کو یونہی پونچھتا ہوں اگرچہ وہاں کچھ بھی نہیں ہوتی.. یا ان دنوں شیو کرتے ہوئے اپنے پژمردہ ہو چکے چہرے کو غور سے دیکھنے سے اجتناب کرتا ہوں یا پھر صبح کی سیر کے دوران کسی گھنے شجر کے بھیتر میں کوئی نامانوس پرندہ چہکے تو میں اُس کے نیچے کھڑے ہو کر اُس کی چہک سے لطف اندوز مسکراتا ہوں بلکہ کوشش کرتا ہوں کہ اُس کی آواز کی نقل اُتار کر اُس سے کلام کر سکوں.. تو ایسے ہی میں ایک سگریٹ سلگانے سے پیشتر اُسے ذرا نرم کرنے کی خاطر ہولے ہولے کچھ دیر اُسے انگلیوں سے دباتا اور مَسلتا ہوں..

"مت کرو.." ہم اُس تنہا سٹور سے کہیں آگے کسی گھنی تاریکی میں اُترے چلے جا رہے تھے جب گونج نے مجھے دھمکایا..

"کیا نہ کروں؟" میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا تھا..

"یہی.. جو تم برسرِعام سگریٹ کے ساتھ سیکس کرتے ہو.. سلگانے سے پیشتر اُسے اپنی اُنگلیوں سے نرم کرتے ہولے ہولے دباتے ہو.."

میں تو سناٹے میں آ گیا.. وہ نہ صرف ایک حاسد بلکہ کسی حد تک ایک جنسی گونج تھی.. وہ مجھے تو بے راہرو لگنے لگی تھی۔ اس نوعیت کا اعتراض تو آج تک کسی نے نہ کیا تھا۔

اُس میں عمیق مشاہدے کی صلاحیت عام انسانوں سے کہیں بڑھ کر تھی اور وہ نہ صرف ذہن کے پردوں پر جو خیال عکس ہوتے تھے اُنہیں دیکھ لینے پر قادر تھی بلکہ عام اور معمولی حرکات و سکنات کی ایسی توجیہات دریافت کرتی تھی جو.. فرائیڈ کے گمان خوابوں میں بھی نہ آ سکتی تھیں... کیا سگمنڈ فرائیڈ نے کبھی ایک سگریٹ کو سلگانے سے پیشتر جب اُسے انگلیوں سے دبا کر.. ذرا مسل کر نرم کیا جاتا ہے.. کبھی جنس کے ساتھ جوڑا تھا.. یہ محض اس گونج کی دریافت تھی۔

ڈاسن سٹی.. کُل آبادی بارہ سو اکیاون افراد.. ہمارے گلبرگ کے جے بلاک کی آبادی اس سے کم از کم دس گنا زیادہ ہو گی اور پھر بھی ایک شہر.. یوکان اور سونے سے لبریز دریا کلونڈائک کے کناروں پر آباد ایک بستی.. کہاں تھی..

ہم ایک تاریک گھیرے گھٹا ٹوپ خلاء میں نابینائی کے مسافر تھے.. صرف ہماری جیپوں کی ہیڈ لائٹس بینا تھیں اور وہ بھی شب کی گھنی تاریکی میں اُترتی دم توڑتی بجھتی لگتی تھیں..

ہمیں اس مسلسل مسافت میں تین روز بیت چکے تھے اور الاسکا کی کچھ خبر نہ آتی تھی کہ کہاں ہے.. شاید نہیں ہے، اگر ہوتا تو اب تک آ نہ جاتا.. اور یہ ڈاسن سٹی بھی اگر ہوتا تو اب تک آ نہ جاتا..

○●○●○

"ڈاسن سٹی کا چاند نگر... شہرِ دل کی گلیوں میں"

"اَل ڈیراڈو ہوٹل.."

اَل ڈیراڈو.. ایک چاند نگر..

اُس ہوٹل کے اُس چوبی قدیم کمرے کے باہر..

اور ایک ایسی وضع قطع کا کمرہ جو وائلڈ ویسٹ کے زمانوں میں ڈوبا ہوا تھا اور جس میں شوخ، نہایت عامیانہ میک اپ میں لتھڑی ہوئی نہایت حیا سوز خواتین اپنے وسیع گھاگھرے اُٹھا کر سیاہ جرابوں میں جکڑی ہوئی ٹانگیں نمایاں کر کے متوجہ کرتی تھیں اُن بھوکے، گندے، میل کچیل سے بدبودار ہوتے، گھوڑوں کی پُشت پر صدیوں سے سوار کاؤبوائز کو.. اور وہ رالیں ٹپکاتے، اپنی بوسیدہ جینوں میں سرکتے ہیجان کو بمشکل قابو کرتے ایسے ہی چوبی قدیم کمروں کے دروازے کھول کر ان خواتین پر سونے کی ڈلیاں نچھاور کر دیتے تھے جو اُنہوں نے یُوکان اور کلنڈ رائک دریاؤں کی ریت چھان کر حاصل کی ہوتی تھیں اور پھر اگلی سویر پچھتاتے تھے کہ سونے کی وہ ڈلیاں اُن خواتین کے وسیع سینوں میں روپوش ہو چکی ہوتی تھیں.. یہ جو وائلڈ ویسٹ کے زمانوں کا کمرہ تھا جو ہمارا تھا، اس کی قدیم وضع کی کھڑکی کے باہر گلی کے پار ایک لوہار کی دوکان تھی جہاں گھوڑوں کی نعل بندی کی جاتی تھی اور اُس کے برابر میں ایک سیلون.. ایک شراب گھر رات کے اس پہر بھی دکھائی دیتا تھا.. اب اگر ایک ایسے کمرے کے دروازے پر رات گئے کوئی بہت احتیاط سے اور دھیرج سے دستک دیتا تھا یوں کہ اُس میں خوابیدہ کوئی اگر بیدار ہونا چاہے تو ہو جائے.. اور اگر نہ جاگنا چاہے تو اس مدھم دستک سے تجاہل برت لے.. بلکہ جسے تجاہل عارفانہ کہتے ہیں، اُسے برت لے..

"دروازہ مت کھولنا.." کونج نے نیند کی خمار میں سرگوشی کی.. وہ اس شب تھکن سے اس قدر چُور ہو گئی تھی کہ حسب معمول اپنی شب بسری کے لیے آس پاس کے کسی جھیل یا دریا کے سرکنڈوں کی تلاش میں نکلنے کی بجائے میرے کمرے میں ہی بستر کے برابر پَر سمیٹ کر نیند میں چلی گئی تھی "تہذیب سے بچھڑی ہوئی اس وادی کے اس گم گشتہ شہر کی شب میں جانے کون ہے جو دستک دیتا ہے.."

"جو کوئی بھی دستک دیتا ہے، بہت آہستگی سے ایسے کہ وہ مُخل ہونے سے اجتناب کرتا ہے، ہولے ہولے دستک دیتا ہے تو.."

باہر.. نیم اندھیرے میں ایک نہایت شرمندہ ہوتی، خجل اور معذرت کی نگاہوں والی "سوری ٹو ڈسٹرب یُو" کی

گردان کرتی ہوئی پھولے ہوئے پیٹ والی خاتون کھڑی تھی جس نے نہایت تفصیل سے اور بے حیائی سے، جب ہم ڈاسن سٹی میں پہنچ کر اَل ڈیراڈو ہوٹل میں چیک ان کرنے کے لیے اپنے ناموں کا اندراج کرواتے تھے تو اُس نے نہایت فخر سے اپنے غبارہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ.. یہ بچہ دو ماہ میں باہر آ جائے گا..

"کس کا ہے؟"

وادیٔ یُوکان اگر دنیا بھر سے الگ تھلگ اور جدا تھی تو یہاں کے اخلاقی پیمانوں پر بھی تو قدغن نہیں لگائی جا سکتی تھی.. یہی کافی تھا کہ یہ جس کا بھی ہے دو ماہ کے بعد باہر آ جائے گا، یہاں مباحث کی کچھ گنجائش نہ تھی..

"سوری ٹو ڈسٹرب یُو سر.." وہ نظریں جھکائے جیسے التماس کرتی ہو "لیکن باہر ایک منظر ہے جسے آپ دیکھنا چاہیں گے۔ باہر ڈاسن سٹی اور دریائے یُوکان کے آسمان کا جو تاریک گنبد ہے، وہاں اس لمحے شمالی روشنیوں کے رنگین دریا بہاؤ میں ہیں اور دمکتے ہیں۔ یہ عجوبہ ہر شب ظہور میں نہیں آتا.. شمالی روشنیوں سے ہمارا آسمان رنگوں کے بھڑکیلے پن میں ڈوب رہا ہے۔ کیا آپ نے اپنی کھڑکی کے شیشوں کو یکدم رنگ بدلتے نہیں دیکھا.. آپ باہر آ کر انہیں دیکھنا پسند کریں گے؟"

ہم تو گہری نیند میں اتر چکے تھے جب دستک ہوئی۔

اور واقعی کھڑکی کے شیشوں پر بھڑکتی رنگا رنگ روشنیاں لشکارے مار رہی تھیں.. یہاں تک کہ کونج جو مجھے خبردار کر کے کہ دروازہ مت کھولنا پھر سے نیند میں چلی گئی تھی اُس کے سفید پروں پر بھی وہ بھڑکتی زندہ لہریے لیتی رنگین روشنیاں یوں جذب ہوتی تھیں کہ وہ مجھے فیئری میڈو کے نانگا پربت کے دامن میں سانس لیتے قدیمی جنگلوں میں اُڑان کرتے مرغ زریں کی ایک شبیہہ نظر آنے لگی۔

رات ڈھل کر گہری ہو چکی تھی جب ہم اُس چاند نگر میں داخل ہوئے جس کا نام ڈاسن سٹی تھا..

اور یہ تو کوئی نظر کا فریب تھا، آنکھ کا دھوکہ تھا، وقت کی چال تھی کہ ہم جس نگری میں داخل ہوئے وہ آج سے کم از کم ڈیڑھ سو برس پہلے کے زمانوں کی تھی.. شاید یہ طویل مسافتوں کی بدن کو ریزہ ریزہ کرنے والی کٹھنائیاں تھیں، دماغ کا انتشار تھا کہ ہم زمانے کی غار میں واپسی کا سفر اختیار کر گئے اور ماضی کے کسی امریکی وائلڈ ویسٹ کے گاؤں میں پہنچ گئے تھے.. آنکھیں یقین کرنے سے انکاری ہوئی جاتی تھیں، چوڑی دُھول آلود گلیاں جن کے کناروں پر گئے زمانوں کے گڑیا گھر خوشنما قدامت میں اپنے چوبی فن تعمیر کی نزاکت میں ابھی تک قائم تھے.. شاید آج دوپہر ہی یہ جو گھوڑوں کی نعل بندی کرنے والے لوہار کی دوکان ہے اور اُس کے برابر میں جو "گولڈ ڈسٹ بار" یا "سونے کی دُھول کا شراب خانہ" ہے جس نے بعد میں ہمیں اپنے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی میں سے نظر آنا تھا ان کے سامنے گیری کُوپر اپنی دراز قامتی میں بلند ہوتا، اپنا کاؤبوائے ہیٹ بے وجہ ترچھا کرتا، اپنے کولٹ ریوالور پر ہتھیلی پھیلائے کسی نہایت کمینے اور اوچھے بیڈ گائی کو "ڈرا" کرنے پر مائل کرتے ہوئے دعوت مبارزت دیتا تھا کہ کولٹ کی نالی میں سے جو دھواں برآمد ہوا تھا اُس کی بارودی بُو ابھی تک ہوا میں ٹھہری ہوئی تھی.. جان وین ایک نہایت بودا اداکار تھا، صرف اپنے لمبے تڑنگے پن اور لہجے کی لٹک کے باعث کاؤبوائے کے رُوپ میں جچ جاتا تھا.. اور اُن دنوں ہالی وڈ کا کونسا ایسا بڑا اداکار تھا جس نے کاؤبوائے کا کردار ادا نہ کیا ہو..

انتھونی کوئن، ہنری فونڈا، گلین فورڈ، برٹ لنکاسٹر، کلنٹ ایسٹ وڈ.. اور پھر جیمز ڈین جیسا ناقابلِ یقین حد تک سحر انگیز اداکار جو دو چار فلموں کے بعد ہی نوجوانی میں ایک سپورٹس کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا.. یہاں تک کہ مارلن برانڈو بھی اپنی ہدایت کردہ فلم ''ون آئیڈ جیکس'' میں اور یہ کاؤبوائے ہمیشہ بار کاؤنٹر پر سنہری وہسکی کا گلاس دھرے براجمان بیٹھے ہوئے بینڈ گائی کو گردن ٹیڑھی کر کے پوچھتا تھا کہ.. یو آر نیو اراؤنڈ ہیئر.. اور اس طرزِ تخاطب کو مستعار لے کر اسے مصطفی قریشی نے پنجابی میں کیا خوب ہی ڈھالا.. نواں آیاں ایں سوہنیاں.. وہ وائلڈ ویسٹ جو امریکہ میں کب کا معدوم ہو کر خاک ہو چکا تھا، صرف ہالی وڈ کے سٹوڈیوز میں اُس کے گلی کوچے تعمیر ہوتے تھے وہ جوں کا توں لمحۂ موجود میں ڈاسن سٹی تھا جس میں ہم گئی رات داخل ہوئے تھے..

روئے زمین پر نہ ایسے شہر ہوئے اور نہ ایسی بستیاں.. لیکن وہ ڈاسن سٹی کے روپ میں ہوئے..

اگرچہ ابھی الاسکا کے کیسے کیسے شہر اور کیسی کیسی بستیاں میری آنکھوں میں نقش ہونی تھیں لیکن میں ابھی اقرار کر کے انکشاف کرتا ہوں کہ اس تقریباً بارہ ہزار کلومیٹر کی زمینی مسافت کے دوران پھر کبھی ایسی گئے زمانوں میں ڈوبی.. جہاں وقت ٹھہر چکا تھا، ایسی بستی آنکھوں کے نصیب میں نہ آئی.

میں سمجھ بیٹھا تھا کہ وہائٹ ہارس ہی تنہائی کے طلسم کی ایک جادو نگری ہے اور دنیا ترک کر کے مناسب سہولتوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے ایک آئیڈیل پناہ گاہ ہے لیکن یہ ڈاسن سٹی تو تصور کی سحر انگیزی کے سراب سے پرے ایک اور جہان تھا.. وہائٹ ہارس کا گھوڑا اس بستی کے آگے سرنگوں ہوتا تھا کہ وہ اس کے موازنے میں قدرے پُرشور اور جدید تھا.

اس ڈاسن سٹی میں گئی رات داخل ہونا کچھ یوں تھا جیسے پچاس برس پیشتر جب میں رتی گلی کی برفانی معبد جیسی چوٹی کے پار اترا تھا تو.. میں اس کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ میں نے ابن انشاء کو اپنے ایک تصور میں شریک کیا تھا کہ میں پار اترا ہوں تو وہاں گھنی دھند میں مجھے یا ناول کے کردار کو وادی کے نشیب میں موہنجو ڈارو کا شہر.. موجودہ زمانوں میں.. آباد نظر آنے لگا تھا، اس کی گلیوں میں پروہت گھومتے تھے، بڑے تالاب کے پانیوں میں اشنان کرنے کے بعد ایک رقاصہ باہر آتی ہے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اُس کے بازو کنگنوں سے چھنکتے ہیں اور وہ کوہ نورد حیران ہوتا ہے کہ موہنجو ڈارو تو کب کا کھنڈر ہو چکا تو یہ یہاں وادیٔ کاغان کی رتی گلی کے پار ایک ایسی دھند میں ڈوبی ہوئی جھیل کے دامن میں اب بھی آباد کیسے ہو سکتا ہے جس کے پانیوں میں برف کے تودے سفید راج ہنسوں کی مانند تیرتے ہیں اور جب وہ اُس میں داخل ہوتا ہے تو کھلتا ہے کہ موہنجو ڈارو کے باسی آریائی حملہ آوروں کی وحشی یلغار سے فرار ہو کر ادھر اس دور افتادہ گم گشتہ خطے میں آن بسے تھے اور یہاں اُنہوں نے ہو بہو ہی آبائی موہنجو ڈارو تعمیر کر لیا تھا..

ابن انشاء سے ملاقاتیں گنی چنی تھیں کہ اُن کی عمر کی نقدی بہت شتابی سے ختم ہو گئی اور جب کبھی ملاقات ہوتی انہیں شکایت کرتے کہ تارڑ تم نے وہ ناول ابھی تک کیوں نہیں لکھا..

تو ایسے ہی ڈاسن سٹی تھا جو یوکان کی بلندیوں سے اترا ہوں تو اُس کی کل عالم سے پوشیدگی مجھ پر ظاہر ہو گئی ہے.

اس بستی کی گلیاں پُر پیچ نہ تھیں، متوازی اور عمودی شکل میں سیدھی اور براہِ راست تھیں.. البرٹ، ڈیوک، ہارک، کوئن، پرنس، ہارپر اور چرچ نام کی گلیاں۔

پرنس سٹریٹ کی نکڑ پر تیسرے ایونیو میں ''ہوٹل ال ڈے راڈو'' ہمارا منتظر تھا.. وہائٹ ہارس میں قیام کے دوران ہوٹل سے رابطہ کر کے کمرے مخصوص کروا لیے گئے تھے..

اور یہ بھی کیسا دیدہ زیب اور قدامت میں سانس لیتا ہوا ہوٹل تھا.. سفید چوبی گیلریوں والا.. جیسے وائلڈ ویسٹ کی ایک سرائے ہو.. سیلون ہو جس میں کاؤبوائے دندناتے پھرتے ہیں اور مخمور ہو کر سارا فرنیچر توڑ پھوڑ دیتے ہیں.. اور اُس کے باہر ایک بورڈ پر درج تھا کہ یہ ہوٹل سارا سال کھلا رہتا ہے اور اس کا انتظام و انصرام کرنے والے کینیڈین نہیں ہیں، خالص یوکانی لوگ ہیں.. یہ جو نام ''ال ڈے راڈو'' تھا جانے کیوں دل کو چھوتا ہوا قریب اور شناسا سا لگتا تھا. تو ایسا کیوں لگتا تھا..

ال ڈے راڈو.. حقیقت نہیں ایک فسانہ ہے.. محض تصور ہے وجود نہیں.. ایک افسانوی شہر جو موجود نہیں، کوئی چاند نگر جہاں سونے کی افراط تھی.. وادیٔ یوکان.. سونا.. ال ڈے راڈو.. یہ سنہری کڑیاں ملتی جاتی تھیں لیکن ان کے سوا بھی کچھ تھا، پرنس سٹریٹ کی نکڑ پر واقع رات کے اس پہر نیم تاریکی میں ہم اپنا سامان جیپوں سے اتار کر اس ہوٹل میں منتقل کرنے لگے تو اس کے سوا بھی کچھ تھا جو میرے بدن کے اندر سرگوشیاں کرتا تھا کہ تم پہلے بھی یہاں آ چکے ہو.. کس کے ساتھ آ چکے ہو.. اور پھر یکدم سب کچھ آشکار ہو گیا.. کہیں ماضی کے مزاروں پر ایک دِیا روشن ہوا اور ہر سُو چانن ہو گیا.. میں یہاں.. ابن انشاء کے ساتھ آیا تھا.

اُن کے عطا کردہ شعری مجموعے ''چاند نگر'' کے خستہ ہوتے پہلے ورق پر ''مستنصر حسین تارڑ کے لیے.. ابن انشاء 30/9/72'' درج ہے تو یہ وہی چاند نگر ہے جہاں انشاء جی تو نہ پہنچے پر میں پہنچ گیا، وہ لکھتے ہیں:

''ایڈگر ایلن پو کی ایک نظم ہے ال ڈے راڈو.. یعنی شہرِ تمنا.. اگر تمہیں اس شہرِ جادو کی تلاش ہے تو چاند کی پہاڑیوں کے اُدھر سایوں کی وادیٔ طویل میں قدم بڑھائے گھوڑا دوڑاتے آگے ہی آگے بڑھتے جاؤ. شاعر کو بھی ذہنی طور پر سندباد جہازی یا یولیسس ہونا چاہیے یعنی اُس کے سامنے ایک نہ ایک ال ڈے راڈو.. ایک نہ ایک چاند نگر کا ہونا ضروری ہے. سنا ہے اگر جادو کے موہوم شہروں کی طلب میں جولاں رہنے والے دیوانے نہ ہوتے تو یہ زندگی بڑی ہی سپاٹ اور بے رنگ ہوتی.. لیکن نہ مجھے اپنا حُسن کا ال ڈے راڈو ملا ہے نہ زندگی کا شہرِ تمنا.''

یہاں میں اپنے من پسند ابن انشاء سے قدرے اختلاف کرتا ہوں.. ایک شاعر سے کہیں زیادہ ایک نثر نگار کو ذہنی طور پر ایک سندباد جہازی یا یولیسس ہونا چاہیے.. اُس کے سامنے کوئی نہ کوئی ال ڈے راڈو یا ایک نہ ایک چاند نگر ہونا چاہیے، مجھے یاد ہے جب ابن انشاء نے میری حوصلہ افزائی کی خاطر مجھے لکھا تھا کہ تارڑ تمہاری نثر میں شاعری کا لطف ہے تو میں نے بصد ادب احتجاج کیا تھا کہ وہ نثر جس میں شاعری کا لطف ہو نثر نہیں ہوتی ایک رومانوی فریب ہوتی ہے کہ نثر میں آپ حقیقت کی کڑواہٹ سے دامن نہیں چھڑا سکتے.. ابن انشاء کو اپنے حُسن کا ال ڈے راڈو نہ ملا.. اور نہ ہی کوئی شہرِ تمنا یا چاند نگر نصیب ہوا لیکن.. ڈاسن سٹی کی صورت میں وادیٔ یوکان میں خوابیدہ وہ مجھے مل گیا.

''چاند کے تمنائی''

''شہرِ دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی..
بے قرار سودائی..
دل گداز تاریکی..
جاں گداز تنہائی..
شہرِ دل کی گلیوں میں..
بے حساب تنہائی..
بے حجاب تنہائی..
شہرِ دل کی گلیوں میں..

ڈاسن سٹی کی اُس شبِ تاریک میں جاں گداز تنہائی..بے حساب تنہائی..بے حجاب تنہائی،شہرِ دل کی گلیوں میں..
اور پھر ایک موہوم سی دستک ہوتی ہے..سوری ٹُو ڈسٹرب یُو..''

○●○●○

''چاند نگر کے آسمان پر شمالی روشنیوں کے رنگین لہراتے سانپ''

پیدائش کے اولین لمحوں میں جب بچے کی آنکھیں رطوبت سے لتھڑی ہوئی ہوتی ہیں، بند ہوتی ہیں اور شاید پیدائش کے بعد انہیں پونچھا جاتا ہے کسی بھیگے ہوئے کپڑے سے تو جب وہ اس جہانِ رنگ و بُو کو پہلی بار آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے تو جب انہیں اس جہان کے رنگوں کے کیسے کیسے کرشمے دکھائی دیتے ہوں گے.. یا شاید موت کے لمحوں میں کچھ ایسے رنگ جانے اُسے اس جہان کے سامنے آتے ہوں گے جو حیات میں کبھی دکھائی نہ دیتے تھے..تو پیدائش یا موت ہمیں جو رنگ دکھاتی ہے وہ آنکھوں کے سامنے آتے ہوں گے جو حیات میں کبھی دکھائی نہ دیتے تھے..پیدائش پر پہلی بار آنکھیں کھول کر جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ ظاہر ہے یاد نہیں آ سکتا اور موت کے لمحوں میں نہیں آ سکتے..بیان میں اگر کچھ عجیب رنگ نظروں میں اُترتے ہیں تو انہیں بیان کرنے کے لیے ایک بھی سانس نہیں ہوتا.. یوں ان دونوں کیفیتوں میں دکھائی دینے والے رنگ آج تک کسی بیانیے میں نہیں آ سکے..

ڈاسن سٹی کے چاند نگر کی شبِ دیجور میں..ایک تاریک دُھول آلود گلی میں مَیں منہ اٹھائے اور وہ چونچ بلند کیے اس ڈاسن سٹی پر جھکے آسمان کو تکتے تھے جو ابھی تاریکی میں گھپ اندھیر ہے اور ابھی کوئی سامری ایسا طلسم پھونکتا ہے کہ گھٹا ٹوپ سیاہی میں سے عجیب رنگوں کی روشنیاں کوندنے لگتی ہیں، ایسے رنگ جو آج تک کسی بیانیے میں نہیں آ سکے..یہ شمالی روشنیاں رنگین لہریے سانپوں کی مانند آسمان پر کسمساتی، بل کھاتی یوں دمکتی ہیں کہ آنکھیں اُن رنگوں کی لشک کی تاب نہیں لا سکتیں..پر کھلی رہتی ہیں، جھپک جانے کا خدشہ مول نہیں لے سکتیں کہ کہیں یہ رنگ رنگ کا دمکتا نُور اوجھل نہ ہو جائے..

آسمان کے وسیع تاریک کینوس کو ایسے الوہی اور ان دیکھے رنگوں سے وہی پینٹ کر سکتا تھا جو کہ سب سے بڑا مصور تھا..وہ اپنی کائناتوں میں بُرش ڈبو کر اُسے آسمانوں کے کینوس پر رکھ کر لاپرواہی سے ایسی سٹروک لگاتا تھا کہ وہ زندہ ہو کر دمکنے اور کوندنے لگتی تھی..وہ کہتا تھا کہ تو ہو جا..اور وہ ہو جاتا تھا..اُس نے انسانوں کو رنگ عطا کرتے ہوئے خاصی کنجوسی کا مظاہرہ کیا تھا..جو الوہی اور آسمانی رنگ تھے اُنہیں اُن پر ظاہر نہ کیا تھا، اُنہیں سنبھال رکھا تھا تاکہ وہ انہیں ڈاسن سٹی کی اس شب دیجور میں اس کے آسمان پر برت سکے اور ایک انسان اور ایک کُونج کو یوں متحیر کر دے کہ اگر اُن میں ایمان کی کچھ کمی تھی تو اب یہ رنگوں کے معجزے دیکھ کر..ایمان لے ہی آئیں..

یہ نصیب کی کرامت تھی کہ وہ صرف ہمارے لیے آسمان پر رنگوں کی غیر مرئی اور غافل تصویریں پینٹ کر رہا تھا.. یہ رنگ حضرت انسان سے پوشیدہ کر کے اُس نے سخت خِسّت کا مظاہرہ کیا تھا..ایسے رنگ جو کسی پکاسو..چغتائی..صادقین..گل جی یا سعید اختر کے گمان میں بھی نہ آ سکتے تھے..

وہ مصور تو ایک رنگریز تھا... تاریکی کی چُنری کو گمان سے بھی پرے کے عجوبہ رنگوں میں رنگتا تھا.. اور جو یہ رنگ چُنری اوڑھتی تو اپنی سب سکھیوں میں ممتاز ہوتی اِتراتی پھرتی اور جس من چاہے پر نظر ڈالتی اُسے اسیر کر لیتی.. یہ رنگا رنگ اوڑھنیاں ڈاسن سٹی کے آسمان پر اُڑتی پھرتی تھیں..

میں نے ایک لمحے کے لیے آسمان سے نظریں نیچی کر کے گونج کی آنکھوں کو دیکھا تو اُن کی سحر سیاہی میں بھی رنگ رنگ کی چُنریاں اُڑتی پھرتی تھیں.. اُس نے میری جانب نہیں دیکھا، اگر دیکھتی تو شاید اُسے میری آنکھوں میں بھی رنگوں کی کچھ ایسی آبشاریں نظر آتیں کہ وہ اپنا گونج ہونا بھلا کر اپنے ہونٹ اُن پر رکھ دیتی اور یوں اُس کے ہونٹ بھی رنگے جاتے..

اُس چاندنگر کی شب میں جاں گداز تنہائی، بے حساب تنہائی، بے حجاب تنہائی اور آسمانوں پر رنگوں کی ایک رام لیلا کھیلی جا رہی ہے.. ایک ناٹک رچایا جا رہا ہے..

میرے اصرار کرنے پر اونگھتی ہوئی گونج بھی 'ہوٹل ال ڈے راڈو' کے چوبی کمرے سے باہر نکل کر گلی میں چلی آئی تھی..

اور وہ پھولے ہوئے پیٹ والی خاتون ہمیں شمالی روشنیوں کے ظہور کی خبر کر کے کب کی واپس جا چکی تھی۔ اور ہم دونوں ہونقوں کی مانند مُنہ اٹھائے آسمان پر نمودار ہونے والی حیرت انگیز روشنیوں کو تکتے تھے اور یقین نہ کرتے تھے.. رات کے اس پہر ہم یہ یقین کر سکتے تھے کہ ڈاسن سٹی کی ویران بستی میں صرف ہم دونوں ہیں جو یوں آسمان کو تکتے ہیں.. ہمارے سوا اور کوئی نہ تھا..

یہ شمالی روشنیاں کیا ہیں؟ اس کے بارے میں بہت سی تاویلیں ہیں، سائنسی دلائل ہیں اور کچھ توہمات بھی ہیں.. یعنی آرکٹک سرکل کے نواح میں جو آسمان ہیں اُن کے تلے بے شک پوری دنیا کی مانند رات ڈیرے ڈالتی ہے لیکن کہیں دور دراز کے برف زاروں میں ابھی دن ہے، سورج کی زرد کرنیں بکھرتی ہیں تو یہ اُن کرنوں کا کرشمہ ہے کہ وہ تاریکی کی چادر پر.. وہ چادر جو آسمانوں پر بچھی ہے اُس پر اُترتی ہیں اور یوں وہاں عجوبہ رنگ تخلیق ہوتے ہیں اور وہ لہریے سانپوں کی مانند اُس آسمان پر سرکنے اور کوندنے لگتے ہیں.. وہ جو مولانا روم کے استفسار پر شمس تبریز نے کہا تھا کہ یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں تو ڈاسن سٹی کی رات میں جو کچھ آسمان کی سٹیج پر رنگوں کی صورت لہراتا، دمکتا، حرکت کرتا تھا.. سر سراتا دکھائی دیتا تھا یہ وہ تھا جس کی مجھے بھی خبر نہ تھی..

اور اگر میں باہر کی دنیا کو.. اس معجزے کی خبر کرتا ہوں اور وہ یقین نہیں کرتے تو پھر اُن کو بھی کچھ خبر نہیں... انہیں معاف کر دو کہ یہ نہیں جانتے..

ڈاسن سٹی کی دیگر فراخ گلیوں کی مانند پرنس سٹریٹ بھی مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی.. تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر وجود میں آنے والا یہ چاندنگر جوں کا توں موجود رات کے اس پہر ایک اندھیر نگر تھا، نہ کوئی لیمپ پوسٹ، نہ کوئی لالٹین اور نہ ہی کوئی دِیا کسی منڈیر پر جلتا ہوا.. سونے کے اس شہر میں تاریکی بھی ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی.. اور پھر وہ تاریکی بھی ہاتھ بڑھاتے ٹٹولتے تھم جاتی تھی جب اُسے ڈاسن سٹی پر تنے آسمانی گنبد کی سیاہی میں سے یکدم الوہی رنگوں کا ایک کوندا لپکتا نظر آ جاتا تھا اور اُسے ایک لحظہ کے لیے راستہ نظر آنے لگتا تھا.. جیسے بجلی چمکے تو پل بھر کے لیے راستہ سجھائی دے جاتا ہے..

میں اُن رنگوں کی درست شناخت پر قادر نہیں ہوں.. بڑے مصور نے جان بوجھ کر انہیں آج تک میری آنکھوں سے پوشیدہ کر رکھا تھا تو میں کیسے انہیں پہچان سکتا تھا.. وہ یکدم افق کے کسی کالے سیاہ کونے میں سے یکدم پھوٹ کر نمودار ہوتے، ایک حدت میں آئی ہوئی عورت کے بدن کی مانند کسمساتے، بے چین اور بے اختیار ہوتے افق کے دوسرے سرے تک دہکتے چلے جاتے..

کبھی وہ سب رنگ رنگیلے سرکتے سانپ ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر آسمان کے سیاہ بستر پر لوٹنے لگتے اور کبھی وہ رنگین بادلوں کی مانند آپس میں مدغم ہو کر پھیلنے لگتے..

انہیں کسی کروٹ چین نہ تھا..

ابھی ایک دوسرے سے لپٹے جاتے ہیں، وصال کے نشے میں مدہوش ہیں اور ابھی جُدا ہوتے ہیں اور اپنے اپنے رنگ راستوں پر اُڈنے لگتے ہیں.. چاندنگر کی اُس سیاہ شب میں جس میں تاریکی بھی نابینا ہو کر بھٹکتی پھرتی تھی، جامنی اور سنہری رنگ کی آمیزش میں گھلی ہوئی ایک ہلکی روشنی یوں اتری کہ اُس شہر کے قدیم بام و در، گلی کوچے سارے اُس میں رنگے گئے.. اور جامنی رنگ اُن پر غالب تھا.. جیسے رسیلے پکے ہوئے جامن پہلی برسات کی بوچھاڑ کی تاب نہ لا کر ڈالیوں سے ٹپ ٹپ گھاس پر گرتے ہیں تو اُس گھاس کے تنکے بھی جامنی ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں گھاس میں سے چُننے والی انگلیوں کے پوٹوں پر بھی جامنی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ ایسے اُن شمالی روشنیوں کی جامنی لہر اُترنے سے اُس چاندنگر کی ہر شے رنگی گئی.. لیکن صرف ایک لحظہ کے لیے.. آنکھوں کی جھپک کے دورانیے جتنے ایک پل کے لیے.. اور تو اور گونج کی سفیدی پر بھی وہ جامنی اوڑھنی اثر انداز ہو رہی تھی... صرف اُس کا بدن ہی نہیں اُس کی آنکھیں بھی جامنوں سے لبریز نظر آ رہی تھیں اور اُن میں سے کسی بھی لمحے رس ٹپک سکتا تھا اور وہ اپنی خوابیدگی کی خواہش فراموش کرتی مجھے اپنی اُن آنکھوں سے تکتی جو کہ سیاہی سے جامنی میں اتر چکی تھیں گویا کہہ رہی تھی "مستنصر تم مجھے دیکھتے متعجب ہوتے حیرانیوں میں ڈوبتے ہو.. اگر تمہارے سامنے ایک آئینہ ہوتا تو تم اپنے آپ کو پہچان نہ پاتے کہ تمہارا کلر بھی پرپل ہو گیا ہے۔ صرف تمہارا نہیں بلکہ تمہارے شب کے نیلے لباس قمیض شلوار کا بھی.. اور تمہاری آنکھیں وہ بھی کلر پرپل..."

اور اُسی دم اُس آنکھ جھپکنے کے بیچ جو ایک پل ہوتا ہے اُس نے دم توڑ دیا اور وہ جامنی روشنی یکسر بجھ گئی اور ہمارے آس پاس پھر سے اندھیرے کے خاموش اور سیاہ پَر اترنے لگے..

ابھی ہم اُس اندھیرے کے عادی بھی نہ ہوئے تھے کہ شمالی روشنیوں نے آسمان پر پھر سے ایک اور رنگ کا الاؤ بھڑکا دیا.. البتہ اس رنگ کو میں نے بخوبی شناخت کر لیا.. ہرات کی اُس سویر کا رنگ جب میں ایک جرمن سیاح کے ہمراہ تانگہ رائیڈ کے بعد شہر سے باہر ایک ٹیلے پر براجمان افق پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اور وہاں سے طلوع کی پہلی کرنیں سنہرے تیروں کی مانند نکلی تھیں اور ہمارے سروں پر سے پرواز کرتی نکل گئی تھیں.. شیراز کے گلابوں کی رنگت سارے میں پھیل گئی تھی.. اور وہی رنگت گلاب کی ڈاسن سٹی کے کوچہ و بازار میں اور اُس کے قدیم چوبی مکانوں اور عمارتوں کو.. پس منظر میں بلند ہوتے خزاں آلود اشجار کو، پتے پتے بُوٹے بُوٹے کو گلابی گہنوں سے لاد رہی تھی.. اگرچہ یہ گلاب تماشا بھی صرف ایک پل کا

تھا..ٹونج بھی ایک دیومالائی پرندے کی مانند گلاب ہوگئی..

اور یہ پل بھی پل بھر میں بیت گیا..ڈاسن سٹی کے کوچہ و بازار اور اشجار یکدم اپنے گلابی گہنے کھو بیٹھے..ایک بیوہ کی مانند اُن کے زیور اتار دیے گئے..

ہم دونوں بھٹکے ہوئے غزالوں کی مانند حیران کھڑے تھے کہ اب کدھر جائیں۔ ہوا میں ایک خنکی سرد کروٹ بدلتی میرے بدن پر چبھتی خبر کرتی تھی کہ..الاسکا یہیں کہیں آس پاس ہے..اور تم نے کل سویرے ''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ'' پر سفر کرتے ہوئے امریکی سرحد عبور کر کے یوکان کے بعد ایک اور ویران سلطنت میں داخل ہونا ہے..اور اس روڈ کی بہت دھوم تھی کہ اس کی دل فریبی ایسی تھی کہ سیاحوں کے دل رک جاتے تھے..جیسے وہاں بھی ایجئین سمندر کے جادوئی جزیرے کی وہ سائرنز آباد تھیں، وہ جادوگرنیاں جو اپنے حسن کے طلسم سے ملاحوں کو اسیر کر کے، اُنہیں اپنے گیتوں سے مدہوش کر کے مار ڈالتی تھیں...لیکن ابھی کل بہت دور تھا، کل کے گمنام سیارے کی روشنی ابھی سفر میں تھی..کل ہوگا تو دیکھا جائے گا..ابھی تو ہم ڈاسن سٹی کے آسمان پر لہراتی انوکھی روشنیوں کی آبشار تلے بھیگ رہے تھے..

آسمان کی سٹیج پر رنگ رنگیلے اداکار داخل ہوتے تھے..تماشائیوں پر اپنے اپنے رنگ کی پھوار ڈالتے اُنہیں بھگو کر اگلے پل میں سٹیج کو خالی کر دیتے تھے۔

میرے سامنے ایک آئینہ ہے..

بے شک ایک عارضی فریب کا ایک پل کے دھوکے کا ہے پر میں دیکھتا جا رہا ہوں کہ اُس میں جو چہرہ عکس ہوتا ہے، اُس پر زوال اور پژمردگی کے کچھ آثار نہیں..وہ جو بجھی بجھی سی آنکھیں تھیں غزالوں کی مانند مدھ بھری اور سیاہ بحر کی ہوگئی ہیں اور وہ چھدرے ہو چکے بے جان بال گھنے ہوتے یوں سنہری ہو رہے تھے جیسے میں ابھی ابھی ماؤنٹ اولمپس سے اُترتا ایک سورج دیوتا ذیوس ہوں..

ابھی تو آئینے میں یہ عکس تھا اور اُس سے اگلے لمحے کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عارضی نوخیزی اور سنہرا پن رخصت ہوا اور آنکھیں پھر سے بجھنے لگیں اور زوال کی جھریوں نے پھر سے میرے چہرے پر اپنے تانے بانے بُن دیے..

یوں بہت سے انوکھے، دھیمے، کبھی نہ دیکھے ہوئے، الوہی آسمانی رنگ اُس چاندنگر کی شب میں ہمارے چہروں پر اُترے..لحظہ بھر کے لیے اور پھر زائل ہوگئے..

اب ذرا وقفے آنے لگے..

تاریکی جو ہمارا ہاتھ تھامے ہمارے سہارے اُس شب کو سہارتی تھی، بھٹک جانے کے خوف میں مبتلا رہی..

کوئی ایک رنگ آسمان میں سے پھوٹتا..ہمیں اور ڈاسن سٹی کے درودیوار کو رنگتا..رخصت ہوتا تو پھر ہم منہ اٹھائے منتظر رہتے کہ ابھی ایک اور رنگوں کی پچکاری پھوار ڈالے گی لیکن تاریکی قائم رہتی۔ بہت دیر بعد کوئی اور لہریے دار سانپ آسمان پر کوندتا..

''مستنصر..'' وہ بدستور چونچ اٹھائے آسمان کو تکتی تھی۔ ''یہ جو عجوبہ رنگ رنگیلی شمال روشنیاں ڈاسن سٹی کے آسمان پر سے اتری ہیں تو وہ مجھ میں کچھ ایسی سرایت کی ہیں کہ مجھے محسوس ہوا ہے کہ ان کی تاثیر سے شاید میری جُون بدل جائے۔ میں ایک پرندہ نہ رہوں، ایک انسان میں بدل جاؤں..

ٹونج واقعی وادیٔ یوکان میں جتنی گھاس تھی، چر چکی تھی۔

لیکن میں قدرے خوفزدہ ضرور ہوا..کہ ان شمالی روشنیوں کی سحرانگیز بوچھاڑ سے اگر ٹونج سچ مچ ایک انسان..ایک لڑکی میں بدل گئی تو پھر کیا ہوگا، اگر اُس میں ایک تبدیلیٔ ہیئت جنم لیتی ہے..اُس کی شکل صورت میں تغیر رونما ہو جاتا ہے تو پھر کیا ہوگا..جیسے فرانز کافکا کے افسانے ''تبدیلیٔ ہیئت'' کا ایک اچھا بھلا کردار ایک نارمل انسان صبح سویرے بیدار ہوتا ہے تو وہ ایک کوڑے میں بدل چکا ہوتا ہے تو عین ممکن ہے کہ یہ ٹونج بھی ان رنگ رنگ کی شعاعوں کی تاثیر سے ٹونج نہ رہے..ایک انسان ہو جائے..

اچھا یہ خدشہ یک طرفہ نہ تھا، یہ بھی تو ممکنات میں سے تھا کہ ان شمالی روشنیوں کا میرے بدن پر کچھ اثر ایسا ہوا کہ میں انسان کی بجائے ایک پرندے کی ہیئت میں بدل جاؤں..اور اس خدشے کو تقویت میری تحریریں دیتی تھیں جن میں ہر نوع و اقسام کے..ظاہر کے بھی..اور باطن کے بھی حقیقی بھی اور دیومالائی بھی پرندے پرواز کرتے تھے..اور اُن سے میں بیشتر فریدالدین عطار کے پنکھ پکھیرو..اور اُن میں ایک میرا ''پکھیرو''..ایک ''فاختہ''..''ڈاکیا اور جولاہا'' کے بابا کی سفید داڑھی میں سے نمودار ہونے والے چھوٹے چھوٹے رنگین پرندے اور پھر..وہ چار مرغابیاں جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا..چنانچہ اگر ٹونج ان شمالی روشنیوں کے رنگین جادو کے زیرِ اثر ایک انسان ہو سکتی تھی تو اتنا ہی امکان تھا کہ میں ایک پرندہ ہو جاتا..

لیکن یہ سب کے سب خدشے باطل ثابت ہوئے..

ٹونج..ٹونج رہی اور میں..میں رہا..

اور پھر یوں ہوا کہ ڈاسن سٹی پر تنے نیلگوں خیمہ آسمان پر سرکتے سورنگ سوہنے سانپ..رنگوں کے جوار بھاٹا..آبشاریں اور جھرنے، کوندتے لہریے، یکدم تمام ہوئے، پردہ گر گیا، ناٹک تمام ہوا، تماشا ختم ہوا..آسمان تاریک اور چپ رہا..اُس میں سے کوئی پھلجھڑی چھوٹی اور نہ کوئی رنگوں کا جگنو ٹمٹمایا..اُس آسمان کے صحرا میں قلانچیں بھرتے رنگ رنگ کے جتنے غزال تھے، رخصت ہوگئے۔ معجزے تادیر نہیں رہتے..طُور کی جھاڑی تادیر روشن نہیں رہتی..یوسف کو خریدنے والی بڑھیا بھی تھک ہار جاتی ہے..اور نہ ہی کوئی بیمار ابد تک دمِ عیسیٰ کا منتظر رہتا ہے..

نہ پری رہی، نہ جنوں رہا..

شمالی روشنیوں کا آخری رنگ بھی اپنی چھب دکھلا کر شب کی تاریکی میں گُم ہوگیا..

یہ سرائے ہے، یہاں کس کا ٹھکانہ ڈھونڈو..
یاں تو آتے ہیں مسافر، سو چلے جاتے ہیں..

○●○●○

''دریائے یُوکان کے پار..سیّاں جی اتریں گے پار''

ڈاسن سٹی کا چاندنگر دن کی روشنی میں بھی اس دنیا سے باہر کا کوئی تصوراتی قصبہ لگتا تھا..

ہم دیر تک سوتے رہے..

قصبے کی چوڑی اور تقریباً کچی گلیوں میں کہیں کہیں جہاں کہیں نشیب تھا، وہاں پانی کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ تھے جو اس امر کی غمازی کرتے تھے کہ شمالی روشنیوں کے مدھم ہو کر روپوش ہو جانے کے بعد آسمان برسا تھا.. مینہ اُترا تھا اگرچہ ہم بے سُدھ سوتے رہے تھے اور جب جاگے تو کھڑکی کے سامنے جو آہن گر کی سُرخ دوکان تھی وہ ہلکی روشنی میں نمایاں ہو رہی تھی.. بارش سے اُس کا سُرخ پینٹ دُھل کر نکھر گیا تھا..

ہرے اور پیلے پڑ چکے جنگل جو ڈاسن سٹی کے گھروندوں پر اُنڈے ہوئے تھے اُن کے اندر کہیں کہیں بادلوں کی سفیدی کے اوجھل ننھے مُنے فرشتے گھومتے پھرتے تھے۔ امکان تھا کہ یہ سب گھر گھروندے کل شب تک کو سادہ تھے اور پھر جب شمالی روشنیوں کا ظہور ہوا تو ہر ایک نے ان میں سے اپنے من پسند رنگ کا انتخاب کیا اور اپنے آپ کو رنگ لیا.. ایک گھر کسی نیلی روشنی میں ڈبکی لگا کر آیا تھا تو کوئی ایک گلاب رنگت اختیار کر چکا تھا اور پھر ایک گھر جامن کے رنگ کا ہوا تھا اور اُس پر ایک یونین جیک لہرا رہا تھا.. افق پر جو بھیگ چکے شجروں کا ذخیرہ تھا اُس میں بھی بادلوں کی نرم کپاس سفیدی آوارہ خرام ہوتی تھی، اُن کے دامن میں اُگتے پتوں اور بوٹوں میں یوں الجھتی پھرتی تھی جیسے مرغ چمن کے پاؤں بہار کے گل بوٹوں میں الجھتے ہیں۔

سامان بندھ چکا، جیپ میں پیک ہو چکا، کوچ کا لمحہ آیا تو میں نے گونج سے فرمائش کی کہ وہ ''اِل ڈے راڈو ہوٹل'' کے بورڈ تلے جو سفید گیلری تھی، وہاں میری ایک تصویر اُتار دے..اور یہ تصویر اس لمحۂ موجود میں میری سٹڈی میں میرے سفروں کی چند یادگار تصویروں کے عین نیچے آویزاں ہے اور میں بہت کم اُس پر نگاہ کرتا ہوں..صرف تب نگاہ کرتا ہوں جب میں لاکھ جتن کرنے کے باوجود تصور نہیں کر پاتا کہ میں کبھی کسی چاندنگر کی ایک ایسی شب میں تھا جس کے آسمان پر شمالی روشنیوں کے رنگ رنگیلے لشکیلے سانپ لہراتے تھے اور وہ میرے وجود کی پژمردہ سکرین پر عکس در عکس ہوتے چلے جاتے تھے..تب میں اس تصویر پر نگاہ کرتا ہوں، سفید چوبی گیلری پر بازو آرام کیے..''اِل ڈے راڈو ہوٹل'' کے سرخ بورڈ تلے میں ایک ایسے کاؤبوائے کی مانند رنجیدہ اور پُر افسوس کھڑا ہوں جو اس چاندنگر سے جدا نہیں ہونا چاہتا، جدائی کے ملال میں افسردہ ہے، گونج یقیناً شب بھر بارش میں نہاتی پھری تھی، اُجلی اُجلی اور نکھری ہوئی تھی۔

اُس کے سفید براق پروں پر پچھلی شب کی شمالی روشنیوں کا کوئی ایک دھبّہ بھی موجود نہ تھا..وہ اتنی گوری ہو رہی تھی جیسے..گوری چھپڑ وِچوں نہا کے نکلی تو سُلفے دی لاٹ ورگی..یعنی جب گوری جوہڑ میں سے نہا کر نکلی تو اُس کا گورا بدن ایسا تھا جیسے سُلفے کی ایک لاٹ ہو..اس پنجابی بولی کی رمزیت سے صرف وہی لوگ آگاہ ہو سکتے ہیں جنہوں نے کبھی سُلفے کی لاٹ دیکھی ہو..جب ایک چھوٹی سی چلم میں چانڈو بھر کر اُس پر آگ رکھ کر اُسے مُٹھی میں بھینچ کر ایک بے سُدھ کر دینے والا کش لگایا جاتا ہے تو اُس چلم میں سے ایک سرمئی تیز دھار کا شعلہ ایک انار کی مانند چھوٹتا ہے جو اپنی آتشیں سفیدی میں لپکتا بلند ہوتا ہے..
تو آج سویر گونج بھی ایک ایسی ہی گوری لگ رہی تھی..

ہم پرنس سٹریٹ کے نم آلود سنگریزوں پر اپنی جیپ کے ٹائروں کے گھماؤ کے نشان ثبت کرتے دریائے یُوکان کے کنارے آ گئے اور وہاں ایک مختصر آرائشی قطعے میں یُوکان اور کلون ڈائک دریاؤں میں سے سونا چھاننے والے ایک آوارہ گرد کا یادگاری مجسمہ آویزاں تھا..

یُوکان یوں تو ایک نہایت مختصر اور مدھم بہاؤ والا شریف النفس دریا لگ رہا تھا. جس کسی نے کبھی دریائے سندھ کو سکردو روڈ کے برابر میں چٹانوں سے ٹکراتے چنگھاڑتے دیکھا یا سنا ہے یا ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک وسیع پھیلاؤ میں دیکھا ہو.. یا پھر دریائے برالڈو کی وحشت پر نظر کی ہو تو پھر یُوکان ایسے دریا موازنے میں محض معصوم سی ندیاں لگتے ہیں..لیکن موازنہ کیا کرنا کہ چہ نسبت..

ہمیں ''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ'' پر سفر کرنے سے پیشتر یُوکان کے پار جانا تھا..اور یُوکان ایسی ندی نہ تھا جس سے بصد ادب گزارش کی جاتی کہ میرے سیّاں جی اُتریں گے پار ندیا دھیرے بہو..کہ یہ ندیا تو پہلے سے ہی دھیرے تو کیا، بہتی ہی کم کم دکھائی دیتی تھی..

اور پار اُترنے کے لیے ایک نہایت ابتدائی شکل کا، گھامڑ سا سٹیمر میسّر تھا..اس قدر بوسیدہ کہ اُس کے اُدھڑے ہوئے تختوں میں سے دریا کے پانی نظر آتے تھے..وہ وہاں لنگر انداز، ڈاسن سٹی میں سے نکل کر الاسکا جانے والے مسافروں کو ڈھونے کے لیے نہایت بے زار شکل میں کھڑا تھا..اور جانے کتنی دیر سے کھڑا تھا کہ پار جانے والے مسافر ذرا کم کم تھے۔ ہمارے سیاحتی قافلے کو دیکھ کر اس کی ناتوانی میں کچھ جان آئی اور اُس نے اپنا گھگھیایا ہوا بھونپو زور زور سے بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ وہ تو قطعی طور پر مایوس ہو چکا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا اور یکدم کوئی نہیں کتنے ہی آ گئے تھے..

سٹیمر کی روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی..

گونج کو ایک جیپ کی قید و بند کی عادت ہی نہ تھی، اُسے ایسے آہنی گھونسلے میں رہنے کا کچھ تجربہ نہ تھا۔ چنانچہ سفر کے دوران جب کبھی جیپ رُکتی تو وہ فوراً پھڑ پھڑاتی ہوئی باہر کھلی فضا میں اُتر جاتی اور پَر پھیلا کر اتراتی پھرتی
اپنا تھکاوٹ اتار دی

مٹکتی پھرتی تھی..

اب وہ یُوکان کے گدلے پانیوں کے کناروں پر

وہاں ہلکی بارش میں بھیگتا ایک بے چارہ آوارہ گرد کاندھے پر رُک سیک ڈالے بے آسرا کھڑا تھا جسے میں نے جیپ کی عافیت میں بیٹھے ہوئے دیکھا کہ وہ گونج کے قریب ہو رہا ہے اور اُس سے گفتگو کرنے لگا ہے اور وہ گونج بھی ہمدردی سے بڑھ کر قدرے اشتیاق سے اُس کے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔ پھر وہ گردن جھٹکتی ہوئی میرے پاس آ گئی "یہ ایک آوارہ گرد چچ ہائکر ہے.. جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں اور گھر سے الاسکا دیکھنے کے چاؤ میں نکلا ہے.. تو اُس نے مجھ سے پوچھا ہے کہ کیا ہم اُسے لفٹ دے سکتے ہیں.. اپنے ساتھ بٹھا سکتے ہیں تو میں نے اُس سے کہا ہے کہ میں اپنے ہم سفر سے دریافت کرتی ہوں.. ہم اسے اپنے ساتھ بٹھا لیں؟"

مجھے نہیں معلوم کہ میرے دماغ میں حسد کا جو فیوز تھا وہ یکدم بھک سے کیوں اُڑ گیا "نہیں.. ہرگز نہیں۔"

"تو نہ سہی.." وہ چپکے سے میرے پہلو میں آ بیٹھی۔

"گونج.." جانے یہ ردِعمل کیوں ظہور پذیر ہوا تھا.. یہ طیش میں آنے کا تو کوئی جواز نہ تھا.. "تم ایک عجیب احمق پرندہ ہو.. تمہیں تو فوری طور پر صاف انکار کر دینا چاہیے تھا کہ ہم دونوں تمہیں کیسے اپنے ذاتی سفر میں داخل کر لیں.. تم نے یہ وعدہ کیوں کیا کہ میں اپنے ہم سفر سے دریافت کرتی ہوں.. کیا ہم اُس کی موجودگی میں اطمینان سے اپنی باتیں کر سکتے تھے، آرام دہ محسوس کر سکتے تھے؟"

"نہ سہی.." مجھے محسوس ہوا کہ اُس کے لہجے میں ایک خفگی سی ہے۔ اگرچہ وہ اسے پوشیدہ رکھنے کی سعی کرتی ہے..

"لیکن تم نے اُس سے کیوں وعدہ کیا تھا کہ..."

وہ چونچ بند کیے چپ رہی۔

جانے وہ بزرگ سٹیمر یُوکان کے عین درمیان میں جا کر ڈوبا کیوں نہیں، ہمیں پار لے گیا... ادھر سوار ہوئے اور اُدھر اُتر رہے تھے کہ یُوکان، چناب نہ تھا۔

کناروں سے یکدم اوپر اُٹھتی ایک چڑھائی تھی..

گونج ایک مسلسل خاموشی میں تھی اور مجھے اُلجھن ہو رہی تھی اور میں ایک بار پھر طیش میں اُبل پڑا "تم مجھ سے صرف اس لیے خفا ہو کہ میں نے اُس دو ٹکے کے چچ ہائکر آوارہ گرد کو اپنے ساتھ بٹھانے سے انکار کر دیا تھا.. مجھے خدشہ ہے کہ تم اس کی جانب راغب ہو رہی تھیں اس لیے تم نے چونچ سُجا رکھی ہے.. تم چاہتی تھیں کہ وہ ہمارا شریکِ سفر ہو جائے.."

گونج نے اپنی چونچ سختی سے بھینچی رکھی اور اُس کی خاموشی میرا خون کھولاتی تھی اور بالآخر وہ بولی "تم اپنا آوارہ گرد ماضی فراموش کر چکے ہو.. تم بھول گئے ہو مستنصر.. تم بھی گزر چکے زمانوں میں کاندھوں پر رُک سیک اٹھائے نگری نگری دربدر ہوتے تھے۔ دیس دیس کی خاک چھانتے تھے.. نہایت مسکین شکل بنائے شاہراہوں پر کھڑے انگوٹھا بلند کر کے لفٹ کی بھیک مانگا کرتے تھے.. اور تم پر اجنبی دیسوں کے لوگوں نے مہربانیاں کیں، اپنی کاریں، ٹرک اور ٹریلر تمہارے لیے روکے اور اُن کے طفیل تم نگر نگر گھومے.. اور آج ایک چاندی رنگ کی جیپ میں سوار تم الاسکا

ماضی جیسے ایک آوارہ گرد کو حقیر جانتے ہو۔ انسان غرض مند ہوتا ہے تو کیسا مسکین اور عاجز ہو جاتا ہے اور جب کوئی اور غرض مند اُس کے سامنے آ کر لفٹ کا سوال دراز کرتا ہے تو وہ کیسا بے دید ہو جاتا ہے، کچھ لحاظ نہیں کرتا۔"

اب میں ایک خجل اور شرمندہ جیپ میں چلا گیا، اپنے آپ کو ملامت کرتا کچھ بھی نہ بولا کہ میری جتنی بھی یادگار اور دل میں قائم رہنے والی آوارہ گردیاں تھیں وہ اُن مہربان لوگوں کی مرہونِ منت تھیں جنھوں نے مجھے شاہراہوں کے کناروں سے اٹھایا.. اپنے برابر میں بٹھایا اور اس دوران کبھی کھلایا پلایا اور کبھی اپنے گھر میں ٹھہرایا..

میں واقعی احسان فراموش اور بے دید ہو چکا تھا.. وہ آوارہ گرد چچ ہائکر دراصل میرے ماضی کا ایک روپ تھا اور میں نے اپنے آپ کو ہی لفٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

مسلسل چڑھائی کے بعد جب ہماری جیپ کی ناک سیدھی ہو کر آسمان کا رُخ کرتی تھی، ہم ایک بلند سطح پر آ گئے..

○●○●○

''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ پر خزاں کے معجزوں کا نزول''

اور تب.. آنکھوں کے سامنے ایک المیہ ظہور پذیر ہوا۔ ایک سوگواری نے، ایک شدید بے بسی، لاچارگی اور کم مائیگی اور حرفوں کی موت نے جنم لیا.. کہ جونہی ہم دریائے یوکان سے بلند ہو کر، کچھ چڑھائی طے کر کے ایک مقام پر آئے ہیں تو آسمان وسیع ہوتا چلا گیا، نیم سرد ہوائیں ہمارے بدن سے مس ہوتیں بلا روک ٹوک دور افق تک شائیں شائیں کرتی چلی گئیں تو ایک منظر کھلا.. مجھے تو چپ لگ گئی.. ایسا منظر تو نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا.. اور نہ زندگی بھر دیکھنا تھا.. پچھلی شب کی شمالی روشنیوں کے لہریئے دمکتے رنگوں کے معجزے کے بعد ہم توقع کر ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اور منظر بھی کھلے گا اور اگلی سویر ہی کھلے گا.. کہ اگر دم عیسیٰ ایک مُردے کو زندہ کر دیتا ہے تو بھلا اس کے بعد آپ اس سے بڑھ کر کسی اور معجزے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں.. لیکن وہ جو منظروں کے معجزے تخلیق کرتا ہے، اُنہیں مصور کرتا ہے، اوپر اپنے سنگھاسن پر براجمان تمہاری اس حماقت پر مسکراتا ہے کہ بس شمالی روشنیوں کے بعد اور کوئی معجزہ نہ ہوگا.. وہ جو لاکھوں ایک دوسرے سے مختلف حسین رنگوں کے امتزاج سے کائناتیں تخلیق کرتا ہے بھلا وہ ایک اور منظر ایسا مصور کیوں نہیں کر سکتا جو ہر اُس منظر پر حاوی ہو جاتا ہے جو آج تک تمہاری آنکھوں کے راستے بدن پر نقش ہوا ہے.. نہ سرینگر کی ڈل جھیل میں کھلنے والے کنول اور اُن کے تھال پات اور ان کے ڈنٹھلوں سے کھیتی سرخ انگارا مچھلیاں، نہ کوئی شمشال بے مثال، نہ کوئی کے ٹو اور نانگا پربت، نہ جھیل کرومبر کی کنوارگی اور نہ ہی فیئری میڈو کی برفوں میں سے پھوٹنے والا اسٹرابیری کا پہلا پھول.. اور ان کے سوا درجنوں مظاہر اور وہ سب اس منظر کے سامنے جو نظر کے سامنے پھیلتا ہے.. ہیچ.. ہیچ.. جیسا کہ امام خمینی نے کہا تھا کہ یہ دنیا.... ہیچ ہیچ..

اگر میرے پڑھنے والے بھی راج سنگھاسن پر براجمان مصور کی مانند مسکراتے ہیں کہ یہ شخص ہر منظر پر مرتا ہے اور ہر بار ہمیں یہی اطلاع کرتا ہے کہ بس ہمیں است دہمیں است تو اب کی بار بھی ہم سے فریب کر رہا ہے.. اس بقول کوئے کے ''جھوٹے'' کا کچھ اعتبار نہیں.. لیکن پلیز اس بار میرا اعتبار کر لیجیے..

درست کہ کوئی ایک بار تو نہ ہوا بار بار ایسا ہوا کہ کوئی منظر ایسا کھلا کہ حرف ساتھ چھوڑ گئے، یوں لگا کہ نین پران بھی ساتھ چھوڑنے کو ہیں کہ بدن کے سنہرے پن میں ڈوبی زرد پیراہن کی ایک شکل چلی آتی ہے.. گردن میں ایک خفیف سا بل دے کر بال یوں جھٹکتی ہے کہ دل کا ''جھٹکا'' ہو جاتا ہے.. دیوسائی کے ایک درّے سے اُترتے ہوئے نشیب میں مچھوٹے دیوسائی کا کوہ قاف کھلتا ہے.. جھیل سرال کی سویر میں اُس کے پانیوں پر برف کے راج ہنس تیرتے ہیں.. ہنزہ میں ایک کھڑکی کھلتی ہے اور اس میں سے ایک ایسی شبیہہ جھانکتی ہے کہ جیسے دراصل بہشت مکیں ہے اور صرف اس کھڑکی میں

لیے ایک پل کے لیے زمین پر اُتری ہے اور کہتی ہے.. کیا آپ نے ہمارا پانی پیا.. اور ایسے بہت سے مناظر سے جھانکنے کے لیے

اور وہ بیان نہیں ہو پاتے، حرف تو فوری طور پر فرار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور آپ تہی دامن رہ جاتے ہیں، آنکھوں میں اُن کی ہر تفصیل، ہر نین نقش درج ہے پر اُن کی تصویر کاغذ پر اُتارنے سے نہیں اترتی... صحیح کہ کل شب شمالی روشنیوں کے جو ان دیکھے اَن سُنے رنگ بھڑکتے تھے وہ بھی ان کہے رہ گئے پر یہ جو ہم دریائے یوکان سے بلند ہو کر ''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ'' کی سطح پر آتے ہیں تو جو دیکھا وہ قلم کی قدرت کی گرفت میں آنے سے قاصر تھا.. یہ تو کاغذ پر نہیں اترنے کا.. ہاں اگر میری آنکھوں میں جھانکیے تو شاید اُس گنگ کر دینے والے منظر کو پرکھنے کے کچھ پیمانے ایجاد ہو جائیں..

ہم اُس بلند سطح پر آتے ہیں تو ایک سرمئی تارکول سڑک ہے اور حد نظر ہے.. کبھی سیدھی سپاٹ اور کبھی پستہ قد پہاڑیوں میں کروٹیں بدلتی چلی جاتی ہے اور یہ پہاڑیاں ڈھکی ہوئی ہیں خزاں رسیدہ شجروں کے انبوہ میں.. زرد پتوں کے بن ہیں، ڈھیر ہیں، ذخیرے ہیں اور وہ ایسی زردی میں ڈوبی ہوئی ہیں کہ اگر اُن کی گھناوٹ کے اندر کوئی بلیک بک ہرن غلطی سے چلا جائے اور جب اُن سے باہر آئے تو وہ بھی ایک زرد بسنت ہرن کی صورت میں قلانچیں بھرتا باہر آئے اور جب آئینہ دیکھے تو اس آئینے کا رنگ بھی سرسوں کی زردی میں ڈھل جائے.. ہاں.. کہیں کہیں سرو کے سرسبز درخت تھے جو جھاڑیوں کے حسن بیمار کی پیلاہٹ میں سے سربلند ہوتے تھے.. خزاں ابھی تک اُن پر غالب نہ آئی تھی اور اس بل کھاتی افق میں جا ڈوبتی سڑک کے دونوں جانب جتنی بھی پستہ قامت گھنی جھاڑیاں، بیلیں اور بوٹے تھے وہ بلند ہوتے آسمان کی قربت میں یوں ہوتے تھے کہ بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان کا وہ حصہ بھی پیلا پڑ جاتا تھا اور جب وہ اترائی میں اُترتے نشیب میں ڈھلتے تھے تو گہرائیوں میں ایسی جھیلیں بنتے تھے جن کے پانی نیلے نہ تھے، زرد زرد تھے..

اور کہیں یہ جھاڑیاں اور بوٹے سڑک پر اُمڈتے زرد نہ تھے.. اتنے آتشیں سرخ تھے کہ لگتا تھا کہ اُن کے پتوں میں سے خون ٹپکنے لگے گا.. جیسے برسات کے دنوں میں ٹپکتی چھت کے نیچے جہاں جہاں سے وہ ٹپکتی ہے برتن اور کوزے رکھ دیے جاتے ہیں ایسے ان جھاڑیوں اور بوٹوں کے تلے اگر کسی حسن کوزہ گر کا کوزہ رکھ دیا جاتا تو وہ اُن کے خون کی ٹپکتی بوندوں سے بھر جاتا یہاں تک کہ اُس کی مٹی میں بھی شفق کی سرخی جھلکنے لگتی..

اور پھر وہ بادل.. دیوسائی کے بادلوں کی مانند جو اُس بلندی پر کہ یہ ''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ'' تھی بہت نیچے اُتر آئے تھے، اُن کی سفیدی اُن زرد ہرنوں کے گرد طواف کرتی تھی..

اور کہیں گمان ہوتا تھا کہ یہ روڈ اختتام کو پہنچ گئی ہے کہ سامنے ایک سلسلۂ کوہ خزاں کی زردی اور سُرخی میں ڈھکا ہوا.. یوں ڈھکا ہوا جیسے نہ شجر ہیں اور نہ ہی بیلیں اور گھنی جھاڑیاں جو بسنت رنگ میں نچڑ رہی ہیں بلکہ آسمان سے اُترنے والا دہکتا ہوا زر لاوا ہے جو ان پہاڑیوں کو ڈھک کر سرد ہو گیا.. اگرچہ ابھی تک رنگوں کی آگ میں دہکتا ہے..

ہمیں آگاہ تو کر دیا گیا تھا کہ اس ٹیلر روڈ پر ٹریفک کم کم ہوتی ہے پر اُس سویر تو وہ کم سے بھی بہت کم تھی یعنی اس ''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ'' پر جتنا سفر ہوا اُس کے دوران بمشکل دو چار کاریں اور ایک دو ٹریلر گزرے ہوں گے ورنہ وہ پہروں سنسان رہی اور ہم مسلسل اُس کے زرد اور سُرخ بے انت جہان میں تنہا رہے.. یہ نہیں کہ ہم تو اترے سفر کرتے رہے

بلکہ ہم تو ہر قدم پر رُکتے رہے.. جیپ سے باہر آ کر بے یقینی میں آس پاس تکتے مسکراتے رہے کہ یہ کیا ہے، جس کی ہمیں خبر نہ تھی.. ایک وسیع اکلاپا تھا اور ہم تھے... اگر ٹونج ایک عورت ہوتی تو اُس زرد اور سُرخ جنت نظیر وادی میں یوں تنہائی پر مجھے گمان گزرتا کہ ہم ابھی ابھی اس جنت میں اتارے گئے ہیں.. میں تو آدم تھا اور وہ حوا ہو سکتی تھی... اور یہ بھی طے تھا کہ ہم نے یہاں سے نکالے جانا ہے.. نشیب میں زرد پانیوں کی جھیلیں تھیں..

اور ڈھلوانوں پر سرخ لاوا اُتر کر ٹھنڈا ہو چکا تھا..

میں ٹسلن کے جھیل منظروں سے متاثر ہو کر اتنا جذباتی ہوا تھا کہ میں نے اُنہیں بیان کرنے کی خاطر غالب کا سہارا لیا تھا کہ اُس کے سہارے کے بغیر نثر روکھی پھیکی رہ جاتی ہے.. لیکن دریائے یُوکان سے بلند ہو کر جب ہم اس منظر کے سامنے آئے ہیں تو احساس ہوا کہ جتنے بھی غالب کے مصرعے میں نے ٹسلن کی توصیف میں صرف کیے تو گویا انہیں ضائع کیا کہ مقام تو یہ تھا..

وہ شعر تو غالب پر صرف اور صرف ٹیلر روڈ کی توصیف میں نازل ہوئے تھے

صُبح آیا جانب مشرق نظر — اِک نگار آتشیں رُخ سر کُھلا

وہ سراسر سُرخ گُل بُوٹوں سے ڈھکے پہاڑ جو اِک نگار آتشیں ہوئے جاتے تھے اور اُن کا سَر اس سویر میں کھلا تھا..

تھی نظر بندی، کیا جب ردِ سحر — بادۂ گُل رنگ کا ساغر کُھلا

اور جن گلوں میں رنگ بھرے تھے، وہ یا تو اپنے ساغر میں زرد شراب کے سنہرے پن سے چھلکتے تھے اور یا پھر مئے ارغوانی سے لبریز تھے..

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کُھلا

خزاں کی زردی کا یہ جام جو سڑک کے دونوں جانب کھلا تھا اُس پر تادیر آنکھیں نہ رکھیے مبادا وہ بھی چھلک نہ جاویں۔

ہے طلسمِ روز و شب کُھلا..

منزل کی طرف دو گام چلتا ہوں تو التجا کرتا ہوں کہ.. رُک رُک.. ٹھہر ٹھہر.. زم زم.. کہ میں جیپ سے باہر قدم رکھ کر ہوا کے خنک بوسے جو کبھی زرد ہوتے ہیں اور کبھی سرخ اپنے چہرے پر ثبت ہوتے محسوس کر سکوں۔ اُس خواب میں اتروں جس میں جو کچھ دیکھتا ہوں اُس کا دکھانا مشکل ہے کہ آئینے میں پُھول کھلا ہے، ہاتھ لگانا مشکل ہے..

میں رک چکی جیپ میں سے اُترا ہوں تو ایک زرد بن کے بھیتر میں اُترا ہوں اور وہاں پہلی بار میرے کانوں میں ایک چڑیا کی چہک اُتری ہے، وہ زردی اور سرخی کی نچڑتی گھناوٹ میں کہیں روپوش چہکتی تھی..

ٹونج کی خفگی زائل ہو چکی تھی، وہ دھیرے دھیرے مسکراتی مجھے ٹیلر روڈ کے الوہی حسن کی اثر انگیزی سے حواس باختہ ہوتے دیکھ کر مسکراتی تھی.. وہ مجھ پر لعن طعن بھی کر سکتی تھی، آسانی سے حسب عادت بیزار ہو کر کہہ سکتی تھی کہ اگر تم ہر منظر پر حواس نثار کرتے یوں رکتے رہے تو ہم پہنچ چکے الاسکا.. لیکن اُس نے نہ مجھے ڈانٹا اور نہ کچھ تعرض کیا کہ.. ٹیلر روڈ کے اس زرد اور سرخ حسن کے انبار نے اُسے بھی اسیر کر لیا تھا..

بکھرے ہوئے منتشر بادلوں کا سفید دھواں زرد انباروں اور لہو رنگ گھناوٹ پر معلق تھا..

اور اُس لمحے جب ہماری جیپ رواں نہ تھی تقریباً پیدل چل رہی تھی کہ اُس کے میکانکی بدن میں بھی تو کہیں بس جمال تھی جو اُس کے ٹائر روکتی تھی.. تو میں نے بائیں ہاتھ پر سڑک سے اُترتے اور پھر بلند ہوتے ایک کچے راستے کو دیکھا جو ذرا اور اونچا ہو کر سرخ جھاڑیوں اور بیلوں کے انباروں میں کہیں گم ہو رہا تھا اور اُس لمحے میرے اندر ایک امنگ نے شور کیا کہ کاش وہ محض ایک ٹونج نہ ہوتی.. کوئی عشق خاص ہوتی اور میں سفر الاسکا ترک کر کے اس کچے راستے کو اختیار کر کے وہاں بلندی پر جو نہانا گھنا پن تھا، اُس میں روپوش ہو کر اس کے ساتھ کُل حیات بسر کر دیتا..

ویسے ٹونج نے اِک عالم استغراق میں کہا تو تھا کہ کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب ایک انسان پرندے کا روپ دھار لے اور کب ایک پرندہ انسان کی شکل اختیار کر لے..

میں قدرے دل گرفتہ ہوا کہ ٹونج میں فی الحال کچھ ایسے آثار نہ تھے..

اور اگر ذرا کچھ دور جا کر وہ یکدم ایک عشق خاص ہو بھی جائے تو مجھے اس سے کچھ سروکار نہ ہونا تھا کہ وہ کچا راستہ جو بلندی پر ایک سرخ اور سفید کنج میں گم ہوتا تھا اگر پیچھے رہ گیا تھا تو پھر وہ میرے لیے بیکار ہو چکی..

اور اُسی لمحے مجھ پر یہ بھی کھلا کہ ڈاسن سٹی کی شب کی شمالی روشنیوں کے ناٹک اور اب اس خزاں رسیدہ زرد اور لہو رنگ کائنات کو آنکھوں میں بھرنے کے بعد الاسکا، بے شک دنیا کا آخری کونہ... اپنی قدرتی اور وحشی رعنائیوں اور دل فریبیوں اور دل پذیریوں سے دل مسخر کرتا، ان دونوں مناظر کی سامری جادوگری کے سامنے شاید نہ ٹھہرے.. اور وہ نہ ٹھہرا..

بلندیوں پر زمین کے ہموار پن پر براجمان یہ "ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ" یقین اور ممکنات سے ماورا ایک ایسا عالم تحیر تھا جسے دنیا کے سات قدرتی عجوبوں میں بہر طور شمار ہونا چاہیے تھا اور نہ ہوا. صرف اس لیے کہ یہاں تک محدودے چند سیاحوں کی رسائی ہوتی ہے اور یوں بہت کم لوگ تھے جو اس کے گیت گاتے تھے.. اور شہرت صرف اُس کے حصے میں آتی ہے جہاں ہر کوئی پہنچ جاتا ہے.. تاریخ اور تشہیر سے ورغلائے ہوئے ہجوم پہنچ جاتے ہیں اور وہ غُل مچا دیتے ہیں.. ویسے اگر مجھ سے یہ دریافت کیا جائے کہ تم نے آج تک جتنے منظر نظروں کے سامنے پائے ہیں تو اُن سب میں سے کن سات قدرتی عجائبات کا انتخاب کرو گے تو میں بہر طور شش و پنج میں پڑ جاؤں گا اور فیصلہ نہ کر پاؤں گا.. البتہ میری گردن پر ایک تیز دھار جاپانی سمورائے کی تلوار رکھ دی جائے کہ انتخاب کرو ورنہ جان سے جاؤ گے تو میں مجبوراً مندرجہ ذیل فہرست پیش کر دیتا۔

1- نانگا پربت کے دامن میں واقع گنڈا اولڈ فیری میڈو۔
2- کنکورڈیا کے برفزار جن پر شاہ گوری کی برفیں اُڑتی ہیں۔
3- دنیا کے طویل ترین برفانی راستے میں پڑتی سنو لیک۔
4- دیوسائی اے دیوسائی..
5- ترشنگ کا گاؤں.. اور وادیٔ رُوپل۔
6- رتی گلی.. کرومبر اور سرال کی جھیلیں۔
7- وادیٔ کالاش، چترال میں.. اور ترچ میر کی چوٹی۔

یقینی سات قدرتی عجائبات تو یونہی تمام ہو گئے لیکن... کہاں لازم ہے کہ وہ صرف سات ہی ہو سکتے ہیں.. نو بھی تو

ہو سکتے ہیں۔اس لیے..

8- ڈاسن سٹی کے آسمان پر لہراتی شمالی روشنیاں۔

9- اور..یہی ''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ''

بہت بعد میں جب میں نے ایک امریکی آشفتہ سر آوارہ گرد کے ساتھ منظروں کا موازنہ کیا اور اس ٹیلر روڈ کی توصیف میں بہک گیا تو اُس نے پوچھا کہ تم کن موسموں میں وہاں سے گزرے تھے..

ستمبر کے آخری دن تھے..

تو وہ کہنے لگا..تبھی!میں بھی اُس روڈ پر سفر کرتے ہوئے الاسکا میں داخل ہوا تھا لیکن وہ جون جولائی کے دن تھے اور کچھ شک نہیں کہ اُس کے حسن کی دلکشی نے مجھے بھی قدرے باؤلا کر دیا تھا لیکن جس قدر تم متاثر ہوئے ہو، بہک گئے ہو اس کا جواز صرف یہ ہے کہ تم نے خزاں کے موسموں میں اُس روڈ پر سفر کیا اور اُن موسموں میں وہ ہری بھری نہیں رہتی اُس پر خزاں کے رنگ حاوی ہوتے ہیں جن کی اثر انگیزی سے تم حواس باختہ ہوئے ہو..ٹیلر روڈ کی یکتا خوشنمائی میں کچھ شک نہیں لیکن..جانے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا..ایسی تو نہیں وہ..

اور اس میں میرا تو کچھ دوش نہ تھا کہ میں نے تو اُسے اسی آن میں دیکھا..یہ بھی ستمبر کے کرشمے تھے!

یقیناً بھلے موسموں میں یہاں ٹریفک کا آنا جانا لگا رہتا ہو گا لیکن ستمبر کے ان ایام میں یہاں کوئی ویرانی سی ویرانی تھی لیکن اس ویرانی کو دیکھ کر گھر یاد نہ آتا تھا بلکہ بھولتا تھا..

رُکو..رُکو..

زرد ہو چکے انبار شجروں کے پس منظر میں ایک چوبی تختہ آویزاں تھا جس پر اس روڈ کے بارے میں کچھ جانکاری درج تھی..

''ٹاپ آف دے ورلڈ ہائی وے''

''یُوکان ہائی وے نمبر 9 ڈاسن سٹی سے خچروں کے ایک کچے راستے کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی جب ان علاقوں میں سونے کی تلاش کا آغاز ہوا..یہ تقریباً ساٹھ میل طویل تھی اور اُن خلیجوں یا پہاڑوں میں گھرے ہوئے تنگ میدانوں تک جاتی تھی جہاں سونے کے ذخائر پائے جاتے تھے...آہستہ آہستہ یہ خچر راستہ بہتر ہوتا گیا اور اسے ''رِج روڈ'' یعنی ایک ابھری ہوئی ٹیلہ دار سڑک کہا جانے لگا..1920ء میں اسے ڈاسن سٹی سے شروع ہو کر الاسکا کی سرحد چکن تک لے جایا گیا..اور یوں ڈاسن سٹی اور الاسکا کی بستیوں کے ساتھ اس کا رابطہ ہو گیا..اور پھر الاسکا ہائی وے کی تعمیر ہوئی تو اس ایک زمانے کی خچر روڈ کا رابطہ کل دنیا سے ہو گیا۔''

''یُوکان''

بہت پیچھے پیچھے پیدل جیپ کے برابر میں ایک ایسی پہاڑی گزرتی تھی جس کے وجود کا بیشتر حصہ خون سے نچڑتا سرخ ہوتا تھا اور اُس کے درمیان میں کچھ زرد شجر شعلوں کی مانند بلند ہوتے تھے اور کچھ سبز درخت یوں آویزاں تھے جیسے ابھی ایک راکٹ کی مانند اُٹھیں گے اور آسمانوں میں چھید کر دیں گے..کاش کہ ان مناظر کو پینٹ کرنے کے لیے کوئی خالد اقبال یا سعید اختر ہوتا..وہ نہ ہوتے تو کم از کم نذیر احمد ہوتا تو کل دنیا آگاہ ہو جاتی..ٹرنر اور کانسٹیبل کے پینٹ کیے ہوئے انگلستان کے بارش سے بھیگتے ٹھٹھرتے از حد معمولی مناظر آج دنیا کی ہر بڑی آرٹ گیلری میں آویزاں ہر آنکھ سے جو ان پر ٹھہرتی ہے، داد وصول کرتے ہیں تو یہ ٹرز روڈ صرف اس لیے آج تک آنکھوں میں نہیں آئی کہ اس کی تصویر کشی کے لیے کوئی ٹرنر یا کانسٹیبل میسر نہیں ہوا..

کچھ چہروں، گیتوں اور منظروں کا چرچا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ دور افتادگی کی دُھند میں روپوش ہوتے ہیں..

○●○●○

''ٹیلر روڈ کے حُسن کی شان میں ایک معلقہ..جو کعبے کی دیوار پر معلّق ہو سکتا تھا''

جیسا کہ تصنیف کا دستور ہے کہ آپ گاہے بگاہے جو کچھ تحریر کرتے ہیں اُس پر نظر ڈالتے ہیں تا کہ یہ تعین کیا جا سکے کہ جو کیفیت بیان کرنی تھی، جس منظر کو پڑھنے والوں کے لیے کورے کاغذ پر تصویر کرنا تھا تو کیا وہ تصویر ہو گیا.اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی.. یا وہ لفظ جو آپ نے تحریر کیے ہیں، آپ کا ٹھٹھا اُڑا رہے ہیں کہ بس..تو اسی دستور کے تحت ابھی ابھی میں نے اس بام دنیا پر بچھی شاہراہ کے بارے میں جو کچھ قلم کے راستے کاغذ پر اُترا تھا اُسے دوبارہ پڑھا تو شرمندگی کے ساتھ احساس ہوا کہ میں تو گھونگھٹ میں پوشیدہ اس چہرے کی ایک جھلک بھی آپ تک منتقل کرنے میں ناکام رہا..اور مجھے اپنی نثری زندگی میں شاعری کی تشنگی محسوس ہوئی۔

وہ جو تا حد نظر پھیلے ہوئے ''پیراڈائز'' قالین تھے جن پر رنگ رنگ کے پرندے ڈال ڈال چہکتے تھے..وہ جو جنوں خیز خزاں رسیدہ جنت تھی..اور اُس میں، میں اور گونج ایک بے بہا دیدہ زیبی میں گرفتار تھے اور تنہا تھے تو اگر میں شاعر ہوتا تو شاید میں اُن حسن کے ایک شائبے، ایک گمان کو گرفت میں لا کر بیان کر سکتا۔عہد حاضر کے بیشتر شاعروں کی مانند قافیے ردیف کی یکسانیت اور اکتا کر جمائیاں لینے والی شاعری کی مانند نہیں.. بلکہ امراؤ القیس کی مانند..اگر میں امراؤالقیس ہوتا تو اس شاہراہ کی شان میں ایک قصیدہ کہتا..ایک ''معلقہ'' کہتا۔

''معلقہ'' عام روایت کے مطابق کسی شاعر کے اُس قصیدے کو کہا جاتا تھا جسے عکاظ کے سالانہ میلے میں فن شعر کے نقاد اُس برس سب سے بلند پایہ قرار دیتے تھے اور پھر اُسے سونے کے پانی سے تحریر کر کے درِ کعبہ پر لٹکا دیا جاتا تھا یعنی معلّق کر دیا جاتا تھا..امراؤالقیس کا معلقہ حسب روایت اُس کی روٹھی ہوئی محبوبہ کے دیار کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور یہ طے ہے کہ عربی شاعری میں اس سے زیادہ پڑھی جانے والی نظم اور کوئی نہیں..

''ذرا ٹھہرو دوستو! کہ ہم ایک محبوبہ اور اُس کے مسکن کی یاد میں آنسو بہا لیں..جو دخول اور حومل کے درمیان ایک ڈھلواں ٹوٹتی ریت پر واقع ہے..''

اب ذرا امراؤالقیس کی مہمات عشق کا احوال بھی ملاحظہ کیجیے..

''وہ دن کبھی بھولنے کا ہے؟ جب میں عنیزہ کے کجاوے میں جا داخل ہوا اور وہ چیخ اٹھی، آفت پڑے تم پر تم مجھے سواری سے اُتار کر رہو گے..میں نے اُس سے کہا، جانِ جاں اپنے اونٹ کی لگام ڈھیلی کر دو۔مجھے اپنے اس ثمر شباب سے دور نہ کرو جس کی طرف بار بار میرا ہاتھ بڑھتا ہے..

ایک رات جب آسمان پر مشرق کی جانب ثریا کے ستاروں کا جھرمٹ یوں ظاہر ہوا جیسے جڑاؤ ہار کے موتی، میں اُس کی طرف آیا، وہ اُس وقت پردے کے پیچھے اپنے کپڑے اُتار چکی تھی اور صرف شب خوابی کا ہلکا سا لباس اُس کے جسم پر تھا..

مجھے دیکھ کر کہنے لگی، قسم خدا کی، تم سے بچنے کی سب تدبیریں بے کار ہیں اور یہ گمراہی تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑے گی..

میں اُس کو لے کر باہر نکلا، ہم ریت پر چل رہے تھے اور وہ ہمارے قدموں کے نشانات پر اپنی کڑھی ہوئی چادر کا پلو گھسیٹتی جاتی تھی..

میں نے اُسے بالوں کی دونوں چوٹیوں سے پکڑ کر اپنی طرف جھکایا تو وہ نازک کمر، بھری بھری پنڈلیوں والی، میرے اوپر جھک گئی..

پچکے ہوئے پیٹ والی سیمیں بدن، اُس کا سینہ شیشے کی طرح اُجلا اور براق تھا، کبھی وہ شرم سے اپنا مُنہ دوسری طرف کر لیتی اور کبھی اپنا ایک رخسار میری طرف کر کے ایسی نگاہوں سے دیکھتی جیسے.... بچے والی ہرنی سہمی ہوئی رحم طلب نگاہوں سے دیکھتی ہے..

اور پھر اپنی محبوبہ کے سارے اوصاف گنوانے کے بعد کہتا ہے..

''ایک رات جب اُس کے اہل خانہ سو گئے تو میں اُس کے بالا خانے پر یوں دبے پاؤں چڑھا جیسے پانی کا بلبلہ اٹھتا ہے....دھیرے دھیرے، بے آواز..''

یاد رہے کہ جب کعب بن زوہیر نے اپنا مشہور عالم قصیدہ بانت سعد رسول اللہؐ کے سامنے پڑھا جب کہ وہ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے تو اُس نے بھی حسب روایت آغاز میں اپنی محبوبہ کے بدنی اوصاف بیان کیے تھے..اور حضورؐ نے اُسے اپنی چادر انعام کے طور پر اوڑھا دی تھی..

اگرچہ کہاں امراؤالقیس کی معجزہ بیانیاں اور کہاں ہم ایسوں کی حرف اور اظہار کی بے سر و سامانیاں..لیکن اس بام دنیا پر پھیلے حیرت کدے کو بیان کرنے کی خاطر اُس کا تتبع کر لیتے ہیں، اُس کا دامن تھام کر دیکھ لیتے ہیں کہ شاید اظہار کی کوئی صورت نکل آئے..تو ہم ایک خیالی محبوبہ کے سراپے سے آغاز کر کے دیکھتے ہیں..

"اور جب وہ یوکان کی ایک ان چھوئی جھیل میں سے نہا کر پچھلی شب کی الفتوں کی گیلی تھکاوٹ سے نجات حاصل کر کے نکلتی تھی تو گویا ریت کے ٹیلوں میں کھلے ایک نوزائیدہ پھول کی مانند معصوم نکلتی تھی..

اور وہ ایک تھرتھراتے بدن والے ہرن کی مانند اپنے بدن پر کچھ لبادہ نہ رکھتی تھی.. البتہ اپنے نچڑتے بالوں کو سکھانے کی خاطر یمن کی ایک دھاریدار چادر ایک پگڑی کی صورت سر پر باندھے جھیل سے نکلتی تھی..

اور وہ شمالی روشنیوں کے آسمان کی مانند تہی دامن نہ تھی کہ اُس کے سینے سے صرف ایک مہتاب اُبھرے..

اُن کے ابھار جڑواں تھے اور ان کی دل کشی میرے ہاتھوں کو سرکش کرتی تھی.. اُس کی کمر کھجور کی ٹہنی کی طرح لچکیلی اور اُس کا پیٹ سفید اونٹنی کی مانند پچکا ہوا تھا..

میں اُس محبوبہ کے ہجر میں آنسو گراتا ہوں جیسے پکی ہوئی کھجوریں ٹپ ٹپ ریت پر بے آواز گرتی ہیں..

اونٹ کے سیاہ بالوں سے بُنے ہوئے وہ خیمے کب کے اجڑ چکے جن میں وصال کی سسکیاں اُبھرتی تھیں اور وہ جھیلیں کب کی سُوکھ چکیں جو اُس کے بدن سے واقف تھیں اور اب وہاں سوائے جدائی کے ویرانے کے اور سُوکھ چکی بکریوں کی مینگنیوں کے اور کچھ نہیں..

جیسے ایک اونٹنی کا بچہ اپنی ماں سے جدا ہو کر صحراؤں میں بھٹکتا ہے.. میں بھی اُس کے ہجر کا پتھر سینے پر بوجھ کیے دربدر پھرتا ہوں..

تو آؤ ان کھنڈروں اور اجڑ چکے خیموں پر ماتم کرتے ہوئے اُن زمانوں کو یاد کرتے ہیں.. جب ہم ایک ایسے بلند راستے کے مسافر تھے جس کے گل بوٹوں اور جھاڑیوں میں سے لہو ٹپکتا تھا.. جب سورج زرد ریت کے ٹیلوں کی مدھر چھاتیوں میں یوں ڈوبتا تھا کہ اُس ریت کا ہر ذرہ میرے آبائی دشمن قبیلے کے خون سے سرخ ہوتا تھا اور پھر یوں زرد ہو جاتا تھا جیسے میں نے اپنی ہندی تلوار اُس کے سردار کی گردن پر رکھ دی ہو اور اُس کا چہرہ زرد ہو جائے..

بے شک ہمارے لات و منات.. ہمارے خدا.. کعبے میں سجے.. بے شک ہماری مناجاتیں قبول کرتے ہماری خواہشوں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن وہ بھی.. کعبے میں جتنے بھی صنم سجے تھے اگر وہ بھی اس راستے پر آ نکلتے تو وہ بھی حیرت کی تصویر ہوئے بولنے لگتے.. اُن میں جان پڑ جاتی..

ارض کنعان کی جانب سے ایلچی اُن پیغمبروں کے نزول کی خبر لاتے ہیں جو بعد از موت ایک جنت کے خواب دکھلاتے ہیں.. تو اُن سے کہو..

کہ کبھی ادھر کا رُخ کریں کہ یہ راستہ اگر جنت نہیں تو اُس تک جاتا تو ہے..

اور اگر اس راستے کے آخر میں اُن کی بشارت کردہ جنت نہیں ہے.. تو مجھے قسم ہے اُس سر جھٹکنے والی کہ.. پھر جنت نہیں ہے..

تم ذرا ان محوِ خرام بادلوں کو اس راستے کے برگ و گل میں پیاسے اونٹوں کی مانند قیام کرتے تو دیکھو.. وہ اپنی تھوتھنیاں اس لہو رنگ حسن میں ڈوبے زرد سحر میں ڈالے سُست ہوئے جاتے ہیں..

اور ان اونٹوں کی ٹانگوں میں یوں خم آتا ہے کہ ہمارا کجاوہ ڈول جاتا ہے اور وہ کہتی ہے کہ اے مستنصر، تم

خدا کی قسم تم سے بچنے کی سب تدبیریں بے کار ہیں.. آفت پڑے تم پر، میں کبھی تم پر یوں بے اختیار نہ گرتی اگر یہ اونٹ اس بام دنیا کے راستے پر اُس کے حسن سے تسخیر بے خود نہ ہو جاتا.. تم میری جان لے کر رہو گے..

اُس کے ہونٹوں پر رِسنے والا لعاب میری روح کے زخموں پر مرہم رکھتا تھا اور اُس کی چھاتیاں ایک حاملہ اونٹنی کی مانند میرے لمس سے پھولتی تھیں..

لیکن یہ سب آثار اُلفتوں کے مٹ گئے.. نشانات معدوم ہو گئے.. میں اُس کے ہجر میں جیسے پکی ہوئی کھجوریں ریت پر گرتی ہیں، بے آواز آنسو بہاتا ہوں..

میں اُس ٹیلے کے کناروں پر آ پہنچا ہوں جس کے آگے ایک اتھاہ گہرائی فنا کی میری منتظر ہے، کوئی دن جاتا ہے جب موت کا سیاہ عقاب مجھ پر جھپٹ پڑے گا جب گلے کا گھنگھرو بولنے لگے گا، جبڑا کھنچ جائے گا اور آنکھیں پتھرانے کو ہوں گی تو میں فریاد کروں گا کہ میں ابھی ایک ساعت پیشتر تو اس دنیا میں آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی رخصتی کا پروانہ آ گیا ہے..

لیکن اُس آخری ساعت میں بھی وادیٔ یُوکان کی اُس کوہستانی خزاں کے آگے سربسجود ہوتے ہوئے میں اُس سے بچھڑنا نہ چاہوں گا..

جیسے ایک پیاسا اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے تھنوں سے بچھڑنا نہیں چاہتا..

خیمے اجڑ چکے ہیں.. نہ وہ کجاوے ہیں جو میرے اور اُس کے بدن کے بھار سے ڈولتے تھے اور نہ ہی ریت پر اُس کی کاڑھی ہوئی چادر کے گھسٹنے کے کچھ آثار باقی ہیں۔

○●○●○

"پوکر کریک، الاسکا.. گیارہ ستمبر.. پہلا پاکستانی جو سرحد پار کرتا ہے"

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سٹارز اینڈ سٹرائپس پرچم ایک آہنی اگرچہ کمرخمیدہ پول پر پھڑ پھڑاتا تھا..

ساٹھ ستر کلومیٹر کی یہ مسافت ایک زرد اور لہو رنگ خوابنا کی میں گزر گئی اور جب اس خواب سے باہر آئے ہیں، آنکھ کھلی ہے تو ٹیلر روڈ کے آخر میں ایک کوہان نما پہاڑ کے دامن میں سبز رنگ کی ایک چوبی جھونپڑا نما عمارت نظر آنے لگی ہے جس کے دائیں جانب کینیڈا کا چناری پرچم آویزاں ہے اور بائیں جانب الاسکا کی ہواؤں کی زد میں آیا ہوا امریکی جھنڈا بے خود لہراتا ہے..

یعنی شباب ختم ہوا اِک عذاب ختم ہوا..

ٹیلر روڈ کا عذاب اختتام کو پہنچا..

ہماری سواریاں رُکنے لگیں..

امریکہ کی سرحد پر آپ کیسے نہیں رُک سکتے..

سبز رنگ میں پینٹ کی گئی اُس چوبی جھونپڑا نما کے قریب آ کر آپ رُک جاتے ہیں.. برآمدے کے باہر ایک بورڈ آویزاں ہے.. بورڈ کیا ہے ایک تختہ سا ہے جس پر کسی اناڑی پینٹر نے لکھا ہے..

"پوکر کریک.. الاسکا
بلندی... 4127 فٹ
آبادی... دو افراد
شمال میں واقع امریکہ کی سب سے آخری سرحد"

یعنی جسے امریکی ناولوں میں "دے لاسٹ فرنٹیئر" کہا جاتا ہے..

جیپوں کے آگے پیچھے رُکتے جانے کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی رُکتا جاتا تھا.. جیسے میں ایک مفرور مجرم ہوں اور یکدم میرے سامنے پولیس کی ناکہ بندی آ گئی ہے.. مسافت کے دوران بھی میں حساب کتاب کرتا رہتا تھا کہ ہم ستمبر کی کونسی تاریخ کو امریکی سرحد عبور کریں گے.. اور جس کا ڈر تھا وہ حقیقت سامنے آ گئی تھی...

کا خوف دامن گیر ہو گیا.. ٹیلر روڈ کے خواب درخواب حسن کے اندر گئے تو کچھ لمحوں کے لیے تاریخ اور زمانوں ہی تو آج کی تاریخ فراموش کر گئے اور اب جب کہ جیپیں رُک رہی تھیں تو میرا دل بھی اس لیے رکتا جاتا تھا کہ آج گیارہ ستمبر ہے..

وہ گیارہ ستمبر جو ہر امریکی کے بدن پر مسلسل تشہیر سے داغ دیا گیا ہے.. جیسے مویشیوں کے بدنوں کو دہکتے ہوئے لوہے کے نشانوں سے داغ دیا جاتا ہے.. اُن کا یہ زخم بھرنے کو نہیں آتا کہ اسے مسلسل کھرچ کھرچ کر تازہ کیا جاتا ہے تاکہ ملکوں کو ملیامیٹ کرنے کا جواز مسلسل رہے.. امریکی ہر گیارہ ستمبر کو اپنے تصور میں خود سے وہ جہاز اُڑاتے ہیں اور انہیں ٹریڈ سنٹر سے ٹکرا کر اُسے مسمار کر دیتے ہیں.. چنانچہ اس روز وہ ہر گندمی رنگت والے غیر ملکی بلکہ مسلمان کو ہائی جیکر عطا کا سگا برادرِ عزیز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ عافیت اسی میں ہے کہ انہیں اُس روز نہ چھیڑا جائے..

ذرا تصور میں لائیے کہ آج کے روز.. عین گیارہ ستمبر کو ایک گندمی رنگ کا شخص.. بدنامِ زمانہ سلطنت پاکستان کا شہری اگر وادیٔ یُوکان کی نفتوں پر فراموش شدہ وادی میں سفر کے کشٹ کاٹتا یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ کے آخری صوبے الاسکا میں زمینی راستے کے ذریعے شمال میں واقع آخری سرحد میں داخل ہو رہا ہے تو.. کیوں ہو رہا ہے.. بے وجہ تو عین گیارہ ستمبر کے دن وہ الاسکا میں داخل نہیں ہو رہا.. اگر اُسے الاسکا دیکھنے کا اتنا ہی شوق تھا تو براہ راست بائی ایئر اینکرایج چلا جاتا.. اگر زمینی راستے سے داخل ہو رہا ہے تو..

گیارہ ستمبر کا پھندہ میرے گلے میں تھا..

جونہی ہماری جیپیں پوکر کریک سرحد کے بیریئر پر رک کر ساکت ہوئیں تو نیلی وردی میں ملبوس ایک لمبے تڑنگے صحت مند کروئنٹ ہیئر سٹائل والے امریکی کسٹم آفیسر نے باری باری ہر جیپ میں جھانکا اور اُسے اُن میں کچھ گورے کچھ گندمی رنگت کے تھکے ہوئے سیاح نظر آئے تو اُس نے جانے کس سے مخاطب ہو کر کہا "ویلکم ٹُو الاسکا" اور راستے میں حائل بیریئر کو اٹھا دیا۔

چونکہ کینیڈا سے امریکہ میں داخل ہونے کے لیے کسی ویزا وغیرہ کی پابندی نہیں ہے تو اُس نے محض ایک سرسری نظر ڈال کر یہ فرض کر لیا کہ سب کے سب مسافر کینیڈا کے شہری ہیں تو.. جانے دو!

میرا اوّلین ردعمل یہی تھا کہ شکر ہے.. ہم جاتے ہیں اور پھر اُسی لمحے میرے گُند ذہن میں شعور کی ایک چنگاری سی بھڑکی کہ تارڑ صاحب.. اگر الاسکا میں کہیں بھی پولیس نے یا کسی خفیہ ادارے نے آپ کا پاسپورٹ چیک کر لیا اور اُس پر الاسکا میں داخلے کی کوئی مُہر ثبت نہ ہوئی تو وہ یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ بھائی صاحب آپ غیر قانونی طور پر کدھر سے چُھپ چُھپا کے الاسکا میں داخل ہوئے ہو.. صورت شکل سے برفانی ریچھوں کے شکاری نہیں لگتے تو کونسا شکار کرنے آئے ہو.. چلیے وہاں چیکنگ نہیں ہوتی لیکن کینیڈا واپسی پر بھی امریکی کسٹم آپ کے پاسپورٹ کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ استفسار کریں گے کہ تم اگر قانونی طور پر داخل ہوئے تھے تو داخلے کی مُہر کہاں ہے.. بے شک گنتاموبے یہاں سے طویل فاصلوں پر ہے لیکن ہم آپ کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر سر پر ایک کنٹوپ پہنا کر وہاں لے جائیں گے.. اتنا تو ہم آپ کے لیے کر سکتے ہیں..

چنانچہ.. اُس لمحے جب ہماری جیپ بارڈر کے پار جانے کے لیے متحرک ہوئی تو میں نے فوراً ہاتھ کھڑا کر کے

کار آمد امریکی ویزا ہے.."

دنیا بھر کی سرحدوں پر.. بے شک وہ برادر اسلامی ملکوں کی سرحدیں ہوں.. جونہی آپ اپنا سبز پاکستانی پاسپورٹ کاؤنٹر پر رکھتے ہیں تو اُس کے پار کھڑا کسٹم آفیسر یوں چوکنا ہو جاتا ہے جیسے اُس کے سامنے بارش کے جنگلوں کی گھناوٹ میں سرکتا ایک سبز رنگ کا سانپ یکدم پھن پھیلا کر جھومنے لگا ہے.. وہ اسے ڈرتے ڈرتے ہاتھ لگاتا ہے کہ کہیں ڈس نہ لے..

"یُو مین پے کس تان.." امریکی آفیسر کی مسکراہٹ ذرا سمٹ گئی..

"جی ہاں.. میں ایک پاکستانی ہوں.. اور.. آئی ایم پراؤڈ ٹو بی اے پے کس تانی۔"

اس نے سرسری طور پر میرے پاسپورٹ کی ورق گردانی کی.. اس پر چسپاں تصویر کو ایک نظر دیکھ کر مُجھے دیکھا، موازنہ کیا اور پھر کہنے لگا.. "پلیز ذرا انتظار کیجیے۔" لیکن اُس کے چہرے پر ناگواری نہ تھی، کچھ بے یقینی اور تعجب کا تاثر تھا..

وہ جو امریکی پرچم کے سائے میں ایک چوبی جھونپڑا تھا، جہاں پوکر کریک الاسکا کا بورڈ آویزاں تھا اس سرحد پر مامور تنہا کسٹم آفیسر کا ٹھکانہ لگتا تھا.. برآمدے میں منرل واٹر اور پیپسی کولا کے تین کریٹ دھرے تھے..

اس جھونپڑے کے بائیں جانب ٹین کی چھتوں والا جنہیں سبز رنگ سے پوچا گیا تھا ایک سرکاری دفتر تھا اور ایک سفید پینٹ کیے ہوئے دروازے پر "پوکر کریک.. اے کے" کا سٹکر چسپاں تھا.. اور اے کے سے مُراد آزاد کشمیر نہ تھا، الاسکا تھا.. دروازے کے دوسری جانب ایک تختی آویزاں تھی جس پر ایک وارننگ درج تھی "ملاقاتیوں کو اس دفتر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔"

کسٹم آفیسر میرا پاسپورٹ تھام کر اپنے دفتر کے اندر روپوش ہوا تو ایک مدت روپوش ہی رہا.. اور جوں جوں وقت گزرتا تھا میرے ماتھے پر تشویش کی نمی پھوٹتی تھی.. سیاحتی گروپ کے دیگر ارکان کے چہروں پر بیزاری اور میرے لیے ناپسندیدگی عیاں ہو رہی تھی کہ صرف میری وجہ سے اُن کا سفر کھوٹا ہو رہا تھا..

گونج بھی پہلو بدلتی بیزار ہوتی تھی "ہم اچھے بھلے پار ہونے کو تھے، تم نے خواہ مخواہ اپنی شناخت کا بکھیڑا شروع کر دیا۔"

میں نے اُسے یوں پاسپورٹ پر دخول کی مُہر لگوائے بغیر الاسکا میں داخل ہو جانے کے مضمرات سے آگاہ کیا تو وہ چونچ چڑھا کر کہنے لگی "اگر تم ایک بار امریکہ میں داخل ہو جاؤ تو بے شک ساری زندگی ایک ایسا پرچم لہراتے پھرو کہ میں ایک غیر قانونی شخص ہوں تو بھی تم سے کوئی کچھ بھی نہیں پوچھے گا۔ لاکھوں کی تعداد میں میکسیکو اور چین کے لوگ امریکہ میں غیر قانونی طور پر دندناتے پھرتے ہیں۔"

"انہیں یہ سہولت ہے گونج کہ وہ مسلمان نہیں ہیں.. برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر.. چاہے وہ مُجھ ایسے نام نہاد مسلمان ہی کیوں نہ ہوں.."

چونکہ بقیہ سیاح خواتین و حضرات مُجھے ایسے تکے جا رہے تھے کہ جیسے میں ایک خودکش حملہ آور ہوں تو میں نے اُن سے گزارش کی کہ وہ بے شک میرا انتظار نہ کریں.. عازمِ سفر ہو جائیں.. جیتے رہے تو پھر سے آن ملیں گے..

وہ ایسے بے دید تھے کہ فوراً چل دیئے.. نہ سلام نہ دعا.. نہ اتنی طویل ہم سفری کا کچھ خیال.. چل دیئے۔

○●○●○

"امریکہ کی سب سے آخری شمالی سرحد پر کسٹم آفیسر مُجھے کافی پر مدعو کرتا ہے"

اور اب اس لمحۂ موجود کی تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ پوکر کریک کے بارڈر پر اور اس "قصبے" کی آبادی پوری دو نفوس پر مشتمل تھی.. ٹیلر روڈ کے اختتام پر ایک چاندی رنگ کی ایک جیپ کھڑی ہے اور اُس کے اندر ایک پاکستانی کا دل گیارہ ستمبر کے پھندے میں پھنسا ہوا دھڑکتا ہے، وہ اپنے ماتھے پر پھوٹنے والے پسینے کو بار بار پونچھتا ہے اور وہ امریکی کسٹم آفیسر اپنے دفتر کی سُرنگ میں روپوش ہو کر اس لمحے سی آئی اے.. ایف بی آئی.. پینٹا گان اور جانے کس کس ادارے سے رابطہ کر رہا ہے.. اور اُس کی کمپیوٹر سکرین پر نہ صرف میرے اسلام آباد سے جاری کردہ ویزے کے کوائف بلکہ میری پوری حیات کی تفصیل درج ہوگی کہ یہ تارڑ کون ہے، روزی کیسے کماتا ہے.. کن کن اخباری کالموں اور تحریروں میں امریکہ کی توصیف کرتا ہے اور بیشتر تنقید کرتا ہے.. اور دن میں کتنی بار جمائیاں لیتا ہے اور کیا اسے قبض کی شکایت ہے، یہ سب کچھ درج ہوگا... یہ امریکی اس قدر تفصیل میں جاتے ہیں تو اس لیے راج کرتے ہیں اور اپنی من مرضی کرتے ہیں۔

پوکر کریک جن پہاڑیوں کے درمیان تھی وہاں ابھی تک خزاں کا غلبہ نہ ہوا تھا اور وہاں اُن کے نشیب و فراز میں مُجھے چند سفید پتھر ایستادہ دکھائی دیئے..

"گونج.. تم ان پتھروں کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟ کیا ہیں؟"

اُس کے چہرے پر بھی اکتاہٹ کی کائی جمتی جا رہی تھی کہ یہ انتظار طُول کھینچتا جا رہا تھا.. "یہ امریکہ اور کینیڈا کے درمیان جو سرحد ہے اُس کی نشاندہی ہے.. انہیں تم بُرجیاں کہہ سکتے ہو.. ویسے الاسکا میں غیر قانونی طور پر داخلہ کچھ اتنا دشوار نہیں.. اگر ہم پیدل ہوتے تو اس کسٹم پوسٹ کی بجائے ذرا اوپر ہو کر نکل جاتے، اُن بُرجیوں کے پار ہو جاتے.."

دیر اتنی ہو چلی تھی کہ میں ذہنی طور پر مکمل پسپائی کے لیے تیار ہو گیا.. آج کی شب پھر ڈاسن سٹی میں اور پھر واپس.. واپس یوکان.. خدا حافظ الاسکا.. اگر وہ کسٹم آفیسر پورے پچیس منٹ سے اپنے دفتر سے باہر نہیں آیا تو کچھ نہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے اور جب پردہ اُٹھے گا تو وہ کہے گا.. "سوری مسٹر.. تمہارا تو نام ہی ٹیرر ہے تو تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں گیارہ ستمبر کے دن تمہیں امریکہ میں داخل ہونے کی اجازت دوں گا.. بلکہ بہتر ہے کہ میں تمہیں گرفتار ہی کر لوں۔"

تب کسٹم آفیسر اپنے سبز گھونسلے آفس میں سے نمودار ہوا۔ "کیا آپ اندر آ سکتے ہیں؟"

میرا دل بری طرح دھڑکا.. گرفتاری والا خدشہ درست ثابت ہو سکتا تھا.. یہ مُجھے اپنے آفس میں رکھے کسی مخصوص پنجرے میں بند کر کے گنتا موبے بائی ایئر روانہ کر دے گا اور گونج سے کہے گا، لہٰذی تم آزاد ہو پھُر کر کے اُڑ جاؤ..

وہی آفس جس کے دروازے کے باہر وارننگ جلی حروف میں درج تھی کہ ملاقاتیوں کو اس دفتر کے اندر آنے کی اجازت نہیں، بیٹھے کئے نیلی وردی والے امریکی نے وہی دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے کہا'' پلیز اندر آجایئے۔''

آفس کے اندر ایئر کنڈیشنر کی بہت ہلکی اور مسلسل غراہٹ غوں غوں کرتی تھی.. دو تین کمپیوٹر تھے، چند آرام دہ کرسیاں تھیں، کونے میں ایک کافی میکر تھا.. کچھ الماریاں اور میزوں پر ٹائپ شدہ کاغذ اور فارم کثرت میں پڑے تھے.. پنجرہ البتہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا..

'' پلیز آپ تشریف رکھیے۔''

میں تشریف رکھ گیا..

'' دراصل آپ کا ویزا عام سیاحوں کی مانند ملاقاتی نہ تھا. صحافتی تھا. تو مجھے کچھ رابطے کرنے پڑے۔''

مجھے فوراً اس تاخیر کا بھید سمجھ میں آ گیا.. واقعی میرا ویزا ملاقاتی نہ تھا بلکہ صحافتی یا میڈیا سرگرمیوں کے لیے جاری شدہ تھا.. دراصل اُن دنوں میں ایک متنازع ٹیلی ویژن شو'' شادی آن لائن'' کی میزبانی کر رہا تھا اور چینل کی جانب سے فیصلہ ہوا کہ دوبئی کے بعد اس پروگرام کے کچھ شو امریکہ میں ریکارڈ کیے جائیں۔ چنانچہ ہمارے لیے چینل نے ان ویزا کا بندوبست کیا.. اور یہ میڈیا پروگرام صحافت کی ذیل میں آتے تھے، ایک بار ٹورنٹو ایئرپورٹ پر امریکی امیگریشن آفیسر نے بھی ایک خفیف سا تنازع کھڑا کر دیا تھا کہ تم تو کہتے ہو کہ امریکہ میں تمہاری آمد کا بنیادی مقصد اپنے بچوں سے ملاقات کرنا ہے لیکن تمہارے پاس ملاقاتی ویزا نہیں ہے.. تو میں نے فوری طور پر پینترا بدل کر اُس چینی امریکی کی سُرمہ سلائی آنکھوں میں اپنی بڑی بڑی آنکھیں ڈال کر کہا کہ آفیسر. تم بالکل درست کہتے ہو... میں امریکہ میں صرف میڈیا کے کچھ شوز ریکارڈ کروں گا لیکن اب تم ہی بتاؤ اگر میرے دو بچے بھی وہاں ہیں تو کیا میں اُن سے نہیں ملوں گا.. تب چھٹکارا ہوا..

میں چپکا بیٹھا رہا..

'' یُو آر او کے.. ہاں. نو پرابلم.. ویلکم ٹو الاسکا۔''

میری جان میں جان آئی..

'' اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو میں آپ کو یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ کے سب سے شمالی بارڈر پر کافی کا ایک پیالہ پیش کر سکتا ہوں.. اور اگر آپ خواہش مند ہوں تو ایک چکن سینڈوچ بھی.. میرے اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ۔''

مجھے تو باقاعدہ پروٹوکول دیا جا رہا تھا.. لیکن ابھی تک خدشات دامن گیر تھے'' میں سرحد پار کر سکتا ہوں ناں۔''

'' کسی بھی وقت.. لیکن پلیز کافی کے ایک کپ کے بغیر نہیں۔''

وہ جو میری جان میں جان آئی تھی اُس میں مزید جان آ گئی..

میں اپنے امریکی سفرنامے'' نیویارک کے سو رنگ'' میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ عراق اور افغانستان میں جو دہشت ناک امریکی'' گوگو'' پھنکارتا پھرتا ہے وہ اپنے ملک کے سیاسی اور فوجی تکبر کا مجبور نمائندہ ہوتا ہے جب کہ ایک عام امریکی کی خصلت میں یورپی اقوام کی نسبت محبت اور بے دریغ دوستی کے جذبے کہیں زیادہ اور اخلاص بھرے ہیں.. اُن زمانوں میں جب میں یورپ کے طول و عرض میں دربدر آوارہ ہوتا تھا تو یہ صرف امریکی [illegible]

دوست ہو جاتے تھے اور لاہوریوں کے مانند کھلے ڈلے مزاج کے ہوتے تھے..

پوکر کریک الاسکا کا وہ کسٹم آفیسر جس کا نام میرے ذہن سے اتر گیا ہے ایک ایسا ہی امریکی تھا..

'' ہمارے ہاں سرحدی کسٹم کے محکمے میں یہ پوکر کریک گویا ایک کالا پانی ہے جہاں کوئی بھی تعینات نہیں ہونا چاہتا لیکن میں یہاں بہت خوش ہوں.. یہاں کی تنہا راتوں میں کیسے کیسے خواب آتے ہیں، میں تمہیں بتا نہیں سکتا.. ویک اینڈ پر میں اپنے خاندان کے پاس چکن کے قصبے میں چلا جاتا ہوں کہ اگر وہ یہاں قیام کریں تو بچے سکول کیسے جائیں.. بے شک یہاں تنہائی بہت ہے، میرے علاوہ اس سرحد پر پوکر کریک میں صرف ایک اور اہلکار ہے اور اس لیے اس کی کل آبادی دو نفوس پر مشتمل ہے.. کچھ گہما گہمی نہیں ہے، کچھ عرصہ آپ کُڑھتے ہو کہ کہاں آ گئے.. اور پھر آپ یہاں کی آزادی، تنہائی اور منظروں کی دلکشی سے لطف اندوز ہونے لگتے ہو.. یہاں تک کہ آپ خواہش کرنے لگتے ہو کہ بقیہ عمر یہیں بسر ہو جائے.. اور کیا آپ جانتے ہیں کہ کینیڈا سے الاسکا میں زمینی راستے سے داخل ہونے والے آپ میرے پہلے پاکستانی شہری ہیں۔''

میں کہنے والا تھا کہ اور وہ بھی گیارہ ستمبر کے دن.. لیکن چپ رہا..

'' اور یہ دیکھیے۔'' اُس نے میرے پاسپورٹ کا ایک ورق میرے سامنے کیا'' اس پر امریکہ میں داخلے کی معمول کی مُہر نہیں ہے بلکہ میں نے آپ کے لیے ایک خصوصی مُہر ثبت کی ہے جو صرف خاص لوگوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے.. دیکھیے۔''

میرے پاسپورٹ کے ایک صفحے پر ایک بہت بڑے بارہ سنگھے کی شبیہہ ثبت تھی جس کے نیچے'' الاسکا'' درج تھا..

آفس کے اندر جیپ کے ہارن کی آواز غُل کرتی داخل ہوئی اور مجھے ڈانٹنے لگی کہ میں باہر تمہاری منتظر ہوں اور تم ہو کہ اندر ڈیرے ڈالے بیٹھے ہو..

'' رخصت ہونے سے پیشتر میں اس سرحد کو عبور کرنے والے پہلے پاکستانی کے ساتھ ایک تصویر اُتروانا چاہتا ہوں۔''

ایک بلند سطح پر واقعی ایک سرحدی چوکی جس کے پس منظر میں بادلوں کے کھیل ہیں اور ایک سبز رنگ کا جھونپڑا جس کے سفید دروازے کے باہر'' پوکر کریک.. A.K.'' کا بورڈ آویزاں ہے.. ایک ایسا تارڑ جس کی جان میں جان آ کر مزید جان آ چکی ہے، براؤن فلیس کی ایک جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے.. نیلی جین میں مسکراتا ہے اور اُس کے برابر میں نیلی وردی اور فل بُوٹس میں ایک مشٹنڈہ سا کرو کٹ ہیئر کٹ والا امریکی کسٹم آفیسر یوں تصویر اُتروا رہا ہے جیسے ساتھ میں امریکی صدر نہ سہی.. امریکی نائب صدر کھڑا ہے..

کسی نے کہا تھا کہ امریکہ کا صدر بننے کے لیے ذہانت، فطانت اور متانت درکار ہیں اور اگر آپ میں یہ خوبیاں موجود نہیں تو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، آپ نائب صدر بن سکتے ہیں..

○●○●○

''الاسکا میں، ایک جل چکے جنگل میں''

ہارن کی آواز مسلسل اور مضطرب ہوگئی..

سُونج میں مزید صبر کا یارا نہ رہا تھا..

ہم جس منزل کے لیے گھر سے نکلے تھے اُس میں.. الاسکا میں داخل ہوگئے..

ٹیلر روڈ کی خوشنمائی نے چند کلومیٹر تک اپنی رونمائی جاری رکھی اور پھر ہم اُس کی بلندی سے نیچے آ کر ایک ہموار، دور افق میں ایک نامعلوم کی سرمئی کھوہ میں گم ہوتی ایک شاہراہ پر سفر کرنے لگے جو الاسکا کے نادیدہ سحر کے اندر جارہی تھی.

ہم تو جنم جنم سے ڈاسن کریک سے آغاز ہونے والی الاسکا ہائی وے کے مسافر تھے لیکن اب جا کر الاسکا کی موہوم اور دور افتادہ سلطنت کی نیم سرد ہواؤں میں سانس لیتے تھے..

اور یہ شاہراہ جس پر ہماری جیپ کی ہیڈ لائٹس اگرچہ بجھی ہوئی دو آنکھوں کی مانند جو کچھ وہ دیکھتی تھیں اُس کی حیرت سے کھلتی جاتی تھیں..

شاہراہ کے دونوں جانب کناروں پر زرد ہو چکی گھاس کی مصنوعی لگتی سجاوٹ ساتھ چلتی اور گزرتی تھی اور اُس گھاس کے پار دائیں بھی اور بائیں بھی سوختہ ساماں.. جنگل کے جنگل تھے.. جل چکے شجر تھے جو تا حد نظر تھے.. اُن کے سیاہ سوختہ تنے تھے، نہ کوئی پتے تھے اور نہ کوئی نمود کی ہریاول.. وہ سیاہ ہو چکے جل چکے جنگل ہمارے دائیں بائیں سوگواری میں سیاہ گزرتے جاتے تھے.. یہ ایک عجیب آتش زدہ انوکھا منظر تھا.. جیسے وہ کبھی گھنے سرسبز اور گل بوٹوں والے شجر تھے.. بے انت اور لاکھوں کی تعداد میں تھے اور پھر کہیں کوئی چنگاری بھڑکی اور وہ سب کے سب جل کر یوں راکھ ہوئے کہ صرف اُن کے ماتمی تنے باقی رہ گئے..

زرد گھاس کی بناوٹ سے پرے اُس کی سجاوٹ کے پار نذر آتش ہو چکے لاکھوں سوختہ تنوں کی سیاہی کا سوگوار تسلسل وہاں تک تھا جہاں تک نظر سفر کرسکتی تھی..

جُوں جوار کا ایک سینکڑوں میلوں میں پھیلا ہوا کھیت جسے آگ لگا دی گئی ہو اور اب وہاں صرف اُس کے سیاہ سوختہ ٹانڈے بلند تھے..

کوک فرید اکوک جگین را کھاجوار

جد تک ٹانڈا نہ گرے..

یہ الاسکا تھا..

کہا جاتا ہے کہ یہ بے انت سوختہ جنگل ہی الاسکا کی اصل تصویر ہیں..

ان کی سوختہ سامانی کی ایک توجیہہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سرزمین کے بیشتر حصے دلدل کی صورت میں ہیں اور یہاں جتنے بھی شجر اُگتے ہیں اُن کی جڑوں میں پانی کی افراط ہوتی ہے اور وہ باقاعدہ پنپ نہیں سکتے اور زوال پذیر ہو کر یہ شکل اختیار کر لیتے ہیں..

جب کہ دن کی روشنی آسمان پر بادلوں کے بسیرے سے بجھتی ہوئی لگتی تھی آس پاس یہ جل چکے جنگل.. یہ سیاہ ٹانڈے.. جہاں تک نظر جاتی تھی دائیں یا بائیں وہاں تک اور اُن کے درمیان میں ہماری تنہا جیپ قدرے سہمی ہوئی اور متاثر بھی کہ ایسی انوکھی، پُرملال اور سیاہ لینڈ سکیپ دنیا کے کسی اور خطے میں دیکھنے کو نہ ملتی تھی..

ونڈ سکرین پر چند بوندیں پڑیں.. جیسے وہ کرسٹل کی تھیں، سکرین کے فرش پر گریں تو ریزہ ریزہ ہوگئیں..

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' سُونج پر سمیٹتے ہوئے ذرا کپکپانے کی اداکاری کرتی ہوئی بولی..

''الاسکا میں داخل ہونے کے بعد کوئی موسمی تغیر تو رونما نہیں ہوا جو تم ٹھٹھرنے لگی ہو۔''

''محض یہ تصور کہ ہم اب الاسکا میں سفر کر رہے ہیں اور مجھے سردی لگنی چاہیے اس لیے لگ رہی ہے.. بے شک ابھی ہوا میں خنکی کے سندیسے نہیں ہیں.. منجمد کر دینے والی سردی کے پیام نہیں ہیں.. پر ہم حقیقت کی بجائے تصور کے پجاری ہوتے ہیں.. بے شک صحرائے گوبی کی شب میں درجۂ حرارت انجماد سے گر جائے لیکن ہم صرف صحرا کے نام پر پیاسے ہو جاتے ہیں۔ بارشوں کے جنگل میں اگر ایک بوند بھی نہ گرے تو بھی بھیگ جاتے ہیں.. ہم جب سے الاسکا میں داخل ہوئے ہیں تو میں باہر کے بے انت وسعتوں کے حامل مناظر پر نظریں جمائے جاتے ہو کیوں چوکنی بیٹھی ہوں؟''

مجھے اس کے ردِعمل میں یہی کہنا تھا کہ کیوں چوکنی بیٹھی ہو، سو میں نے کہہ دیا..

''اس لیے کہ ابھی میری زندگی کا پہلا، لاڈ کرنے کے لائق ایک موٹا سفید برفانی ریچھ ان جنگلوں میں سے ظاہر ہونے کو ہے۔''

''مجھے گمان ہے کہ شاید آپ نے ہی فرمایا تھا کہ ایسے برف زاروں تک پہنچنے کے لیے جہاں یہ برفانی ریچھ لوٹنیاں لگاتے ہیں ایک پرائیویٹ جہاز کرائے پر حاصل کرنا پڑتا ہے جو ہم نہیں کر سکتے.. ہم صرف الاسکا کے آباد قصبوں اور شہروں کی یاترا ہی کریں گے۔''

''چلو برفانی ریچھ نہ سہی کوئی اسکیمو ہی سہی۔'' اُس نے اور میں نے جان لیا کہ وہ صریحاً اداکاری کرتی خود ہی محظوظ ہو رہی ہے۔ ''اور یہ کمبخت اسکیمو بھی تو وہیں پائے جاتے ہوں گے جہاں ریچھ بقول تمہارے لوٹنیاں لگاتے ہیں تو بھئی اگر الاسکا آئے اور نہ کسی سفید ریچھ کو گلے لگا کر خوب خوب پیار کیا اور نہ کسی اسکیمو سے ملاقات کی تو پھر ہم نے کیا الاسکا دیکھا۔''

''ہاں اگر امریکہ جا کر ایک بھی کاؤبوائے یا گینگسٹر نہ دیکھا.. کینیڈا میں رائل مونٹیز کا ایک بھی گھڑسوار سپاہی نہ

دیکھا.. ہندوستان میں کسی یوگی کو ہوا میں سرسراتے رسّے پر چڑھتے نہ دیکھا.. بنگلہ دیش میں رائل بنگال ٹائیگر نہ دیکھا، چین
میں پانڈا نہ دیکھا اور پاکستان میں.. کے ٹو نہ دیکھا.. تو کیا دیکھا.''

''صحیح..'' اُس نے متانت سے سر ہلایا ''ویسے یہ میری ذاتی آرزو نہ تھی.. جونہی ہماری جیپ پوکر کریک کی سرحد
کے پار ہوئی تھی تو میں نے تمہاری متلاشی آنکھوں میں ایک برفانی ریچھ کو لوٹنیاں لگاتے دیکھا تھا، ایک اسکیمو کے اگلو کی
تصویر دیکھی تھی، منتظر تم تھے، میں نے دراصل تمہاری خواہش بیان کی تھی۔''

''صحیح..'' میں مسکرانے لگا.. وہ میرے دل کی تختی پڑھ چکی تھی..

دور دور تک الاسکا ہائی وے جہاں میلوں تک ناک کی سیدھ میں چلی جاتی تھی اور جہاں پُر پیچ ہوتی دکھائی دے
رہی تھی اُس پر ہمارے ہم سفروں کا کچھ نام و نشان نہ تھا.. اُنہوں نے ہمارا انتظار کرنا مناسب نہ جانا تھا اور جانے کہاں پہنچ
چکے تھے..

ایک خوف سا دل میں اُترتا کسی گوشے میں مکیں ہو گیا، شاہراہ کے دونوں جانب سوختہ سیاہ ٹانڈوں کے
چھدرے جنگل مسلسل چلے جا رہے تھے اور جہاں تک ہم دیکھ سکتے تھے، وہ اس شاہراہ کے گرد ہجوم کرتے دکھائی دے
رہے تھے.. دوپہر کے ڈھلنے سے اُن کے سیاہ سائے آپس میں لپٹتے سوگوار ہوتے تھے جیسے کوئی مرگ واقع ہو گئی ہو اور وہ
ایک دوسرے کو دلاسہ دیتے ہوں.. اور میرے ذہن میں ایک یقین نے آن بسیرا کیا کہ راتوں کو ان کے سوختہ تنوں سے
لپٹ کر جانے کونسی اور کس کس کی روحیں روتی ہوں گی.. ناآسودہ، بھٹکی ہوئی، ناخوش اور شاید عشق میں ناکام روحیں جو
رُوئے زمین پر ازل سے اس لیے بھٹکتی رہیں، کسی ایسے مقام کی متلاشی رہیں جہاں وہ اپنی تشنہ آرزوؤں، روٹھ چکے عشق
اور دکھوں کے ملال میں آنسو بہا سکیں.. تو یہ سوختہ ٹانڈے لاکھوں کی تعداد میں الاسکا کے گدلے آسماں میں سیاہ باریک
ستونوں کی مانند بلند ہوتے.. جہاں نظر ہار جاتی تھی اُس سے بھی پرے کے زمانوں کے انت میں اُترتے ہوئے،
ناآسودہ اور دکھی روحوں کی آہ و زاری کے لیے کیسے مناسب تھے کہ یہ بھی تو یونہی سوختہ نہ ہوئے تھے، یہ لاکھوں جل چکے
شجر.. ان پر بھی تو کوئی افتاد پڑی ہوگی، یونہی تو اُن کے دل جل نہیں گئے ہوں گے.. جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا..
تو کسی عشق خاص کی جدائی میں ہی جل گئے ہوں گے..

یوں بھی یہ صرف شجر ہوتے ہیں جب آپ کے آس پاس سے گزرتے انسانوں کے ہجوم آپ پر گزر جانے
والی قیامت سے آگاہ نہیں ہوتے تو وہ آپ کو ڈھارس دیتے ہیں، آپ اُن سے لپٹ کر آنسو بہا سکتے ہیں اور اپنے غم کو
سہار سکتے ہیں..

بہت برس پہلے.. سوئٹزرلینڈ کے شہر برن کے مرکزی پلازہ میں واقع جیپسی کے شاندار دفتر میں مجھ پر ایک ایسی خبر
آسمانوں سے اُتری تھی جس نے مجھے جلا کر راکھ کر دیا تھا.. میرا چہیتا خالہ زاد بھائی کیپٹن پائلٹ ساجد نذیر نہ صرف اپنے ماں
باپ کا بلکہ پوری برادری کا اکلوتا وارث کوئٹہ میں اپنے ہی جہاز کی آگ میں جل کر خاک ہو گیا.. تب میں ایک ایسے سناٹے
میں چلا گیا کہ سب آوازیں معدوم ہو گئیں.. میری آنکھیں اتنی خشک ہو گئیں کہ اُن میں چنگاریاں پھوٹ سکتی تھیں اور میں
نہیں جانتا تھا کہ میں کس کے ساتھ لپٹ کر روؤں.. اور پھر میں دریا کے کنارے ایک جنگل کے سب سے برگزیدہ شجر کے

تنے کے ساتھ لپٹ کر.. اس کے گرد اپنے بازو حمائل کر کے اتنا رویا تھا کہ اُس شجر کے پتے بھی نمناک ہو گئے تھے..
تو انسان نہیں، شجر آپ کی غم گساری کرتے ہیں..

میں اپنے آپ میں ٹوُنج کی موجودگی سے غافل حساب کتاب کرتا رہا کہ کیا میرے اندر بھی کوئی ایسا دُکھ یا ملال
ہے جو دائمی طور پر گھر کر چکا ہے اور جسے کم کرنے کی خاطر مجھے ایک سوختہ شجر درکار ہے.. اور حسب معمول ٹوُنج نے دل کی
تختی پر رقم سب عبارتیں پڑھ لیں ''وہ کونسے ملال اور رنج ہیں جن کی خاطر تم جیپ سے اُتر کر ان سوختہ درختوں کی سیاہ
کائنات میں اُتر کر کسی ایک تنے کے ساتھ لپٹ کر رونا چاہتے ہو..''

''ٹوُنج بے شک تم یقین نہ کرو لیکن مجھ میں کچھ ملال نہیں، کوئی رنج نہیں اور مجھے رونے دھونے کے لیے الاسکا
کے ان جل چکے تنوں میں سے کسی ایک کے ساتھ لپٹ کر اپنے آنسو اُس میں جذب کرنے کی چنداں حاجت نہیں کہ نہ کبھی
کسی نے مجھے ترک کیا اور نہ ہی بے وفائی اختیار کی.. یوں اردو شاعری کی آہ و زاریاں اور محبوب کی بے اعتنائیاں کم از کم مجھ
پر نہیں گزریں.. مجھے کسی سوختہ شجر کے ساتھ لپٹ کر رونے کی حاجت نہیں ہے..''

''آج تک پوکر کریک کے راستے جتنے بھی سیاح الاسکا میں داخل ہوئے ہیں مجھے یقین ہے کہ اُن میں سے کسی
ایک نے بھی ان جلے ہوئے جنگلوں کے بھیتر میں سفر کرتے ہوئے ایسی دیوانگی کی باتیں تو نہ کی ہوں گی..''

''کوئی اور کیسے کرتا.. کہ اس سے پیشتر میں یہاں نہ آیا تھا.. میری دیوانگی اور حواس باختگی میرے ساتھ چلی
آئی ہے..''

''تم ایک متکبر شخص ہو..''

''میں صرف ایک آگاہ شخص ہوں.. جیسے ایک پیغامبر بچپن سے ہی آگاہ ہوتا ہے۔ تم بے شک ان سوختہ جنگلوں
سے سوال کر لو کہ کیا کبھی ان کے درمیان میں سفر کرتا کوئی مجھ ایسا مسافر بھی ہو گزرا ہے جس نے اُن کے جلے ہوئے تنوں
سے لپٹ کر آنسو بہانے کے امکان پر غور کیا ہو.. میں اکثر امام غزالی کا سہارا لیتا ہوں جنہوں نے کہا تھا کہ جب ایک
درویش کسی جنگل میں جاتا ہے تو اُس کے گُل بوٹے، پتھر اور شجر اُس سے کلام کرتے ہیں.. تو ٹوُنج جان لو کہ یہ سوختہ شجر بھی
مجھ سے ہم کلام ہوتے ہیں..''

''صحیح..'' ٹوُنج نے کچھ اختلاف نہ کیا.. بحث نہ کی کہ اُس کے نزدیک میں اپنے حواس میں نہ تھا.. جیسے ایک مخمور
ہو چکے شخص کے ساتھ بحث فضول ہے ایسے ایک حواس باختہ شخص جو کہتا ہے اُس سے اختلاف کرنا مناسب نہیں ہوتا..

''درست..'' ٹوُنج نے پھر کہا..

وہ جو جبرِ مسلسل کی مانند جل چکا جنگل مسلسل تھا تو جب وہ شاہراہ سے ذرا سرکتا پیچھے ہٹتا گیا تو دائیں جانب چند
نہایت بجھے ہوئے دل والے تنہا مکان نظر آئے.. نقشے سے رابطہ کیا کہ یہ کونسا دیار ہے تو وہ ''چکن'' نام کی ایک بستی تھی۔

شنید ہے کہ ادھر جنگلوں میں اُن دنوں ایک عجیب سا پرندہ Ptarmigan نام کا پایا جاتا تھا اور جب آبادکار
حضرات جو قدرے ان پڑھ تھے، اس کا تلفظ ادا نہ کر سکے تو اُنہوں نے اُسے چونکہ وہ مُرغ سے ملتا جلتا تھا ''چکن'' قرار
دے دیا اور اپنی بستی کو بھی اسی نام سے پکارنے لگے.. یہ بھی سونے کے متلاشی آوارہ گردوں کا ایک پڑاؤ تھا اور آج بھی اس

کی مقامی آبادی پچاس ساٹھ افراد سے تجاوز نہیں کرتی..

اس مریل چکن کے آگے ٹوک تک کا سفر شروع ہوا..

یعنی ہم نے بھی ٹوک رانجھن کی جانا..

اور آگے کوئی ویرانی سی ویرانی تھی.. دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا..

میں تو وادیٔ یُوکان کی کائناتی ویرانیوں اور بے آبادیوں کو روتا تھا، اب الاسکا دیکھ رہا ہوں تو احساس ہوا کہ وہاں خواہ مخواہ روتے دھوتے رہے، مقام تو اب آیا تھا، ویرانیاں اور بے انت ہولناکیاں تو اب نصیب میں آ رہی تھیں..ان کے مقابلے میں تو وادیٔ یُوکان میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا..

سحر طراز سوختہ جنگلوں کی اداس سیاہیاں بھی اب ساتھ نہ تھیں، محض وسعتیں تھیں اور چاند کی سطح ایسی بیابانیاں تھیں..

"یہ الاسکا ہے؟"

سُونج نے میری مایوسی بھانپ لی "یہ الاسکا کا آغاز ہے..ہم نے ابھی طویل مسافتیں اس کے اندرون طے کرنی ہیں..وہاں کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔"

"اگر نہ ہوا تو.."

"تم نے میری منتیں کی تھیں کہ الاسکا چلو..میرے ساتھ چلو..میں تو اپنے فلوریڈا کے روشن آسمانوں میں خوش تھی.."

○●○●○

"ٹوک..بے رُوح، آسیب زدہ..یہاں سے نکل چلیں"

ٹوک بھی آ گیا..

پوکر کریک سے پورے ترانوے میل کے سفر کے بعد ٹوک آ گیا..

امریکہ کی انچاسویں ریاست کی وہ چوکھٹ جس کے پار اصل الاسکا کا آغاز ہوتا تھا..یہاں سے ہماری آج کی منزل فیئر بینک ابھی سوا تین سو کلومیٹر کی دوری پر واقع تھی اور اگر ہم یہاں سے ناک کی سیدھ میں چلے جانے کی بجائے بائیں جانب کی شاہراہ پر رواں ہو جاتے ہیں تو الاسکا کا صدر مقام اینکراتج سوا پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا..

ٹوک بھی الاسکا کی دیگر بستیوں کی مانند نوزائیدہ ہے، ابھی 1942ء میں پیدا ہوا تھا..اور حسب معمول الاسکا ہائی وے کی تعمیر کے دوران وجود میں آیا تھا..ٹوک کے نام کے بارے میں امریکیوں کو بہت شرمندگی رہی..یعنی وہاں جہاں شاہراہ کی تعمیر کے لیے کچھ خیمے نصب کیے گئے..تعمیراتی سامان سٹور کیا گیا اور بے آسرا مزدوروں نے رہائش اختیار کی تو اُسے ایک نزدیکی دریائے ٹوکیو کی نسبت سے ٹوکیو کا نام دے دیا گیا اور یہ دریا آخر ٹوکیو کیوں کہلاتا تھا کہ جاپان سے اس کا تو کچھ واسطہ نہ تھا، اس لیے کہ ادھر ندیاں، چوٹیاں اور دریا اتنی کثرت سے تھے کہ اُنہیں کوئی نہ کوئی نام تو دینا تھا، جو ذہن میں آیا وہی نام دے دیا..جیسے امریکہ میں ایک قصبے کا نام لاہور بھی ہے..لیکن شرمندگی امریکیوں کو یوں ہوئی کہ کچھ مدت کے بعد جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا تو وہ کیسے گوارہ کرتے کہ اُن کے ایک قصبے کا نام دشمن ملک کے صدر مقام پر ہو..تو جیسے اُنہوں نے عراق پر حملے میں ساتھ نہ دینے پر فرانس سے یوں انتقام لیا کہ فرنچ فرائز کو فریڈم فرائز پکارنے لگے ایسے اُنہوں نے فوری طور پر ٹوکیو کو ٹوک کر دیا یعنی جاپانی حملے کا دوٹوک نہیں ایک ٹوک جواب..اِن دنوں امریکی اس نام کی دیگر تاویلیں بھی پیش کرتے رہتے ہیں کہ یہاں کے جو آبائی باشندے تھے وہ اس جگہ کو "پیس کراسنگ" یعنی ٹوک کہتے تھے..یا پھر ان علاقوں کا سروے کرنے والے ایک انجینئر کے کُتے کا نام ٹوک تھا....لیکن اُن سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر پرانے نقشوں میں اس بستی کا نام ٹوکیو کیوں تھا تو وہ آپ سے خفا ہو جاتے ہیں..ویسے یہ حقیقت ہے کہ ٹوک کو "الاسکا کا کُتا صدر مقام" یعنی "الاسکاز ڈوگ کیپٹیل" کہا جاتا ہے..یعنی یہاں برفانی بھیڑیا نما کتے پالے جاتے ہیں اور اُن کی دوڑوں کا اہتمام کیا جاتا ہے..

الاسکا کے اس دروازہ شہر کی آبادی پورے چودہ سو افراد پر مشتمل ہے..میرا خیال ہے کہ اگر یہاں چند درجن پاکستانی، عرب اور بنگلہ دیشی حضرات کھلے چھوڑ دیے جائیں تو اس کی آبادی دن دوگنی اور خاص طور پر رات چوگنی ترقی

کرنے لگے.. آزمائش شرط ہے..

اور جب ہم سرِ شام اس ٹوک میں پہنچتے ہیں اور پوچھتے پھرتے ہیں کہ جناب یہ ٹوک کہاں ہے تو جواب آتا ہے کہ ہونا کہاں ہے، جہاں آپ ہیں، یہی تو ٹوک ہے.. اور جہاں ہم ہیں وہاں پہلی نظر میں تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا.. کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا.. کوئی ایک بندہ کہیں چلتا پھرتا.. اِدھر اُدھر ٹہلتا حرام ہے کہ کوئی ایک بھی نظر آیا ہو.. شاہراہ کے دائیں جانب خاصے فاصلے پر ایک گیس سٹیشن کے آثار ہیں اور وہاں جاتا ایک ٹریلر دھول کے غبار میں گم ہو رہا ہے اور پھر بائیں ہاتھ پر بہت دور کوئی پژمردہ سا اگرچہ جدید طرز کا بھوت بنگلہ نما کوئی موٹل ہے.. جس کے باہر ایک حادثہ شدہ کار کا ڈھانچہ جانے کب سے زنگ آلود ہو رہا ہے.. البتہ بائیں جانب ہی سڑک سے دوری پر ایک مختصر جنگل کے دامن میں ڈھلواں چھتوں کی چند عمارتیں ہیں جن میں سے ایک گفٹ شاپ ہے.. جس کے باہر ایک جہازی سائز کا بورڈ آپ کی توجہ کو مجبور کر دیتا ہے..

"ALL ALASKA GIFTS

T-SHIRTS, JEWLERY, FUDGE

FREE INTERNET, WILD LIFE EXPO

AND COFFEE."

یوں ہم پہلی بار کسی بورڈ پر الاسکا لکھا دیکھتے ہیں تو دل تھوڑا سا دھڑکتا ہے کہ واقعی ہم سچ مچ الاسکا میں ہیں..

اس گفٹ شاپ کے قریب میں دو تین آر وی زیا ریکری ایشنل وہیکلز پارک شدہ ہیں جنہیں گڈ اولڈ انگلینڈ میں کاروان کہا جاتا تھا یعنی چلتے پھرتے کار کے پیچھے بندھے عارضی گھر.. اور یہاں بھی مجال ہے اُن میں بسیرا کرنے والا کوئی سیاح نظر آتا ہو..

ٹوک ایک ایسی بستی تھی.. اگرچہ اسے بستی کہنا مناسب نہیں کہ بستی میں تو لوگ بستے ہیں اور اگر بستے ہوتے تو نظر نہ آتے.. کہ یہاں سرِ شام پہنچنے والے سیاحوں کے دل اس کی ویرانی سے تھم جاتے ہیں..

صرف ویرانی نہ تھی کہ ویرانی کا ایک اپنا طلسم ہوتا ہے.. یہاں ایک اجاڑ پن تھا، ایک ایسی دور افتادگی کا ہول تھا کہ میرا پہلا ردِ عمل یہی تھا کہ صاحب یہاں سے نکل چلو.. اس بستی کا خاموش اجاڑ پن سہا نہیں جا سکتا.. کوئی جن پھر گیا ہے، کسی آسیب کا سایہ ہے، نکل چلو.. یہ ایسا مقام ہے جو زندگی بھر کی محبتوں پر جادو ٹونا کر کے اُنہیں ایک خوفناک خواب میں بدل سکتا ہے.. یہ توہم کا کارخانہ ہے، اس کا کچھ اعتبار نہ کرو، یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے کُوچ کر جاؤ..

یہاں ایک شب بسر کرنا تو کیا چند لمحے بھی قیام کرنا سوگواری کی بلاؤں کو دعوت دینے کے مترادف ہے.. اگر تم اپنی محبتیں یوں سنبھال کر رکھنا چاہتے ہو کہ اُن کے کومل بدن پر بدگمانی کی ایک خراش بھی نہ آئے تو یہاں سے نکل لو..

"مستنصر.." ایک مدت کے بعد اُس نے پھر مجھے میرے نام سے پکارا.. ایک نرم آسودگی اور اُلفت کے رچاؤ کے ساتھ.. "اگر عشقوں اور محبتوں میں ہوس کا عمل دخل نہ ہو تو ٹوک ایسی ہزاروں بستیاں اُنہیں اجاڑ نہیں سکتیں.. یہ تم خود ہوتے ہو جو قدر نہیں کرتے، کسی ایک محبت پر ٹھہرتے نہیں اور پھر کسی بستی کسی مقام کو موردِ الزام ٹھہرا دیتے ہو.. اس میں ٹوک ایسی بستی کا کچھ دوش نہیں ہوتا صرف تمہارا احساسِ جرم ہوتا ہے.. تم بھوک محسوس نہیں کر رہے.. ڈاسن سٹی کے ہوٹل ال ڈے راڈو کے کاؤنٹر بیلون میں ناشتے کے بعد تم نے سارا دن کچھ بھی نہیں کھایا.. مسلسل سفر میں رہے تو کچھ کھانا چاہتے ہو؟"

"مجھے بھوک تو ہے لیکن میں اسے سہار سکتا ہوں.. ٹوک میں نہیں ٹھہرنا.. میرے اندر آسیب اور واہموں کے بوٹے پھوٹتے ہیں جن میں زہرناکی اور بربادی کی بُو ہے.. یہاں نہیں رُکنا.. ذرا اس بستی کی ویرانی سے نکل کر کچھ دور چلتے ہیں، کسی اور مقام پر رُک جاتے ہیں.."

اور اُس لمحے چاندی رنگ کی جیپ جن پاؤں یا ٹائروں پر تھی وہیں ایک دھچکے کے ساتھ رُک گئی.. "میں تمہارے ان مشرقی اوہام پر یقین نہیں رکھتی کہ ٹوک ایک آسیب زدہ اور منحوس بستی ہے.. تم بے شک جیپ میں بیٹھے بھوک سہارتے رہو.. مجھ سے تو بھوک نہیں سہاری جاتی.. میں تو اپنے کُوکتے پیٹ کو بھرنے کے لیے جاتی ہوں.. تم بیٹھے رہو.."

مرتا کیا نہ کرتا.. مجبوراً اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ریستوران کے اندر قدم رنجہ فرمایا ہے تو وہ بھی ایک بے التفات اور روکھا سا مقام تھا.. مقامی معیار کے مطابق کچھ گہما گہمی تھی.. نہ کسی ویٹرس نے ہمیں قابلِ توجہ سمجھا اور نہ ہی انتظامیہ کے کسی فرد نے ہمیں خوش آمدید کہا.. جیسے ہم گاہک نہیں، جھولی پھیلائے نادار سوالی تھے..

وہاں جتنے بھی لوگ تھے اور کتنے کم لوگ تھے ایک دوسرے سے کچھ غرض نہ رکھتے تھے، الگ الگ جزیرے تھے..

میری نظر اُن کے چہروں پر بھٹکتی رہی اور پھر ایک چہرے پر رُک گئی کہ اُس کی شکل جدا تھی.. وہ میرے خطوں کا ہی لگتا تھا.. پاکستانی ہونے کا امکان تھا، ہندوستانی بھی ہو سکتا تھا اور وہ سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا..

میں اُس کی جانب بار بار نگاہ کرتا تھا کہ شاید وہ مجھے اپنا ہم رنگ، ہم جنس یا ہم وطن پہچان کر مجھے ایک مسکراہٹ سے نواز دے پر وہ بظاہر میرے وجود سے غافل سر جھکائے کھانا کھاتا رہا..

ٹوک ایسی معروف بستی تو نہ تھی جہاں اگر ایک ہم وطن یا ہم جنس تمہارے سامنے آ جائے تو تم والہانہ طور پر اُس کی جانب نہ بڑھو، یہ نہ پوچھو کہ آپ کہاں.. یہاں الاسکا میں.. تو کیسے.. لیکن وہ قطعی طور پر متوجہ نہ ہوا اور پھر مجھے گمان گزرا کہ اُس کی بے توجگی میں ملاوٹ تھی.. وہ چاہتا ہی نہ تھا کہ وہ دیکھا جائے.. شاید ایک غیر قانونی شخص جو مجھے دیکھ کر چوکنا ہو گیا تھا کہ ہائیں یہ مجھ ایسا کوئی اور یہاں ٹوک میں کیسے آ گیا، کہیں میرا پول نہ کھل جائے..

کچھ نہ کچھ پردہ داری تھی ورنہ اس بے اعتنائی کا کچھ جواز نہ تھا..

اس ریستوران کا جتنا بھی عملہ تھا "درآمد" شدہ تھا.. اُن کی شکلوں میں اس مقام کے لیے اجنبیت تھی اُلفت نہ تھی.. منیجر، کچن سٹاف، ویٹر اس ٹوک کی بستی میں جانے کہاں کہاں سے صرف اس لیے آئے تھے کہ یہاں اس کی دور افتادگی کے باعث اُنہیں اجرت تقریباً دوگنی ملتی تھی ورنہ وہ اپنی مرضی سے یہاں ایک شب بھی نہ ٹھہرتے..

کیا ٹوک اتنا بے رُوح اور آسیب زدہ تھا.. ہاں تھا!

"نکل چلیں؟"

کُونج نے اپنی سیزر سلاد کا آخری پتہ اپنے کانٹے میں پرو دیا اور پھر چونچ تلے چبا کر اُسے نگلتی ہوئی بولی "ہاں چلیں۔"

○●○●○

"ہم جنگلوں کی ہریاول میں حنوط ہوتے ہیں.. اور بُل موز کا بابا شکاری"

ٹوک کی مردہ ویرانی میں سے ہم یوں نکلے جیسے موت کی کوٹھڑیوں کے قیدی بھی یوں فرار نہ ہوتے ہوں گے اور جب ہم اُس کے ڈراؤنے ویرانے میں سے باہر آئے تو منظروں نے کروٹیں بدلیں.. کچھ سے کچھ ہونے لگے.. اُس اترتی شام میں چار چفیرے کے جنگلوں کے سارے شجر جو گھناوٹ میں اِک دوجے سے لپٹے کھڑے تھے، کسی نہایت دھیرے سے پہلو بدلتی ہوا کے زور سے قدرے خم ہوئے اور ہم پر جھکتے چلے آئے.. جیسے وہ مائیں تھیں، ہمیں آغوش میں لے کر ہم بچوں کے بدنوں میں ٹوک کے جو خوف ہمارے ساتھ چلے آئے تھے اُنہیں زائل کر دینا چاہتی تھیں.. ان ہم پر جھکے جھکے جنگلوں کے دامن میں کسی جھیل کے پانی تھے جو ان کی سرسبز دیواروں میں کہیں کہیں شگاف ڈالتے، جھانکتے اور روپوش ہو جاتے.. آسمان بھی اسی چھپن چھپائی کھیلتی جھیل کی مانند کبھی کبھی ظاہر ہو جاتا.. یہ جو آس پاس سے اُمڈتے ہم پر یلغار کرتے زہر مورا رنگ کے گہرے کائی زدہ پانی ایسی گھنی ہریاول کے اشجار تھے وہ ہمارے سروں پر جھومتے آتے اور کبھی اُن میں کوئی شگاف ہوتا تو آسمان کی ایک جھلک دکھلا دیتا.. ہم ساون کے اندھے تھے، ہمیں ہر جانب ہرا ہرا ہی سوجھتا تھا.. اُس دبے پاؤں کی بلّی کی مانند بے آواز اترتی شام میں ٹوک سے فرار ہونے کے بعد ہم ایک ایسے منظر میں چلے گئے جو سارے کا سارا جنگلوں کے گھنے پن میں یوں ڈھکا ہوا تھا، آپس میں یوں گتھم گتھا ہو رہا تھا کہ جانے شجر سانس کیسے لیتے تھے اور کچھ بعید نہ تھا کہ وہاں الاسکا کے سرد موسموں میں پنپنے والے جو شجر تھے، اُن کے تنوں سے لپٹی سبز جھاگ بیلیں تھیں، وہ ہماری جیپ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتیں.. وہ شجر اور سبز جھاگ بیلیں ہمارے بدنوں کے ہر ہر مُو میں جڑیں پکڑ جاتے اور یوں ہماری جیپ، کُونج کا سفید بدن اور میں بھی اُن اُمڈتے جنگلوں کا ایک حصہ بن جاتے.. وہ جنگل ہم ہو جاتے اور ہم وہ جنگل ہو جاتے..
اور یہ جو خودرو بیلوں کی سبز جھاگ ایسی ہریاول تھی، ظاہر ہے جیپ کے ٹائروں کے گرد بھی لپٹ جاتی اور جیپ تھم جاتی.. وہ تھمتی تو اُن بیلوں کی ہمارے بدنوں پر یلغار زیادہ ہو جاتی.. وہ ہمارے گرد لپٹتی جاتیں اور ہمیں ایک مصری ممی کی مانند ہریاول میں حنوط کر دیتیں..

اور پھر اگلی سویر ٹوک سے کوئی کار یا جیپ نکلتی تو اس مقام پر آ کر اُس میں سوار مسافر ششدر رہ جاتے کہ الاسکا ہائی وے کے عین درمیان میں ہرے بھرے پتوں اور بیلوں کا ایک انبار پھوٹ رہا ہے، جس کی بناوٹ سے یوں لگتا ہے کہ وہ ایک.. ممکن تو نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہ ایک جیپ کی شکل اختیار کر گیا ہے اور اُس کے اندر..
ایک خزاں رسیدہ چنار ہے جس کی زردی اور برسوں کی کہولت کو تر و تازہ بیلوں اور بوٹوں نے یوں ڈھانپ رکھا

ہے کہ صرف اُس کی آنکھیں دکھائی دے رہی ہیں جن میں اگر کوئی دھیان کرے تو گزر چکے برسوں کے چہرے اور منظر دُھندلاتے ہیں..
اور اُس کے برابر میں ایک ایسا شاندار پرندہ ہے جو ایک سی مُرغ سے بڑھ کر شوکت اور شان والا ہے اور اُس کی سفیدی بھی ڈھکی ہوئی ہے اور وہ چونچ سے پنجوں تک ہرا ہی ہرا ہے..
وہ دونوں سبزے میں حنوط ہو چکی جیپ میں حنوط پڑے ہیں، ایسے کہ اُن میں پھر سے آنکھیں جھپکنے یا زندہ ہو جانے کی کوئی رمق باقی نہیں ہے..
آؤ مجھے حنوط کرو..
ایک آوارہ گرد تو گھر سے نکلتا ہی اس آرزو میں ہے کہ وہ کہیں حنوط ہو جائے.. اگر کوئی سحر نشیں منظر اُس کے سامنے کھلتا ہے تو وہ خود التماس کرتا ہے کہ مجھے حنوط کر دو.. ایک نارمل حیات بسر کرنے والا شخص اگر کبھی اُس پر جنگل یلغار کر دیں، اُمڈتے چلے آویں، اُسے گھیرے میں لے آویں تو اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ شتابی سے اُن کی گرفت میں سے نکل جاتا ہے تا کہ کھلی فضا میں جا کر سانس لے سکے جب کہ وہ جو قدرت کے معجزوں کے پجاری ہوتے ہیں اُن کے سامنے سرنگوں ہو کر درخواست کرتے ہیں کہ.. آؤ مجھے حنوط کرو.. ہمیں گمان تھا کہ جیپ اور ہم دونوں ہریاول میں حنوط ہو چکے ہیں لیکن جیپ بدستور رواں تھی اور ہم.. سفر میں تھے..
"تم نے پوچھا تھا ناں کہ یہ ہے الاسکا؟" کُونج اپنی ہریاول حنوطگی میں سے زندہ ہوئی "تو یہ ہے الاسکا"
یہاں سے آج کی شب کا پڑاؤ فیئر بینک کتنی دوری پر تھا.. ہم جانتے تھے کہ تقریباً سوا تین سو کلومیٹر کی مسافت پر کہیں تھا اور شام گہری ہو رہی تھی، پر کسے پرواہ تھی.. نہ آئے فیئر بینک، ہم تو سفر کرتے تھے..
نہ صرف زندگی کی بلکہ بدن کی بہت سی ایسی فضول اور فاضل مجبوریاں ہوتی ہیں جو ایسے خوابناک مناظر کے رومان کو تہس نہس کر دیتی ہیں.. اُن میں ایک مجبوری پانی کے بوجھ کی ہوتی ہے جس کا وزن عمر کی مناسبت سے بڑھتا جاتا تھا..
شاید یہ اُس ملک شیک کا کیا دھرا تھا جو میں نے ٹوک کے ریسٹوران میں بصد شوق پیا تھا کہ بوجھ پڑنے لگا تھا.. میں خاصی دیر ضبط کیے بیٹھا رہا کہ ایک کُونج، ایک صنف نازک سے کیسے یہ کہا جائے کہ رُکو کو.. منظر کے لیے نہیں میرے کمزور مثانے کے لیے..
ایسے موقعوں پر میں شدید پچھتاتا کہ اپنے ہمراہ کسی کو لانا تھا تو ایک مرد کُونج کو لے آتا.. نسوانیت کے اپنے آداب ہوتے ہیں..
میرے ایک دوست کے ہاں لگا تار اور دھڑا دھڑ بیٹے پیدا ہوتے چلے گئے اور جب لاکھ تعویذ دعاگوں اور منت مرادوں کے بعد بالآخر ایک بیٹی نے جنم لیا تو میں نے اُس سے پوچھا کہ تمہارے گھر میں اور رہن سہن میں بچی کی پیدائش کے بعد کیا فرق پڑا ہے تو وہ کہنے لگا کہ میں پہلے کی مانند بے دریغ اپنے بیڈروم میں کپڑے نہیں بدلتا کہ وہ وہاں سوئی ہوتی ہے اور میرے بیٹے بھی بہن کی موجودگی میں اپنی نیکریں سنبھال کر رکھتے ہیں..

تو اسی طور ٹوونج کی موجودگی میں بھی میں اپنی نیکر سنبھال کر رکھتا تھا..لیکن اب میں بوجھ سے بہت ہی مجبور ہوا جاتا تھا اور نیکر گرنے کو آتی تھی..

"جاؤ.." ٹوونج نے جیپ کے رُکتے ہی مجھے حکم دیا کہ وہ میرے بوجھ کو جان گئی تھی۔ "جو کرنا ہے کرو اور آؤ..تا کہ ہم سفر جاری رکھ سکیں کہ فیئر بینک ابھی بہت دور ہے۔" الاسکا کے طول و عرض میں شاہراہوں اور ویرانوں کے کناروں پر بھی ہر دس بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایسی بوجھ مجبوری سے فراغت حاصل کرنے کے لیے نہایت ستھرے اور مناسب بندوبست ہوتے ہیں..

شاہراہ کے کنارے پر ایک پارکنگ ایریا تھا اور اُس سے ذرا پرے درختوں کے ایک جھرمٹ میں چند کیبن ایستادہ تھے اور وہ ایک ایسی کھائی کے کنارے پر معلق تھے، جس کے نیچے بہت نیچے ایک دریا شور تو کرتا تھا پر اُس کی شوریدگی یہاں اس بلندی تک نہ آتی تھی..

اور کیبن زنانہ الگ اور مردانہ الگ..

شام تو ہو رہی تھی لیکن اتنی گہری اور گمبھیر نہ ہوئی تھی کہ مجھے نابینا کر دیتی لیکن ابھی کچھ دیر پہلے جو میں حنوط ہوا تھا اُس ہریاول کا کچھ اندھیرا میرے ساتھ چلا آیا تھا اور میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا اُس مردانہ کیبن کی جانب بڑھتا تھا جب مجھے معاً خیال آیا کہ بابا جنگل بیابان ہے اور وہ بھی الاسکا کے ویرانے ہیں تو ان میں جنگلی حیات کی خاصی کثرت ہے تو کیا معلوم کوئی ایسا پیٹو ریچھ جس نے درجن بھر تڑپتی سالمن مچھلیوں کو نگل لیا ہو اور اُس کا پیٹ خراب ہو گیا ہو اور وہ بھی ایک ایمرجنسی میں فوری فراغت کی خواہش میں اِدھر آ نکلا ہو اور اب اس مردانہ واش روم میں جو ایک نیم تاریکی میں روپوش تھا، استراحت فرماتا فارغ ہو رہا ہو..میں ذرا جھجکا اور رُک گیا..

رُکا ہوں تو جیپ میں بیٹھی ٹوونج نے..جو مجھ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی سرزنش کے لہجے میں مجھے پکارا" جاتے کیوں نہیں.."

میں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"ریچھ..ہو سکتا ہے۔" وہ چونچ کٹکٹاتی کُرلانے لگی "اگر ہوا تو اپنے سے کہیں بھاری بھرکم توندیلے ریچھ کو دیکھ کر فرار ہو جائے گا۔ ٹائلٹ پیپر استعمال کیے بغیر..یقین کرو۔"

ایک تو بڑھتی عمر کا سیاپا اور اُس پر قدرے موٹاپا..تو مجھے اسی نوعیت کا کامپلی منٹ تو ملنا ہی تھا..کاش کہ ٹوونج نے مجھے اُن زمانوں میں دیکھا ہوتا جب جھیل جنیوا کے کناروں پر میں صرف ایک نیلی جین میں ملبوس کھڑا مسکراتا تھا اور میرا یہ توندیلا پیٹ ایسا ہموار ہوا کرتا تھا جیسے ایک چیتے نے اپنا سانس اندر کھینچ رکھا ہو..اور ایک ہرن پر حملہ آور ہونے کو ہو..پر وہ مجھے اُن زمانوں میں کیسے دیکھ سکتی تھی جب وہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھی..

میں دل ہی دل میں اس بدتمیز ٹوونج کو کوستا کیبن کے اندر چلا گیا..اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایک فربہ سا سایہ حرکت کرتا نظر آیا اور میری تو جان ہی نکل گئی..گھگھیا کر دوہائی دینے کو تھا کہ احساس ہوا کہ سایہ تو دیکھا بھالا ہے..میرا مطلب ہے دیکھا بھالا ہے یعنی اپنا ہی ہے..بہرطور اُس نیم تاریک کیبن میں جتنی دیر رہا، کھٹکا سا لگا رہا..اور جب میں

بوجھ سے نجات حاصل کر کے فرحاں و شاداں جیپ کی جانب بڑھنے کو تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گہرائی میں جہاں دریا بہتا تھا، اُس کے نشیب میں سے ایک بزرگوار، ایک انگریز ارسٹوکریٹ کی مانند ٹوئیڈ کے چیک کوٹ میں، برجس اور فل بوٹوں میں اور سر پر جو ترچھا اونی ہیٹ ہے، اُس میں ایک سُرخ پَر سجا ہے، ہاتھوں میں ایک بندوق تھامے اوپر آ رہے ہیں اور اُن کے پیچھے پیچھے اُن کی ادھیڑ عمر اہلیہ بھی ہانپتی لرزتی چڑھتی آ رہی ہے..وہ بزرگوار بندوق کی نالی سیدھی کیے میری جانب چلے آئے اور اس سے پیشتر کہ میں دونوں ہاتھ بلند کر دیتا کہنے لگے "ہا..ہم نے تمہاری جیپ کو رُکتے دیکھ لیا تھا..ہم جانتے ہیں کہ تم منظر پر نظر کرنے کے لیے نہیں ان غسل خانوں سے استفادہ کرنے کے لیے رُکے ہو..بہت دنوں سے کسی اجنبی سے بات نہیں کی تو ہم بارہ سنگھے کا تعاقب ترک کر کے تم سے گپ لگانے کے لیے اوپر چلے آئے..یہ میری بیوی ہیں ایلس..اور میں ہیری ہوں.."

معلوم ہوا کہ دونوں میاں بیوی رہائش تو کہیں اور رکھتے ہیں لیکن گرمیوں میں آس پاس کے جنگل میں کہیں گھر بنائے بیٹھے ہیں کہ شکار کے شیدائی ہیں..

"اس شخص نے آج مجھے بہت خجل و خوار کیا.." اُن کی بیگم نے ایک لاڈ بھرے لہجے میں شکایت کی۔ "کہنے لگا کہ میں نے نیچے دریا کے کنارے ایک دیوزاد بارہ سنگھے کو پانی پیتے دیکھا ہے اور میں اُسے شکار کر کے رہوں گا..پوری دوپہر بھٹکتے رہے، مجھے چلا چلا کر ادھ موا کر دیا اور وہاں بارہ سنگھا تو کیا کوئی مریل سا خرگوش بھی نظر نہیں آیا۔" اس پر بڑے میاں نے تمباکو نوشی سے بھوری ہو چکی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے قدرے شرمندگی سے کہا "ٹھیک ہے میری نظر کچھ کمزور ہو گئی ہے لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہاں ایک ایسا شاندار بُل مُوز تھا جیسا میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا..بس ہمیں نیچے دریا تک اُترتے اُترتے تاخیر ہو گئی اور وہ شاید ہماری بُو سونگھ کر فرار ہو گیا..ینگ مین کیا تم جانتے ہو کہ بُل موز انتہائی ذہین اور شاطر حیوان ہوتا ہے۔"

اُس کی نظر کچھ نہیں بہت کمزور تھی جو مجھے ینگ مین کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ شام بھی تھی..آس پاس جنگل بھی تھے..سائے بھی تھے تو اگر اُسے میں ایک ینگ مین دکھائی دیا تھا تو اُسے یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ بڑے میاں ہم بھی ایک بڑے میاں ہیں۔ "میں تو پہلی بار الاسکا آیا ہوں بلکہ آج ہی آیا ہوں تو یہاں کے جو بُل موز ہیں اُن کے بارے میں میری معلومات قدرے محدود ہیں۔"

اُن دونوں نے نہایت اشتیاق سے مجھے ان الاسکن بارہ سنگھوں کی خصلت، عادتوں، خوراک، نفسیات یہاں تک کہ اُن کی جنسی زندگی کے بارے میں بتایا کہ وہ کون سے مہینوں میں گرمی پر آتے ہیں اور اُن دنوں اُن کا پیچھا کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے یعنی اُسے بارہ سنگھی کا وصل حاصل نہ ہو تو وہ آپ کی جانب پلٹ پڑے..اور یہ کہ ان دنوں میں صرف الاسکا کے باسیوں کو ان کے شکار کی کھلی اجازت ہوتی ہے ورنہ یہ جو امریکی وغیرہ اِدھر آتے ہیں، اُنہیں تو شکار کے لیے لائسنس حاصل کرنا پڑتا ہے..اور ہم الاسکن ہیں۔

امریکہ کی کُل انچاس ریاستوں میں سے الاسکا سب سے آخر میں آتا ہے..ویسے تو ہر ریاست کا باشندہ دیگر ریاستوں کے رہنے والوں کو اپنے مقابلے میں حقیر اور اجڈ جانتا ہے..اُن کی خوراک، لباس اور روایتوں کا مذاق اڑاتا ہے

لیکن یہ جو الاسکن ہیں اُن سے اگر آپ یہ پوچھ بیٹھیں کہ آپ امریکی ہیں تو وہ خفا ہو جاتے ہیں۔ جیسے سکاٹ لینڈ کے کسی شخص سے کہہ دیں کہ آپ انگریز ہیں تو وہ لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتا ہے.. چونکہ یہ ایک بچھڑی ہوئی ریاست ہے، پورا امریکہ ایک طرف اور پھر کینیڈا کے پار اُس سے بہت دور الگ تھلگ الاسکا.. تو قابل فہم طور پر یہاں کے برفانی موسموں کے سینے والے لوگ مین لینڈ امریکہ سے کچھ یگانگت محسوس نہیں کرتے کہ وہ اُس سے جڑے ہوئے نہیں ہیں.. جیسے وادیٔ یُوکان کے باسی کینیڈا کا ایک حصہ ہونے کے باوجود یُوکانی کہلانا پسند کرتے ہیں، ایسے یہ بھی اپنا تعارف ایک امریکی کے طور پر نہیں ایک الاسکن کی حیثیت سے کروانا پسند کرتے ہیں۔ یہاں کے موٹلوں، ریستورانوں، شراب خانوں وغیرہ میں کچھ ایسے ہوں گے جن کے باہر ایک پُرفخر بورڈ آویزاں ہوگا کہ یہ ریستوران یا موٹل خالص الاسکن ہے یعنی محض کاروبار کرنے اور دولت سمیٹنے کی خاطر باہر سے آنے والے امریکیوں کی ملکیت نہیں ہے جو گرمیوں کے موسموں میں ادھر آتے ہیں اور جونہی سرما کا آغاز ہوتا ہے، جھولیوں میں ڈالر بھر کر واپس امریکہ چلے جاتے ہیں۔

حسب توقع اُنہوں نے نہایت اچنبھے اور خوشدلی سے اقرار کیا کہ تم الاسکا میں ہمارے پہلے پاکستانی ہو۔

جب میں نے اُنہیں بتایا کہ میں فیئر بینک کا مسافر ہوں تو وہ میرے لیے فکرمند ہو گئے۔ ''تمہارے سامنے ایک طویل جنگلوں بھرا پُرخطر راستہ ہے اور رات ہو رہی ہے.. تمہیں روانہ ہو جانا چاہیے..''

اور آخری فقرہ اُن بزرگوار کی جانب سے آیا.. ''یقین کرو وہاں ایک بُل موز تھا نہایت عالی شان بناوٹ والا..''

○●○●○

''ہر شے میں سے اداسی نکل آتی ہے''

ٹونج پھر روٹھ چکی تھی اور میں نے اُس کو منایا نہیں روٹھا رہنے دیا..

باہر، جب جیپ اُس پارکنگ ایریا سے نکل کر شاہراہ پر رواں ہوئی تو باہر رات تھی اور اُس کے اندھیر پن میں جو شک کرے وہ خود اندھا ہوگا.. جانے باہر کونسے اندھیارے اور ویرانے تھے جن میں ہماری جیپ تن تنہا اپنی روشن ہو چکی آنکھیں کھولے شاہراہ کو منور کرتی ہمیں راستہ دکھاتی تھی..

نقشے کے مطابق کوئی تنانا دریا تھا جس پر کوئی قابلِ دید پُل تھا جس پر سے ہم گزر گئے اور کہیں جنوب میں الاسکا کی برفانی بلندیاں رات میں روپوش تھیں.. جو سرکتی جاتی پیچھے رہتی جاتی تھیں..

اور ہاں.. وہ جو ہمارے گروپ کے سیاحوں کا ٹولہ تھا جو ہمیں پوکر کریک میں ترک کر کے چل دیا تھا، وہ ٹوک میں ہمارے منتظر تھے اور اب وہ ہم سے کہیں آگے نکل چکے تھے یا شاید پیچھے رہ گئے تھے..

یہ جو رات کے سفر ہوتے ہیں.. آپ ایک بس میں سوار ہیں جو ارضِ روم سے شام کی سرحد کی جانب جا رہی ہے اور راستے میں ڈرائیور بس روک دیتا ہے کہ زلزلہ آ رہا ہے.. یا آپ مائک ملر کی سپورٹس کار میں کچھ آسٹریلین بطخوں کے ہمراہ مشرقی جرمن میں سے گزرتے برلن جا رہے ہیں اور رات کے گھپ اندھیروں میں چلے جا رہے ہیں یا پھر لاہور سے کراچی ایک ٹرین میں سوار اُس کے ڈبوں کے جھولنے سے شب کی سیاہی میں جھولتے جا رہے ہیں تو شعور کی حاضری معدوم ہو جاتی ہے اور لاشعور کے شعبدے جنم لینے لگتے ہیں.. ایک تھکاوٹ بھری اونگھ میں آپ کو اپنے دوستوں اور گزر چکی محبتوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں.. آپ اپنی نشست پر مسلسل سفر کی اونگھ میں جھولتے مسکرانے لگتے ہیں تو جب ہم ٹوک سے نکل کر اُن کیبنوں کے قریب رُک کر دوبارہ سفر اختیار کرتے ہیں تو اُس رات میں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہمارے پیچھے چلا آتا ہے..

ہمارے تعاقب میں ہے..

جو کوئی بھی ہے چُپ چاپ چلا آتا ہے اور اگر ایک جیپ میں ہے تو اس نے ہیڈ لائٹس بجھا رکھی ہیں، تاریکی میں چلا آتا ہے۔

یہ اداسی تھی جو چُپ چاپ ہمارے تعاقب میں چلی آتی تھی..

مجھے نہیں معلوم کہ اس کا سبب کیا تھا.. اپنے گھر سے دوری اور اپنے پیاروں سے جدائی تھی.. کیا تھا..

لیکن میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔ مجھے سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی تو
گونج فکرمند ہوگئی "آر یُو اوکے.."

"ہاں.. میں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے اپنے سفید پَر پھڑپھڑائے۔ "تم نہیں جانتے کہ جو تم پر گزرتی ہے میں فوری طور پر اُس سے آگاہ ہو جاتی ہوں.. تم یکدم اپنے آپ میں غافل ہو گئے ہو.. جیسے تم جو کچھ تمہارے تعاقب میں ہے اُس سے غفلت برت رہے ہو تو وہ کیا ہے؟"

"اداسی.."

"اور اس اداسی کا سبب.."

"میں جو کچھ کھولتا ہوں اُس میں سے اداسی نکل آتی ہے.."

"کیا کھولتے ہو مستنصر؟"

"ایک تن تندور ہے جس کے اندر جب کبھی میں ایک ماچھن ایک روٹیاں لگانے والی کی مانند جھانکتا ہوں تو وہاں بھی اداسی کی ایک خاموش آگ جلتی ہے.."

گونج نے نہ میری ذہنی حالت پر شک کیا اور نہ ہی وہ مجھ سے حسبِ معمول خفا ہوئی.. نہایت تحمل سے مجھے سنا.. "تم جو کچھ کھولتے ہو اُس میں سے اداسی نکل آتی ہے.. تو کس کی اداسی.."

"تم بے شک یقین نہ کرو لیکن دنیا کے ہر ایئرپورٹ پر.. دبئی، قطر، ماسکو، برلن، ٹورنٹو، نیویارک، کیلگری یا روم میں جب کبھی میرا سامان کھولا گیا.. کسٹم کے اہلکاروں نے اُسے اتھل پتھل کیا تو کبھی کچھ بھی برآمد نہ ہوا سوائے اداسی کے.. اور وہ میری ہر ذاتی شے میں جاگزیں ہوتی تھی، میری قمیضوں، بنیانوں، جرابوں، نوٹ بکس اور سادہ کاغذوں میں سے.. اداسی برآمد ہونے لگتی تھی.. اور اگر ایک مسافر کے سامان میں سے اداسی برآمد ہو جائے تو یہ کوئی قابلِ تعزیر جرم نہیں ہوتا اس لیے مجھے جانے دیا جاتا تھا.. اگر اداسی پر قدغن ہوتی تو میں اب تک متعدد بار تختۂ دار پر لٹکایا جا چکا ہوتا.. اور گونج اگر تم جیپ کے بیک ویو مرر میں دیکھو تو ٹوک سے فیئر بینک کی جو شاہراہ پیچھے رہتی جاتی ہے، اُس پر اداسی ہے جو ہمارے پیچھے پیچھے چلی آتی ہے.. اُس سے فرار ممکن نہیں، ہاں میری خواہش ہے کہ وہ اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر لے تاکہ مجھے اندازہ تو ہو کہ وہ کتنے فاصلے پر ہے.. یونہی تاریکی میں چلی آتی ہے۔"

○●○●○

"دائرہ قطب شمالی کے قریب فیئر بینک میں دربدر"

بارش تیز ہو چلی تھی..

تب، جب ہم ابھی فیئر بینک سے طویل فاصلے پر نابینائی کے گھنے جنگلوں میں سفر کرتے چلے آتے تھے تب ونڈ سکرین پر کچھ چھینٹے گرے تھے لیکن اب بارش مسلسل گرنے لگی تھی، اداسی کے جام میں اگر بارش کی چند بوندیں ٹپک جاویں تو معاملہ دو آتشہ ہو جاتا ہے، جو کہ ہو گیا..

شہر کے آثار نہ تھے پر ہم فیئر بینک میں داخل ہو چکے تھے.. نہ کوئی روشن ایونیو.. نہ بلند و بالا عمارتیں، نہ ہی فٹ پاتھوں پر کوئی رونق۔ جیسے ایک جنگل سے نکلے تو ایک اور نسبتاً کم تاریک جنگل میں آ گئے..

ونڈ سکرین پر گرتے پانیوں کو سمیٹنے کی سعی میں وائپر پاگل ہوئے جاتے تھے اور ہم اس شہرِ بے چراغ میں شب بسری کا کوئی ٹھکانہ ڈھونڈتے تھے.. اور وہ ملتا نہ تھا، ایسے میں ہم ایک شبِ فراق کو گھر بھی نہ لے جا سکتے تھے گھر ملتا نہ تھا..

الاسکا کے اس ٹریول گروپ کے سفری بندوبست میں کسی بھی مقام پر پہنچ کر کوئی طے شدہ رہائش گاہ منتظر نہ ہوتی تھی، ہمیں کوئی موٹل یا ہوٹل خود تلاش کرنا پڑتا تھا.. کہ یوکان اور الاسکا کی وحشت کو آپ ایک تنظیم میں قید نہیں کر سکتے تھے.. ان کی بیابانیوں میں بسون کا کوئی ریوڑ آپ کا راستہ روک سکتا تھا.. کوئی تند خُو ندی آپ کے سامنے کے راستے کو آپ کی نظروں کے سامنے بہا لے جا سکتی تھی.. آپ کے سارے ٹائر پنکچر ہو سکتے تھے اور سینکڑوں کلومیٹر تک کوئی پنکچر لگانے والا موجود نہیں.. تو آپ طے نہیں کر سکتے تھے کہ فلاں شب آپ نے بہر طور فلاں بستی میں بسر کرنی ہے.. اسی لیے جہاں کہیں پہنچتے تھے تو یہی سوال اٹھتا تھا کہ.. چن کتھاں گزاری آ رات وے.. اور چاند ہر موٹل میں جھانکتا تھا اور کہیں بھی گنجائش نہ تھی "نو ویکنسی" کے نیون سائن بھڑکتے ہمیں قبول کرنے سے انکاری ہو جاتے تھے..

دنیا کے آخری سرے پر معلق الاسکا کے اُس شہر میں جو الاسکا کا بھی آخر کہلاتا ہے وہاں ایک بھیگتی رات میں دربدر بے آسرا ہونا.. اور وہ بھی ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ کے سرخ اور زرد معجزوں کے رنگوں میں رنگے ہوئے اور پھر ٹوک کی پژمردگی سے بجھے ہوئے.. اور پھر ہریاول سے حنوط ہونے کے بعد یوں دربدر ہونا، ایک چھت کی تلاش میں بھٹکنا ایسے کہ اداسی بھی آپ کے پیچھے پیچھے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کیے بغیر چلی آتی ہے اور آپ کا بدن تھکن سے یوں لاچار جیسے اُس کی عمارت کی بوسیدہ اینٹوں کو ایک بُل ڈوزر سے مسمار کر دیا گیا ہو..

ایسی بے سروسامانی اور بے گھری کی کیفیت آوارگی کے زمانوں میں بہت سی شبوں میں مجھ پر اُتر چکی تھی.. کبھی

لیکن اُن زمانوں میں ایسی بے گھری میں ایک عجیب اشتعال انگیز خمار ہوا کرتا تھا
ارض روم میں اور کبھی ثوریا کی گرم شب میں بچھا کر آس پاس گزرتی مخلوق کا پُر شوق مشاہدہ کیا اور پھر لمبی تان کر
کہ پروائے ننگ و نام تھی.. کسی فٹ پاتھ پر سلیپنگ بیگ بچھا کر... کچھ میسر نہ ہوا تو رک سیک سے ٹیک لگا کر آنکھوں آنکھوں میں رات گزار دی اور تاروں کو
سو گئے.. کسی جنگل میں پڑ رہے.. بقول ظہیر کاشمیری..
دیکھا کیے.. پردہ اور زمانے تھے جب....

قدم قدم پہ جنوں اختیار کرتے تھے
شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے

اور اِن زمانوں میں.. ایسی صعوبتیں سہارنے کی سکت ہی نہ رہی تھی اور وہ بھی الاسکا کی ایک نم آلود شب کی بے گھری میں.. ایک ایسے شہر میں جہاں سے آرکٹک سرکل صرف تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا..

اور جب ہمیں کسی بھی درمیانے درجے کے موٹل میں جگہ نہ ملی.. دو گز زمیں بھی نہ ملی اس کوئے الاسکا میں تو کہیں سے تازہ خبر آئی ایک اچھی خبر آئی کہ ایک ہوٹل میں کمرے میسر ہیں اور بُری خبر یہ تھی کہ یہ فیئر بینک کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں سے تھا اور وہاں کمرے وغیرہ نہیں بلکہ سٹوڈیو اپارٹمنٹ نوعیت کی رہائش مل سکتی تھی یعنی ایک وسیع بیڈ روم.. ایک اُس سے فراخ ڈرائنگ روم، لونگ روم اور ملحقہ باورچی خانہ جس میں پکوان پکانے کے مکمل لوازمات تھے.. ڈنر سیٹ اور وائن کے نازک گلاس بھی آپ کے ذوقِ جمال کے مطابق.. اور ظاہر ہے وہاں شب بسری کا کرایہ ہوش رُبا تھا.. لیکن تھکاوٹ اور دربدری کا وہ حال تھا کہ ہم اپنی کُل جمع پونجی صرف ایک چھت کے حصول کے لیے داؤ پر لگا سکتے تھے.. جو ہم نے لگا دی..

''سوفی سٹیشن ہوٹل.. 1717 یونیورسٹی ایونیو، فیئر بینک الاسکا 99709''

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے..
جیسے کسی دشتِ مرگ کے کناروں پر سفر کرتے پیاسے ہرنوں کو ہرات کا شہر نظر آ جائے جہاں چنار کے شجروں تلے سر ندیاں بہتی ہوں اور اُن چناروں میں پوشیدہ بہزاد مصور کے پرندے چہکتے ہوں..

ایسے فیئر بینک کی بے مہر اور بے آسرا بھیگی ہوئی رات میں جب ہم سوفی سٹیشن ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئے تو وہاں پھولوں کے اتنے ڈھیر اُمڈتے تھے کہ اُنہیں بچانے کے لیے جیپ کو بار بار روکنا پڑتا تھا.. ہر مقام پر پھولوں کے انبوہ تھے... اور کثیر تھے..

یہ ہوٹل سوفی تھا، صوفی ہرگز نہ تھا..

مسافتوں کی تھکن سے شکستہ، پریشان حال جب ہم اُس کے صدر دروازے میں سے اندر داخل ہوئے تو اُن کاؤبوائز کی مانند جو صحراؤں کی کلفتوں اور آک کے پودوں کی زہرناکیوں اور اپنی دُم میں پوشیدہ جھنجھنا بجانے والے زہریلے سانپوں میں سے سفر کرتے گندے مندے نڈھال، میلے کچیلے یکدم ایک جگمگاتے، سنہری فانوسوں سے روشن ایک ایسے سیلون میں داخل ہوتے ہیں جس کے قالینوں پر اُن کی جوئیں ٹپ ٹپ گرتی ہیں اور بار کاؤنٹر کے پیچھے کیسے کیسے رنگین مشروب سجے ہوتے ہیں اور کاروباری نازنینیں کیسے اپنے فراخ سینوں اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی ہیں..

یہ سب کچھ تھا لیکن استقبالیہ ڈیسک کے پیچھے جو نازنین یہاں کھڑی تھی وہ نہایت کم چہچہی تھی اور اُس نے نہایت بے زاری سے ہمیں ہمارے کمروں کی چابیاں عنایت کر دیں..

کمرہ نمبر 138-

اِک جہاں سب سے الگ..

وہ جو ہم جیسے مڈل کلاس لوگ ہوتے ہیں، جب کبھی اتفاقاً ایک پُرتعیش ماحول میں آ نکلتے ہیں تو قدرے سہم جاتے ہیں، ایک خائف اور یتیم فاختہ کی مانند قدم دھرتے ہیں.. ظاہر یہی کرتے ہیں کہ ہم نے کہاں متاثر ہونا ہے ہم تو ایسے ہی شاہانہ ماحول میں پلے بڑھے ہیں لیکن اندر سے سہمے ہوئے ہوتے ہیں کہ کیا پتہ ابھی کوئی گرج کر پوچھے کہ اوئے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اپنی اوقات نہیں پہچانتے..

کمرہ نمبر 138 میں جب میں داخل ہوا تو میرا اولین ردعمل بھی اسی نوعیت کا تھا.. کیسا پُرتکلف اور پُرتعیش لونگ روم تھا جس کی دیوار شیشے کی کھڑکیاں رات کے اس پہر بھی ایک باغ بہاراں پر کھلتی تھیں.. واش روم ایک عام ہوٹل کے کمرے سے بڑھ کر وسیع اور بیڈ روم میں اتنا فراخ پلنگ کہ آپ نہایت آسودگی سے دو چار برفانی ریچھ پہلو میں سُلا سکتے تھے.. یعنی اگر آپ کو کوئی اور مناسب اور متناسب سہولت میسر نہ ہو تو..

البتہ کُونج اس پُرتعیش شاہانہ پن سے متاثر نہ ہوئی.. کہ وہ پرندے جو بلندیوں پر اُڑان کرتے ہیں زمین کی آسائشوں کو حقیر جانتے ہیں..

اور جب بالآخر میں اس ابتدائی تعیش کے صدمے سے سنبھلا تو پاپی پیٹ نے سنبھلنے نہ دیا کہ وہ خالی تھا اور دہائیاں دیتا تھا.. سوفی ہوٹل کا ڈائننگ روم کب کا دروازے بند کر چکا تھا اور ایک سیاحتی کتابچہ ہمیں خبر کرتا تھا کہ رات کے اس پہر فیئر بینک میں ایک ایسا سپر سٹور ہے جس کے دروازے ابھی تک کھلے ہوں گے اور وہاں سے خوراک حاصل کی جا سکتی ہے..

باہر آئے تو.. کوئی ویرانی سی ویرانی تھی..

میں نے ایک بھوکے گیدڑ کی مانند تھوتھنی اوپر کی.. ناک بلند کر کے سونگھا تو صرف تیس میل کے فاصلے پر واقع آرکٹک سرکل کی برفانی سرد ہوا میرے نتھنوں میں سرایت کر کے پورے بدن میں پھیل گئی اور ہر مُو کو خبر کی کہ میں الاسکا کی ہوا ہوں.. وہی ہوا جس میں سفید برفانی ریچھ سانس لیتے ہیں، اسکیمو سانس بھرتے ہیں اور تم کیسے نصیب والے ہو کہ اب اُسی ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں محسوس کرتے ہو.. کہو تمہارے وطن کی ہوا کیسی ہوتی ہے؟... میں اُس میں سانس لے رہا تھا اور اُس کا مہمان تھا اس لیے اُس کا دل تو نہیں توڑ سکتا تھا کہ اے بی بی ہمارے دیس کی ہواؤں کا کیا بیان ہو.. تم یورپ اور امریکہ والے کیا جانو کہ پُروا کیسے بدن کو آغوش میں لیتی ہے.. اور کیکر کے پھولوں کو جھلساتی لُو میں کیسی مہک ہوتی ہے.. بارش کی پہلی بوند سے سُوکھی زمین کیسے خوشبو آور ہو کر ایک مست ہوا کو جنم دیتی ہے.. یہاں تک کہ جس کے موسموں میں بھی دھان کے کھیتوں پر سے گزرتا جو اکلوتا جھونکا آتا ہے تو اُس میں کیسی پیاس بھری نمی ہوتی ہے.. اور ساون کی ہوائیں ہوتی ہیں.. تو کوئی ایک ہوا ہو تو بیان کروں..

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی لیکن ایک نیم تاریک جزیرے میں اُس سٹور کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں جس کی تلاش میں ہم نکلے تھے، اُس سٹور کے فوڈ سیکشن میں بہت کچھ منجمد حالت میں میسّر تھا.. ذرا احتیاط کرتے ہوئے خنزیر کے قتلوں کے برابر میں جو مُرغ ٹھنڈے ہو رہے تھے اُن میں سے ایک پسند کیا اور کچھ سلاد وغیرہ پسند کی..

اور مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ فیئر بینک کے باشندے جو اس سٹور میں گھومتے پھرتے خریداری کرتے تھے، بے مقصد اِدھر اُدھر کھڑے تھے وہ بقیہ دنیا سے کچھ جدا سے لگتے تھے.. اُن کے چلنے پھرنے اور ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا انداز مختلف تھا.. وہ اپنے آپ میں اور الاسکا کی تنہائی میں گم ہیں اور یوں لگتا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں، اُن کی عزیز داری ہے.. وہ جسے کہتے ہیں ناں کہ وَن بِگ فیملی.. تو وہ ایک بڑا خاندان لگتے تھے.. جیسے وادئ ہنزہ میں ہر کوئی ایک دوسرے کا رشتہ دار ہوتا ہے.. اکثر بیگ ہوتا ہے تو ایسے ہی یہ الاسکا والے تھے..

فوڈ سیکشن کے برابر میں کانچ کے سامان کا سٹور تھا.. یعنی شراب میسر تھی اور حیرت انگیز طور پر یہ سٹور ایک آہنی جنگلے کے اندر تھا.. یعنی قید میں تھا... یُوکان میں بھی میں نے جتنے شراب خانہ خراب کے کارخانے دیکھے وہ سب آہنی سلاخوں کے پیچھے تھے، گونج تھی جس نے اس گتھی کو سلجھایا "الاسکا میں ایک کہاوت ہے کہ سر توڑ محنت کرو، خوب کھیلو کودو اور پھر شراب اتنی پیو کہ کچھ یاد نہ رہے.. الاسکا میں اگرچہ موسم گرما کے آخر میں معتدل موسم ہیں، دن کی روشنی بیس گھنٹے تک رہتی ہے لیکن جب سرما نازل ہوتا ہے تو ہر سُو اندھیرا چھا جاتا ہے، تین چار گھنٹے کی بجھی بجھی روشنی اور پھر اندھیری رات ہے.. درجہ حرارت گرتا ہے تو منفی ساٹھ سے بھی گر جاتا ہے.. اگر آپ باریش اور مونچھوں والے ہیں تو گھر سے باہر قدم رکھتے ہی آپ کی ریش کے بال کانٹوں کی مانند اکڑ جائیں گے اور مونچھیں منجمد ہو جائیں گی.. اور ان دنوں اگر آپ دوسری منزل کی کھڑکی سے پانی نیچے پھینکتے ہیں تو وہ فٹ پاتھ پر برف کی صورت گر کر کرچی کرچی ہو جائے گا.. تو ایسے موسموں میں اگر شراب کے سٹور کھلے ہوں، اندر چلے جانے میں کچھ رکاوٹ نہ ہو تو الاسکن اُنہیں لُوٹ کر لے جائیں اس لیے اُنہیں آہنی سلاخوں میں روپوش کیا جاتا ہے.."

شراب ہمارے مشرق میں ایک ممنوع رومان ہے، گو نہ بے خودی ہے، جب تک شاعری پر اس کا چھڑکاؤ نہ کیا جائے تو وہ بھی پژمردہ سی رہتی ہے، بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر اور رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے.. آب جو کا کنارا۔ ایک کتاب اور محبوب لیکن اس کے ساتھ ارغوانی شراب کی ایک صراحی بھی.. اسے ام الخبائث کا نام دیا گیا ہے لیکن یہ کیا ہے کہ مذہب اور تصوف بھی اس کی رمزیت کے بغیر ادھورے رہتے ہیں.. شرابِ طہورا کے بغیر جنت کا تصور بھی نامکمل رہتا ہے اور بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے..

یہ خمریات کے قصے صرف مشرق کے ادب میں جگہ پاتے ہیں جب کہ مغرب میں اس نوعیت کے کچھ بکھیڑے نہیں ہیں، وہاں شراب نوشی ایک رواج ہے، ثقافت کا ایک جُز ہے، ایک روزمرہ کی روٹین ہے لیکن جان لیجیے کہ اہل مغرب میں سے بہت سے ہیں جو اسے ہاتھ نہیں لگاتے اور ٹی ٹوٹلر کہلاتے ہیں.. اور جو ہاتھ لگاتے ہیں تو کبھی کبھار ویک اینڈ پر لگاتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں جب کبھی جتنی بھی ہاتھ لگ جائے اُسے تب تک ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جب تک اوندھے نہ پڑ جائیں.. اہل مغرب اگر شراب نوشی میں تجاوز بھی کر جائیں تو ذرا لڑکھڑاتے ہیں اور پھر سنبھل جاتے ہیں جب

کہ مشرق میں پی کر نالیوں میں گر جانا ہی اس فن کی معراج سمجھا جاتا ہے.. ایک سردار جی سے شراب خانے والے نے پوچھا کہ سردار جی کیا پئیں گے، وہسکی، واڈکا یا وائن وغیرہ تو اُنہوں نے کہا کہ آپاں نے تو ٹُن ہونا ہے کچھ بھی پلا دو۔

مجھے یاد ہے کہ روم میں میرے دوست پیئر لوئی جی کے ہاں کھانے کی میز پر اُس کے موٹے، گنجے اور نہایت شاندار شخصیت والے ابا جی نے پیئر لوئی جی کے چھوٹے بھائی کو جو مشکل سے دس برس کا ہوگا، ایک گلاس میں یونہی چند قطرے وائن کے ٹپکا کر اُسے پانی سے لبریز کر دیا کہ ابھی بچہ ہے اس کی تربیت کے لیے صرف گھونٹ بھر وائن ہی درکار ہے.. جوں جوں بڑا ہوگا پانی کی مقدار کم ہوتی جائے گی اور بالآخر جب سن بلوغ کو پہنچے گا تو خالص وائن کا حقدار ہو جائے گا..

یقین جانیے کہ ایسی تربیت صرف اطالیہ ہی میں نہیں ہوتی بلکہ پاکستان میں اُن طبقوں اور قبیلوں میں بھی ہوتی ہے جو شراب سے گریز نہیں کرتے.. اور اس کے باوجود کہ ماتھے پر محراب کا نشان ثبت ہے ہر شب پیتے ہیں جسے جس قدر ملے.. مجھے ایک ایسی محفل میں شرکت کا اتفاق ہوا جہاں ایک جاٹ قبیلے کے افراد نہایت روزمرہ کے معمول کے مطابق، نہایت دھیرج سے وہسکی سے شغل فرما رہے تھے اور یہ حضرات چونکہ اپنی ٹریننگ مکمل کر چکے تھے اس لیے نہ بہکتے تھے اور نہ اول جلول بکتے تھے بلکہ بس ذرا چہکتے تھے.. تو میں یکدم ذرا سناٹے میں آ جاتا ہوں کہ دیکھتا ہوں کہ ایک کونے میں چار پانچ نوجوان.. ابھی ٹین ایج میں، نہایت مؤدب ہو کر بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے بلیک لیبل وہسکی کی ایک بوتل دھری ہے جس کا پیندہ نظر آنے کو ہے.. میں نے ایک بزرگوار سے پوچھا کہ چودھری صاحب.. یہ برخوردار.. تو ابھی سے.. تو وہ میری نادانی پر خنداں زن ہوئے اور کہنے لگے "تارڑ صاحب.. یہ تو طے ہے کہ ہمارے ان برخورداروں نے بہر طور پینی ہی پینی ہے.... ہم سے چھپ چھپا کر بہر حال گھونٹ بھرنے ہیں کہ یہ ہمارے بچے ہیں.. ہم نہیں چاہتے کہ یہ دیگر کم ذات لوگوں کی مانند پی کر لڑھکتے پھریں.. انہیں آداب مے نوشی سے آگاہ ہونا چاہیے.. یہ ان کی ٹریننگ ہو رہی ہے.."

انسانی تاریخ کی گتھیاں بھی شراب کے تذکرے کے بغیر نہیں کھلتیں..

بائبل کے مطابق حضرت نوح نے جب طوفان کے بعد زمین پر قدم رکھا تو سب سے پہلے وہاں انگور کاشت کیے اور پھر اُن سے شراب کشید کی..

عیسائی حضرات وائن کو حضرت عیسیٰ کے خون سے تشبیہ دیتے ہیں..

بلکہ ہم صدارتی محل میں "ہر دلعزیز" کمانڈو پرویز مشرف کی دعوت کھانے جا رہے تھے تو لاہور کے بشپ بادامی آنکھوں والے بشپ ملک نے مجھ سے درخواست کی کہ "تارڑ صاحب.. آپ ذرا جنرل صاحب سے ہماری سفارش کر دیجیے گا کہ ہمیں اپنی مذہبی تقریبات کے لیے جو مقدس وائن درکار ہوتی ہے، اُسے درآمد کرنے کی اجازت دے دی جائے.. چونکہ آپ کا چہرہ جانا پہچانا ہے تو شاید آپ اُن تک پہنچ جائیں.." تو میں نے بشپ بھائی سے کہا تھا کہ "سر.. وائن تو نہایت آسانی سے پاکستان میں بھی میسّر ہے.. اگرچہ قدرے چھپ چھپا کر.." تو وہ کہنے لگے.. نہیں تارڑ بھائی.. یہ جو کلیساؤں میں مقدس وائن استعمال ہوتی ہے یہ صرف اطالیہ میں کشید کی جاتی ہے اور اُس میں نہایت پر تقدس جڑی بوٹیاں

ایک تاریخ دان نے کہا تھا کہ اگر واڈ کا شراب نہ ہوتی تو رُوس بھی نہ ہوتا..

بے دین رُوسیوں نے سوویت یونین کے زمانوں میں زیرنگیں مسلمان ریاستوں کو بھی واڈ کا کی لت لگادی.. وہ اچھے بھلے انگور کی ارغوانی مے کے شیدائی تھے اور اُنہیں اس بے رنگ اور بے بُو شراب کی لت لگادی..

یہ شنید ہے کہ بھٹو کے عہد میں پاکستانی علماء کا ایک وفد بخارا اور ثمرقند اس غرض سے گیا کہ دیکھیں وہاں ہمارے مسلمان بھائی کس حال میں ہیں اور اس سلسلے میں اُن کی ملاقات بخارا کے سب سے بڑے عالم دین سے ہوئی.. جو وہاں کے مفتی اعظم وغیرہ تھے۔ اُنہوں نے پاکستانی وفد کے سامنے نہایت عالمانہ بصیرت افروزی سے لبریز متشرع گفتگو کی اور پھر اُن کی تواضع کی خاطر دیگر لوازمات کے ہمراہ واڈ کا شراب بھی پیش کردی.. اس پر ظاہر ہے ہمارے مولانا حضرات پر سکتہ طاری ہوگیا اور کسی ایک نے جرأت کر کے کہا "حضرت... شراب تو حرام ہے۔"

تو اُن مفتی صاحب نے جو یقیناً سوویت یونین کے حکمرانوں کے ایک پالتو تھے، کہا۔ "آپ پاکستانی دین کے حوالے سے ہمیشہ بخارا کی سند مانتے ہیں تو قرآن پاک میں اسے ممنوع تو قرار دیا ہے لیکن حرام قرار نہیں دیا گیا بلکہ کہا گیا ہے کہ اس میں کچھ فائدے بھی ہیں.. ہاں سؤر، سُود اور غصے کو صریحاً حرام قرار دیا گیا ہے.. تو جام اٹھائیے.. نہیں اٹھاتے تو میں اٹھاتا ہوں.."

شراب خانہ خراب کے تذکرے بہت دور تک چلے جاتے ہیں..

تو ہم واپس آتے ہیں وہاں جہاں فیئر بینک کے رات کے اس پہر بھی کھلے ہوئے سٹور کے برابر میں شراب کی بوتلیں سلاخوں میں قید ہیں.. اور کچھ الاسکن وہ سلاخیں تھام کر اُن کے پیچھے جو کانچ کا سامان ہے اُسے حسرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُس اداس سے سُپر سٹور کے باہر.. رات کے اس پہر.. جب فیئر بینک کا گویا ایک شہر خاموشاں جس پر بارش کی بوندیں ایک سوگواری میں ٹپ ٹپ گرتی بے آواز تھیں، چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بے پرواہ اور کھلنڈرے فٹ پاتھ پر اپنی بوتلیں رکھے، الاسکا کی دور افتادہ تنہائی میں قہقہے لگاتے تھے اور دنیا بھر سے کٹ جانے کے دُکھ کا مداوا خمار میں کرتے تھے، ہم دونوں کو سٹور میں سے باہر آتے دیکھ کر اُنہوں نے گویا ہمارے احترام میں ایک منٹ کی مکمل خاموشی اختیار کرلی کہ.. یہ اجنبی کون ہیں جو ادھر آ نکلے ہیں، ہماری الگ تھلگ دنیا میں دراندازہوتے ہیں.. ایک گندمی رنگت کا شخص ہے مسافتوں کا مارا ہوا اور اُس کے برابر میں ایک کونج نما سفید پرندہ دکھائی دیتا ہے جو گرم آسمانوں پر اُڑان کرنے والا ہے تو یہ دونوں یہاں دنیا کے آخری سرے پر معلق ایک سرد سلطنت کے شہر فیئر بینک میں کیسے آ نکلے ہیں.. تو اُنہوں نے اُس ایک منٹ کی خاموشی کے دوران ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھا اور پھر ہم سے غافل ہو کر اپنے شغل مے نوشی میں مشغول ہوگئے..

○●○●○

"اک پُھل موتیے دا مار کے جگا سوہنئے"

کونج کب کی سوفی سٹیشن ہوٹل کے کمرہ نمبر 138 کے لونگ روم کی فرش سے چھت تک جاتی کھڑکی کے آگے تنے ہوئے پردوں کے قریب ہوکر، دونوں پَر اپنی آنکھوں پر رکھ کر گھوک سوچکی تھی..

اور مجھے.. نیند نہ آتی تھی..

ڈاسن سٹی سے یہاں تک کی طویل اور ہیجان خیز مسافت کی تھکن میرے بدن کو چُور کرتی مجھے سونے نہ دیتی تھی.. اور میرے بدن کے گرد ابھی تک ٹوک کے آگے جو گھنے جنگل ہم پر اُمڈے تھے اُن کے پتے اور گھنی بیلیں لپٹتی مجھے حنوط کرتی تھیں اور اس کمرے کا شاہانہ پن بھی مجھے بے آرام کرتا تھا..

تو اس بے خوابی میں اپنی توجہ بھٹکانے کی خاطر میں نے لونگ روم میں تاریک پڑے ٹیلی ویژن سے رجوع کیا.. اُس کے اوپر پلاسٹک کے ایک فریم میں اس ٹیلی ویژن پر نمودار ہونے والی مختلف چینلز کی تفصیل درج تھی..

الاسکا چینل نمبر 12.. اے سپیشل سروس آف سوفی سٹیشن ہوٹل..

تعداد میں یہ چینل چوّن تھے.. الاسکا چینل نمبر 12 کے بعد.. فوکس نیوز.. اے بی سی.. ڈسکوری.. سی این این.. ہسٹری چینل.. ہوم اینڈ گارڈنز.. فوڈ نیٹ ورک.. ایم ٹی وی اور ڈزنی وغیرہ..

اُس بے خواب شب میں جب میں ریموٹ کے بٹن دباتا چینل بدلتا رہا تو ٹیلی ویژن سکرین پر جو تصویریں متحرک ہوتی تھیں اور جو ساز بجتے تھے اُن سے قطعی طور پر اندازہ نہ ہوتا تھا کہ میں پاکستان میں نہیں ہوں.. الاسکا کے ایک شہر فیئر بینک میں ہوں.. وہی سی این این، فوکس، ڈسکوری، ہسٹری چینل اور غل کرتی ایم ٹی وی..

رات کے کسی پہر بالآخر مجھے نیند نے آلیا..

اور جب نیند اُترتی ہے تو یہ کہاں دیکھتی ہے کہ وہ کہاں اُترتی ہے.. وہ ایک عارضی موت کی صورت کہیں بھی.. دمشق، قرطبہ، وینس میں یا فیئر بینک میں اُتر آتی ہے کہ نیند کی بھی موت کی مانند کوئی سرحد نہیں ہوتی.. یہ دونوں سرحدوں کو خاطر میں نہیں لاتیں.. اُن کے لیے آپ کچھ طے نہیں کرتے وہ خود طے کرتی ہیں کہ اُنہوں نے کہاں آنا ہے اور کہاں اُترنا ہے...

ایک عجیب مسلسل میکانکی گھوں گھوں کی آواز میرے کانوں میں چلی آتی ہے.. ایک پَر کے بوجھ سے بھی

دب جانے والا ایک گدیلا، شفاف چادروں والا بستر ہے اور میں ایک پُر لطف اگرچہ ابھی تک تھکاوٹ سے بھرپور غنودگی میں ہوں..

میں کہاں ہوں؟

میں نے کہاں ہونا ہے، اپنے 22 جے گلبرگ تین والے گھر میں اپنے بیڈ روم میں ہوں اور سپلٹ ایئر کنڈیشنر میں کچھ صورت خرابی کی ہے جو وہ یوں گھوں گھوں کیے چلا جا رہا ہے..

یہ گرر گرر گھوں گھوں کی آواز اتنی مسلسل ہے کہ مجھے اذیت دینے لگی ہے.. نیم خوابیدہ حواس پر سوار ہو کر اُن کی پسلیوں میں ایڑھیاں گھسیڑ رہی ہے.. میں بے زار ہو کر آنکھیں کھولتا ہوں تو کھلتا ہے کہ گھر نہیں کوئی اجنبی مقام ہے، اجنبی بستر ہے جو الاسکا میں کھلا ہے.. بستر سے جدا ہو کر نیند میں قدرے جھولتا وہاں پہنچتا ہوں جہاں کونج اپنے پَروں میں گم مدہوش پڑی تھی.. میں کونجوں کی عادات اور خصائل کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا، میرا خیال تھا کہ نہ صرف کونجیں بلکہ دیگر پنکھ پکھیرو اپنے پاؤں پر کھڑے جھوم جھام کر اپنی نیند پوری کر لیتے ہیں لیکن یہ خیال سراسر باطل ثابت ہوا کہ کونج تو ہم انسانوں کی مانند ٹانگیں پسارے یوں گھوک سوئی ہوئی تھی کہ اگر میں اپنا کان اُس کی چونچ کے قریب لے جاتا تو اُس کے ہلکے ہلکے خراٹے بھی سُن سکتا تھا.. میں نے اُس کی نیند میں خلل نہ ڈالا.. لونگ روم کی فرانسیسی طرز کی چھت تک جاتی کھڑکی کے آگے تنے ہوئے پردوں کو وا کر دیا اور یکدم صبح کی زرد دھوپ جو کب کی منتظر تھی کہ کوئی پردے ہٹائے اور وہ اندر چلی آئے.. وہ اندر چلی آئی.. کونج نے روشنی کے اس بہاؤ کو محسوس کر کے آنکھیں کھولیں اور پھر سے موندھ کر خوابِ خرگوش کی بجائے خوابِ کونج میں چلی گئی۔

کھڑکی کے پار جو ایک ہریاول اور سجاوٹ کا گلشنِ رنگ و بُو تھا وہاں دو نہایت پلی ہوئی مشٹنڈی الاسکن لڑکیاں مختصر نیکروں میں پھنسی لان موورز کے ہینڈل تھامے زور لگاتی گھاس تراش رہی تھیں اور یہ گھوں گھوں کا اذیت ناک تسلسل اُن کے لان موورز میں سے جنم لے رہا تھا..

الاسکن مشٹنڈیوں کی فربہ رانیں اُن کی نیکروں کے قابو میں نہ آتی تھیں.. اگرچہ تمنا بیدار ہوتی تھی کہ یہ خواتین ایک نظر تو ادھر کمرہ نمبر 138 کی کھلی کھڑکی کی جانب کر لیں جہاں ایک گندمی رنگت کا توندیلا شخص اُن کی جانب رغبت سے دیکھتا ہے لیکن وہ متوجہ نہ ہوئیں..

"ٹھرکی.."

میں چونک گیا، بلکہ ہراساں ہو گیا کہ ارتکاب جرم میں پکڑا گیا ہوں..

وہ.. کونج.. اپنی سیاہ آنکھیں لپ جھپ جھپکتی کچھ شرارت سے اور کچھ عداوت سے مُجھے تکتی تھی..

"میرا خیال ہے کہ تمہارے ماضی کے کچھ تجربے قدرے مخدوش ہیں۔" میں نے اپنی خفت مٹانے کی خاطر کہا "اسی لیے تم مجھ معصوم خصلت پر شک کرتی ہو۔ مجھے تو ان خواتین کے لان موورز کی اذیّت ناک گھوں گھوں نے بیدار کر دیا اور اب میں صرف یہ مشاہدہ کر رہا تھا کہ یہ لان موورز گھاس کی پتیاں کس نفاست سے تراشتے ہیں.. اور میں ہرگز انہیں آپریٹ کرنے والی پلی ہوئی لڑکیوں کو اشتیاق سے نہیں دیکھ رہا تھا.. یقین کرو۔"

"ایک مرتبہ پھر کہو.."

"کیا.."

"یہی.. اِک بار پھر کہو ذرا.. یقین کرو.. جب بھی تم نہایت معصومیت سے یہ کہتے ہو کہ.. یقین کرو.. تو میں جان جاتی ہوں کہ تم اپنے کسی نہ کسی جھوٹ کی پردہ پوشی کر رہے ہو... ٹھرکی!"

سرد سلطنت الاسکا کی سرزمین پر فیئر بینک کے شہر میں، جہاں سے آرکٹک سرکل تیس منٹ کی مسافت پر واقع تھا، اگر لامی لامی ٹانگوں والا ایک بے ڈھنگا پرندہ آپ کو "ٹھرکی" قرار دے تو اس سے بڑھ کر بے عزتی اور کیا ہو سکتی ہے. اگرچہ کچھ تشفی بھی ہوتی تھی کہ خیر سے ٹھرک پن کے جرثومے اس عمر میں بھی کچھ دم خم رکھتے ہیں.. کچھ دیر بعد وہ دونوں خواتین جن کی رانیں نیکروں میں کسمساتی تھیں، گھاس تراش کر اپنے لان موورز دھکیلتی لونگ روم کی کھڑکی کے منظر کو خالی کر کے آگے بڑھ گئیں.. اور اس کے ساتھ ہی کونج جو محض مجھے ٹھرکی قرار دینے کے لیے بیدار ہوئی تھی اُس نے ایک انگڑائی لی پھر ایک جمائی لی اور اپنے دونوں پَر آنکھوں پر ڈالے پھر سے نیند میں چلی گئی..

میں بدستور کھڑکی میں سے در آنے والے باغ بہاراں کو تکتا رہا.. وہاں کیسے کیسے پھول کھلے تھے.. پات ہرے تھے.. پر وہاں نہ کیکر کے زرد پھول تھے اور نہ ہی دھریک کے مہک آور بنفشی گچھے.. نہ برنے کے نازک چھوئی موئی سنہرے گُل تھے اور نہ ہی وہاں موتیے کی کوئی جھاڑی تھی جس کے پتوں میں سے جھانکتے چاندنی سفید ایسے پھول ہوں جن کی مہک گرم راتوں میں کنواریوں کو بے چین کرتی ہو.. جن میں سے کسی ایک پھول کو اپنے خوابیدہ محبوب کے چہرے پر مار کر اُسے بیدار کر سکتے ہوں..

اِک پُھل موتیے دا مار کے جگا سوہنیے

بھلا یہ الاسکن گُل بوٹے کیسے حال ہمارا جانے ہیں..

○●○●○

''فیئر بینک کے برفانی کتے اور بلھے شاہ''

کمرہ نمبر 118 کے دبیز دروازے اور فرش کے درمیان جو جھری تھی اُس میں سے ایک اخبار پھڑکتا ہوا داخل ہوا اور میٹ پر مُردہ ہو گیا..

میں نے کچن کافی مشین کے توسط سے تیز اور کڑوی کافی کا ایک کپ حاصل کیا..صرف ایک چُسکی بھری تو جو تھوڑی بہت نیند ابھی تک آنکھوں میں تھی یکسر کافور ہوئی اور ہوٹل کی جانب سے مہیا کردہ اخبار کا مطالعہ کرنے لگا..

یہ ''فیئر بینک..ڈیلی نیوز مائنر'' تھا جس کی پیشانی پر تھا کہ یہ اخبار 1903ء سے الاسکا کی ریاست کا ترجمان چلا آتا تھا..بائیں کونے میں ایک چمکتے زرد سورج کے تلے آج کے موسم کا حال تھا..''کبھی کبھار دھوپ ہوگی اور اس میں بادلوں کے وقفے آئیں گے..زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 64 اور کم سے کم 44 متوقع۔'' اس مقامی اخبار میں جہاں امریکہ بھر کی خبریں تھیں، بیس بال میچوں کے نتائج تھے..اور صدر بُش کا بیان تھا کہ..اس دشمن کے خلاف جو جنگ ہے محض ایک فوجی مبارزت نہیں ہے، یہ تو اکیسویں صدی کی فکری جدوجہد ہے جو ہم امریکیوں کو درپیش ہے....

اس ''فکری جدوجہد'' کے معانی تلاش کرنے ہوں تو وہ صلیبی جنگوں میں جا دریافت ہوں گے۔

اس خبر کے برابر میں فلسطین کے صدر محمود عباس کا بیان تھا کہ حماس کے دہشت گردوں کو اسرائیل کو تسلیم کر لینا چاہیے..ظاہر ہے محمود عباس نے دہشت گرد کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا، اسے ایڈیٹر نے صحافیانہ دیانت کو بروئے کار لا کر خود سے شامل کر دیا تھا، ایسی مقامی اور بین الاقوامی خبریں دنیا کے ہر اخبار میں مشترک ہوتی ہیں لیکن اگر آپ اُس خطّے کے رہن سہن، موسموں اور ذہنی رویّوں سے آگاہ ہونا چاہیں تو اُس اخبار کے اشتہاروں کے صفحات کا بہ غور مطالعہ کیجیے..

اب ذرا ملاحظہ کیجیے کہ ''فیئر بینک..ڈیلی نیوز مائنر'' میں شائع دہ کچھ اشتہارات کا خلاصہ..

ہوائی جہاز برائے فروخت..53 سیسنا 180..بہت اچھی حالت میں اور بہت کم قیمت میں۔

کان کنی کے آلات..سستے داموں پر..آپ اپنا سونا خود تلاش کر سکتے ہیں..

برفانی مشینیں جو آپ کو نارتھ پول پر لے جا سکتی ہیں، جاپانی یاماہا برانڈ۔

اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور مویشی..خوب صحت مند..نہایت کم داموں پر..شاہ بلوط کی لکڑی کے گٹھے جو موسم سرما میں آپ کے کام آئیں گے..آتش دانوں میں خوب جلتے ہیں، فی گٹھہ صرف دو سو ڈالر..ڈیلیوری آپ کے دروازے تک مُفت۔

فیئر بینک سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل میں روپوش ایک لاگ کیبن..بجلی کا کنکشن، نزدیکی جھیل پر مچھلیاں پکڑنے کے لیے کوئی اجازت نامہ درکار نہیں۔

ایک دو پنکھوں والا جہاز..جو آپ کو برفانی ریچھوں کی آماجگاہوں تک لے جا سکتا ہے..قیمت اتنی کم کہ تقریباً بالکل مفت..

صرف تین ہزار ڈالر میں ہم آپ کے پورے گھر کو یوں گرم کر سکتے ہیں کہ آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ الاسکا میں نہیں، فلوریڈا میں ہیں..

اس نوعیت کے درجنوں اشتہاروں میں سے ایک اشتہار ایسا تھا جو ایک ہی صفحے پر تین مختلف جگہوں پر شائع ہوا تھا۔

''ایک ہزار ڈالر انعام''

جو کوئی بھی ایسی اطلاع ہم تک پہنچائے جس کے نتیجے میں ہم اُن چوروں کو دبوچ سکیں جو ہمارا ایک فور وہیلر ٹرک اور ایک ڈبل بیڈ چُرا کر لے گئے ہیں اور اُن لوگوں کی پہچان میں معاون ثابت ہو جو ہمارے ذاتی ملکیت کے رقبے میں داخل ہو کر بلا گلا کرتے ہیں..

(جین ڈووال..گھر کا فون..488-1568)

''الاسکا..ہائی وے'' کے اس سفرنامے کو پڑھنے والے یقیناً میری حیرت انگیز اور ناقابل یقین یادداشت پر عش عش کر رہے ہوں گے کہ میں کہیں الاسکا کی پہلی صبح میں جو اخبار میرے مطالعے میں آیا تھا، اُس کے صفحہ اشتہارات کو لفظ بہ لفظ بلکہ فون نمبر بھی درج کرتا چلا جا رہا ہوں..تو پیارے قارئین ازراہ کرم اپنا عش عش کرنا موقوف کر دیجیے..یہ میری یادداشت کا کمال نہیں ہے بلکہ ''ڈیلی نیوز مائنر'' کے 12 ستمبر 2006ء کے اُس شمارے کا کمال ہے جو میں فیئر بینک سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے سامان میں سنبھال لایا تھا اور اب وہ شمارہ اس لمحۂ موجود میں میری سٹڈی ٹیبل پر لیمپ کی تیز روشنی میں عیاں ہوتا ہے اور میں اُس کے اشتہاروں کے صفحات کو دیکھتا ہوں، اُن کی تفصیلات نقل کرتا جاتا ہوں..ورنہ مجھے تو اپنا موبائل نمبر بھی یاد نہیں رہتا چہ جائیکہ کسی جین ڈووال کا نمبر یاد رکھ سکوں جس کا فور وہیل ٹرک اور ڈبل بیڈ چور اُٹھا کر لے گئے تھے..اور وہ بھی الاسکا میں..

کافی کا آخری گھونٹ بھرا تو وہ ٹھنڈی ٹھار ہو چکی تھی البتہ کڑواہٹ میں کچھ فرق نہ آیا تھا..

گونج اپنے کونے میں سمٹی سکڑی بے جان سی لگتی تھی..چونچ کھولے شاید خراٹے لے رہی تھی..

ہم نے الاسکا کے اس شہر فیئر بینک میں ایک دو روز قیام کرنا تھا..جسے لکڑی کے شہتیروں سے تعمیر کردہ جھونپڑوں کا ایک شہر بھی کہا جا سکتا تھا کہ شہر کی جدید عمارتوں اور شاہراہوں کے اندر تک جو جنگل دندناتے چلے آتے تھے، اُن میں روپوش ہزاروں ایسے چوبی مکان یا لاگ کیبن یا لکڑی کے جھونپڑے تھے..اس کی کُل آبادی ایک لاکھ سے کہیں کم بہتر ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور پھر بھی یہاں کے باشندے مُصر کہ یہ تو ایک دنیا جہان سے بڑا باقاعدہ شہر ہے جب کہ اپنے لاہور کے

علاقے گلبرگ کی آبادی اس سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔

یہ الاسکن ہماری طرح مسلسل بچے پیدا کرنے کا شغل اختیار نہیں کرتے۔ اسی لیے تو ان کے شہروں کی آبادی پچتر ہزار سے نہیں بڑھی۔ ہم ہوتے تو دنوں میں اسے یوں آباد کرتے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی کہ وہاں جہاں تل دھرنے کو ہوتے وہاں ایک بچہ ہوتا.. ہاؤ کیوٹ!

فیئر بینک بھی بنیادی طور پر یُوکان کی مانند سونے کی ہوس میں سے پیدا ہوا اور جب آخری ڈلی دستیاب ہو گئی تو پھر یہ بھی ایک منجمد بے روح بستی ہو گئی اور پھر الاسکا ہائی وے کا تعمیراتی معجزہ رونما ہوا تو اس نے ذرا سی جھرجھری لی اور کچھ عرصے کے بعد پھر سے گمنام ہو گیا.. اس کا نام تب ہوا جب 1968ء میں اس کے نواح میں تیل دریافت ہو گیا اور اُس تیل کو امریکہ تک پہنچانے کے لیے الاسکا پائپ لائن ویرانوں میں بچھائی گئی.. یہ ایک عجیب سا بل کھاتا اژدھا تھا جو ان خطوں میں سرسراتا چلا جاتا تھا.. یہ مشہور زمانہ پائپ لائن فیئر بینک سے صرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر بل کھاتی رینگتی چلی جاتی ہے.. فیئر بینک پھر سے دنیا کے فوکس میں آ گیا ہے..

اگر میں فیئر بینک پہنچ ہی گیا ہوں تو یہاں کیا کیا دیکھوں؟

ہر گُند ذہن گھامڑ آوارہ گرد کی مانند ''لونلی پلینٹ'' سیریز کی گائیڈ بک ''الاسکا'' ہمہ وقت میری ہم سفر تھی اور میں اُس کی راہنمائی میں اپنے راستوں میں پڑتی جھیلوں، بلندیوں، دریاؤں اور آبادیوں کی پہچان کرتا تھا... جی ہاں وہی ''لونلی پلینٹ'' گائیڈ بکس کی سیریز جس کی ایک شریک مصنفہ کے ہمراہ گلگت میں میں نے ایک یادگار شب گزاری تھی اور اُسے ''یاک سرائے'' کے سفر کے بارے میں کچھ معلومات مہیا کی تھیں جو غالباً پاکستانی شمال کی ''لونلی پلینٹ'' گائیڈ بک میں درج ہوئی تھیں.. میں نے فیئر بینک کے قابل دید مقامات کی جانکاری کے لیے اس سیریز کی گائیڈ بک سے رجوع کیا تاکہ آج کے دن کے لیے ایک سیاحتی لائحہ عمل ترتیب دیا جا سکے اور وہاں حسب ذیل مشورے بہم پہنچائے گئے تھے..

گولڈن ہارٹ پلازا.. دریا کے کنارے ایک پارک میں اُس نامعلوم خاندان کا ایک علامتی مجسمہ جو اس شہر کے پہلے آباد کار تھے..

بھلا مجھے اس مجسمے اور نامعلوم خاندان سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی..

یُوکان کوئسٹ جنرل سٹور اینڈ میوزیم.. الاسکا والے اپنے سرمائی منجمد زمانوں میں نہ اونٹ دوڑا سکتے ہیں اور نہ گھوڑے تو وہ کیا دوڑائیں.. وہ برف پر گھسٹتی ہوئی بے پہیہ گاڑیاں دوڑاتے ہیں جن کے آگے درجن بھر ایسے کُتے جو کرینا کپور اور ایشوریا سے کہیں بڑھ کر حسین اور وفادار ہوتے ہیں، بندھے ہوتے ہیں.. ان میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ دوڑ.. یوکان کوئسٹ.. نام کی فیئر بینک سے شروع ہو کر سولہ سو کلومیٹر دور وہائٹ ہارس تک جاتی ہے..

اور میں نے تصور کیا کہ جب ''ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ'' کی زرد اور سُرخ خوش نمائی برف کی دبیز تہوں میں روپوش ہو گی تو اُس شاہراہ پر وہ زور لگاتے، ہانپتے، نتھنوں سے بھاپ خارج کرتے بادامی، نیلی اور سنہری آنکھوں والے برفانی کُتے دوڑتے.. بے پہیہ گاڑیاں برف پر کھینچتے، گھسیٹتے کیسے شاندار اور من موہنے لگتے ہوں گے..

تو یہ جو قابل دید قرار دیا گیا میوزیم تھا اس میں اسی نوعیت کی کتا گاڑیاں نمائش پر تھیں اور کیا آپ یقین کر

سکتے ہیں کہ دوڑ میں شامل کُتے ننگے پاؤں نہیں دوڑتے بلکہ خصوصی بُوٹ پہن کر دوڑتے ہیں اور وہ بوٹ بھی اس عجائب گھر میں محفوظ تھے..

تو میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا تم آج کے دن کتوں کے جُوتوں کو دیکھنا پسند کرو گے.. تو فوراً جواب آ گیا کہ معاف کیجیے گا کہ میں آدھی دنیا کا سفر طے کر کے اس کے آخری کونے پر معلق اس الاسکا میں اس لیے تو نہیں پہنچا کہ کتوں کے جُوتوں کا دیدار کر لوں..

فیئر بینک کا سب سے وسیع اور پُرکشش مقام ''الاسکا لینڈ'' تھا اور وہاں دریا میں لنگر انداز ایک بھاپ سے چلنے والا سٹیمر تھا، جھونپڑوں کے کچھ ماڈل تھے جن میں ابتدائی آباد کار رہائش رکھتے تھے.. میں محض ایک سٹیمر اور کچھ جھونپڑے دیکھنے کے لیے تو ان خطوں میں نہیں آیا تھا..

ایک اور عجائب گھر تھا جو بنیادی طور پر ایک کُتا عجائب گھر تھا، یہاں الاسکا کے ان سنہری بچھڑوں یعنی برفانی کتوں کے حالاتِ زندگی درج تھے.. اُن میں سے جو لافانی، کبھی نہ بھولنے والے کُتے تھے اُن کی تصویریں آویزاں تھیں اور اُن کی آنکھوں کا رنگ درج تھا..

بلھے شاہ نے معرفت کی رمز میں بیان کیا تھا کہ کُتے تیتھوں اتے، یعنی کتے تم سے برتر ہیں لیکن اس کا عملی مظاہرہ فیئر بینک میں ہی دیکھا جا سکتا تھا کہ یہاں کُتے واقعی اتنے بلند درجات پر فائز ہیں کہ اُن کے اعزاز میں عجائب گھر قائم کیے جاتے ہیں.. اگر میں ان الاسکن حضرات کو بلھے شاہ کی یہ کافی ترجمہ کر کے سنا دیتا کہ کتے تم سے برتر ہیں.. تو وہ یقیناً اسے سونے کے پانی سے لکھوا کر کسی کُتا میوزیم کی پیشانی پر آویزاں کر دیتے بلکہ اس کافی کو گلیوں میں گاتے پھرتے.. ویسے تو فیض صاحب کی نظم.. یہ گلیوں کے آوارہ کُتے... بھی الاسکا میں سُپر ہٹ ہو سکتی ہے..

میری کور ذوقی نے فیئر بینک کے کسی بھی قابل دید مقام کو قبول نہ کیا.. اگر تو میں کسی عام موٹل میں اقامت پذیر ہوتا تو شاید ''الاسکا لینڈ'' دیکھنے کی خاطر باہر قدم رکھ دیتا لیکن سوفی سٹیشن ہوٹل کے ستھرے، نشیلے اور نویلے پن کی مہک والے سٹوڈیو اپارٹمنٹ میں سے.. جس کے لِونگ روم کے پار ایک باغ بہاراں میں ابھی ابھی کچھ مشٹنڈی خواتین گھاس تراشتی نظر آئی تھیں تو بھلا اس فردوسِ بریں میں سے محض کُتوں کے جوتے، اُن کی تصویریں، کچھ جعلی جھونپڑے اور ایک ساکت زنگ آلود سٹیمر کو دیکھنے کی خاطر میں کاہے کو باہر قدم رکھتا.. گونج پرانے چاولوں میں خوابیدہ ایک سُنڈی کی مانند بے حس و حرکت پڑی تھی..

میں نے آگے بڑھ کر لونگ رُوم کا پردہ سرکا کر پوری شیشہ کھڑکی کو پھر سے ڈھانپ دیا اور اندرون میں ایک ملگجی سا اندھیرا چھا گیا اور اس اندھیرے میں مجھے وہ بستر جس میں سے میں ابھی ابھی اُس گھوں گھوں سے بے زار ہو کر اٹھا تھا، نہایت سہانا اور دعوت آمیز دکھائی دینے لگا اور میں پھر اُس کے گدیلے پن کی نرم پناہ گاہ میں گھس کر پھر سے مدھ بھری نیند میں چلا گیا کہ میرے اندر جو تھکاوٹ بسیرا کرتی تھی وہ ابھی رخصت نہ ہوئی تھی..

رات ایک پردہ پوش عورت ہوتی ہے جو اپنے تمام گناہوں کو تاریکی میں روپوش کر لیتی ہے، کسی کو کچھ گمان نہیں

گزرتا کہ وہ ایک بیسوا ہے یا ایک گھریلو عورت.. اُس نے جو کُچھ جنا وہ ناجائز ہے یا محض ایک مذہبی فرض کی ادائیگی کے لیے بغیر کسی لطف یا انبساط کے جنا..

آپ اپنے شہر کو.. جہاں آپ نے جنم لیا، جوانی بتائی اور پھر کہولت میں قدم رکھا اپنی ہتھیلی کی مانند جانتے ہیں. اُس کے ہر گلی کوچے، شاہراہ اور آبادیوں سے اتنے آگاہ ہوتے ہیں کہ بازاروں میں لگے کاروباری بورڈوں کی عبارت بھی ازبر ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ دن کی روشنی کے قصے ہیں.. اگر آپ اُسی شہر میں رات گئے داخل ہوتے ہیں تو وہ کوئی اور اجنبی شہر ہوتا ہے.. پہچان کے سب نشان تاریکی میں ملفوف ہوتے ہیں.. رات اُن گلی کوچوں کی ہیئت پر اپنے سائے ڈال کر اُن کی شباہت کُچھ کی کُچھ کر دیتی ہے اور یوں آپ اپنے گھر کا رستہ بھول جاتے ہیں، بھٹکنے لگتے ہیں..

اور اگر وہ شہر ہو ہی پرایا.. سراسر ان دیکھا اور اجنبی اور وہ بھی الاسکا میں تو اگر آپ اُس کی رات میں نکلیں تو آپ بھولے ہی بھولے، بھٹکے ہی بھٹکے.. بقول بُلھے شاہ..

هم ایسے گُم ہوئے پریم نگر کے شہر

ہم فیئر بینک میں بھٹکتے پھرتے تھے..

بھولے پھرتے تھے..

شام ڈھلے جب میں نیند کے خمار میں سے باہر آیا تو میں نے کُونج کو جگایا.. اور وہ ایسی کاہل کُونج تھی کہ وہ دیر تک چونچ کھولے جمائیاں لیتی رہی کہ مجھے اس مست بہار میں سونے دو..

"پلیز بیدار ہو جاؤ.." میں نے اُس کی منت کی۔ "ذرا اس آسائش سے باہر نکل کر دیکھیں تو سہی کہ فیئر بینک کی یہ شام کیسی ہے.."

ہمیں باہر آتے آتے رات ہوگئی..

اور ہم فیئر بینک کے کوچہ و بازار میں بھولتے بھٹکتے پھرے..

اور اس شہر کی گلیاں سُونی تھیں، کہیں کہیں سٹریٹ لیمپس بجھے دل سے بجھی بجھی روشنیاں فٹ پاتھوں پر بکھیرتے تھے اور آس پاس کے جنگلوں کا اندھیرپن اُن بجھی بجھی روشنیوں پر بھی غالب آتا اُنہیں مزید مدھم کرتا تھا..

گلیاں ہو جان سُونیاں تے وِچ مرزا یار پھرے..

صاحباں اگر الاسکا میں ہوتی تو اُسے یہ دعا کرنے کی حاجت ہی نہ ہوتی کہ یہاں کی گلیاں تو ازل سے سُونیاں تھیں.. پر داناباد اور الاسکا کے درمیان اتنے فاصلے پڑتے تھے کہ اگر مرزا اپنی گھوڑی بکّی کو صبا رفتار بھی کر لیتا تو یہاں تک کبھی پہنچ نہ پاتا..

ہم اُس شہر کی سُونی گلیوں میں بھولتے رہے، بھٹکتے رہے..

"کُونج.." وہ چُپ چلی آتی تھی "ایک ذاتی سوال پُوچھنا چاہتا ہوں.."

"پُوچھو.." اُس نے بدتمیزی سے کہا..

"کیا کسی قدیم یاد سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے.. اُسے یکسر فراموش کر کے اُس سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے؟"

وہ ٹھٹھک گئی جیسے میں نے اُس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو.. جیسے وہ وہ میرے ذہن کی تختی پر نمودار ہونے والی عبارتیں پڑھ لیتی تھیں ایسے میں نے بھی انجانے میں اُس کے بدن پر کندہ کوئی عبارت پڑھ لی تھی..

"کسی بھی یاد سے.. کسی بھی اولین محبت کی یاد سے چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکتا.. جیسے ایک مویشی کے بدن پر اُس کے مالک کا نشان دہکتے ہوئے لوہے سے داغ دیا جاتا ہے کہ یہ دائمی طور پر فلاں کی ملکیت ہے ایسے ہم بھی داغے جاتے ہیں.. لاکھ انکار کریں، کسی اور کے عشق کا اقرار کریں لیکن ہمارے بدن پر داغے گئے نشان اعلان کرتے ہیں کہ ہم تو فلاں کی ابدی ملکیت میں ہیں۔"

"گویا چھٹکارا کبھی حاصل نہیں ہوتا.."

"نہ.."

"یہ سب کُچھ ایک عارضی اُبال ہے.."

"نہ.."

"تو پھر بہتر یہی ہے کہ ہم اس سُونی رات میں سے فرار ہو کر اپنی پُر آسائش پناہ گاہ کو لوٹ چلیں.."

"چلو.."

فیئر بینک کی اُس رات میں منجمد موسموں کی ایسی سرگوشیاں تھیں جو برفانی کُتّوں کو بھی ہولے ہولے لوریاں سنا تیں سُلا سکتی تھیں..

○●○●○

"یہ سب ستمبر کے کرشمے تھے.. مادھولال.. لال شہباز.. ہر شے لال"

یہ سب ستمبر کے کرشمے تھے..

کہ.. ہم آتش پرست ہوئے جاتے تھے..

ہر سُو ایسی آگ سلگ رہی تھی..

ایک مدھم بہاؤ کا دریا تھا جس کے پانیوں پر کچھ بادل عکس ہوتے نقش ہوتے ہولے ہولے بہتے جاتے تھے.. اور وہ دریا مدھم مدھم اُس سلگتی آگ کی بھڑکتی سُرخی کے درمیان میں یُوں رواں تھا کہ اُس کے پانیوں پر عکس نقش بادل کہیں پیچھے نہ رہ جائیں.. دریا بھی ایسا کہ اپنے دونوں کناروں پر سلگتی آتش کو بجھاتا نہ تھا اُسے مزید بھڑکاتا تھا..

یہ سب ستمبر کے معجزے تھے..

جو ہمیں آتش پرست کرتے تھے..

ستمبر کے ان دنوں میں الاسکا کے جتنے بھی گُل بوٹے، شجر، خودرو بیلیں، جھاڑیاں، زمین پر بچھی ہوئی گھاس، مختصر قامت کے ٹھگنے شجر اور جتنی بھی ہری کچور ہریاول تھی.. یہ سب کے سب ان دنوں کسی لالہ رُخ کی مانند یُوں سُرخ بیر بہوٹی ہو رہے تھے کہ پتوں میں سے بھی لُہو پھوٹتا محسوس ہوتا تھا.. کسی ایک پتے کو مسل دیں تو اُس میں سے سُرخ خون بہہ نکلے گا.. اگر کسی شجر کی ایک شاخ کو توڑیں تو وہ لہو رونے لگے گی.. اور اس منظر کو دیکھنے والی آنکھیں..

بے شک نیلاہٹ بھری جھیلیں ہوں.. بنگال کے سیاہ سحر ہوں اور اگر وہ بے رنگ ہوں تو بھی جب وہ ان آتش کدوں کو دیکھیں تو وہ یوں لہو رنگ ہوں گی کہ اُن میں سے ایک آتش فشاں کی مانند سُرخ لاوا پھوٹ بہے گا..

اور یہ سب ستمبر کے کرشمے تھے..

میں اس سے پیشتر ٹیلر روڈ کے حوالے سے تذکرہ کر چکا ہوں کہ جب میں نے ان خطوں میں آنے والے چند سیاحوں کے سامنے ان مناظر کے آتشیں حُسن کی تفسیریں کھول دیں تو وہ قدرے متعجب ہوئے کہ جن دنوں وہ ان سرزمینوں سے گزرے تو انہوں نے نہ ٹیلر روڈ کو اور نہ ہی فیئر بینک سے اینکراج جانے والی شاہراہ کے مناظر کو یوں خون میں ڈوبا ہوا تو نہ دیکھا تھا کہ وہ موسم گرما میں اِدھر سے گزرے تھے.. بے شک ہرے کچور جنگل اور دریاؤں کے کناروں پر گھنی اور سرسبز جھاڑیوں کے انبار تھے پر وہ ایسے تو نہ تھے.. پھر کُھلا کہ یہ لہو رنگ منظر تو صرف ستمبر کے ان خزاں کی آمد کے بجھتے ہوئے دنوں میں ہی کھلتے ہیں اُن سیاحوں نے مجھے قدرے متعجب ہو کر یوں دیکھا کہ..

سودا جو ترا حال ہے ویسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

بے شک عام دنوں میں وہ ویسا تو نہ ہوگا لیکن میں نے تو اُسے جن دنوں دیکھا اسی آن میں دیکھا..

اور پھر اس آتش آفت منظر میں سے ایک برفیلا صبح کی روشنی میں سے طلوع ہوتا ایک انبار ابھرنے لگا اور سارے منظر پر حاوی ہو گیا.. امریکہ کی بُلند ترین چوٹی ماؤنٹ میکنلے.. بیس ہزار تین سو بیس فٹ بُلند.. یعنی اُس کے قدموں میں اگر سمندر ہوتا تو چوٹی سے تقریباً چار میل کی گہرائی میں ہوتا..

الاسکا والے اپنی اس چوٹی کو ایورسٹ سے بھی برتر قرار دیتے ہیں.. اُن کا کہنا ہے کہ ماؤنٹ میکنلے صرف دو ہزار فٹ کی بنیاد سے اُٹھ کر بیس ہزار فٹ تک چلی جاتی ہے جبکہ ایورسٹ جو کہ انتیس ہزار اٹھائیس فٹ بلند ہے وہ تبت کی سطح مرتفع سے صرف گیارہ ہزار فٹ اوپر اٹھتی ہے.. یوں دنیا بھر میں کوئی اور چوٹی ایسی نہیں ہے جو یُوں بنیاد سے بلند ہو کر برف کی دیواروں کی صورت اتنی بلندی تک چلی جائے..

الاسکا والے چونکہ دنیا کے آخری سرے پر معلق ہیں تو اُن تک بقیہ دنیا کی خبریں ذرا دیر سے پہنچتی ہیں اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ دنیا بھر کی خبر رکھا جائے، اپنی دنیا میں ہی مست رہنا چاہیے.. اگر وہ خبر رکھتے تو انہیں خبر ہوتی کہ اُس دنیا میں ایک ملک پاکستان نام کا ہے جس میں ایورسٹ کی سوا دنیا کی بلند ترین چوٹیاں ہیں اور اُن میں ایک قاتل حسینہ بھی برف رُوپ والی ہے جسے مقامی لوگ شل مکھی یعنی سو چہروں والی پکارتے ہیں، عرف عام میں اُسے نانگا پربت کہا جاتا ہے دنیا کی نویں بلند ترین ہمالیائی چوٹی.. اور کوہ پیمائی کے پیمانوں کے مطابق اس نانگا پربت کا رُوپل چہرہ دنیا کی سب سے بلند ترین برفانی اور چٹانی دیوار ہے.. لیکن ہم الاسکن لوگوں کو اسی زعم میں رہنے دیتے ہیں کہ ماؤنٹ میکنلے دنیا کی سب سے اونچی برفانی دیوار ہے.. ہمارا کیا جاتا ہے..

میں جن خطوں سے آیا تھا وہاں تو پہاڑوں کے دیوتاؤں کے تخت بچھے ہوئے تھے اور سب سے بلند سنگھاسن پر شاہ گوری براجمان تھی.. اور اُس کے آس پاس ماؤنٹ میکنلے ایسی بیس ہزار فٹ بلند چوٹیاں اتنی ہیں کہ اُن میں سے بیشتر کے نام بھی نہیں رکھے گئے کہ وہ اتنی کثرت میں ہیں.. جیسے کسی شاہ کے حرم میں شامل کنیزوں کا کچھ شمار نہیں ہوتا..

اس سے قطع نظر کہ ماؤنٹ میکنلے، شاہ گوری یا کے ٹو کی ان گنت کنیزوں میں سے ایک گمنام کنیز ہو سکتی تھی، وہ اپنے سفید روپ میں سوہنی اور شاندار تھی.. اس لیے کہ اس خطے میں.. یہ سر بلندی صرف اُسی کے حصے میں آئی تھی..

بیر بہوٹی، لہو سے رِستے بھڑکتے سرخ گل و گلزار میں وہ تنہا تھی جو اپنی سفیدی میں آسمانوں کو چُھوتی اُن سے ہم کلام ہوتی تھی..

یہ سب ستمبر کے کرشمے تھے..

ویسے فیئر بینک نے میرے دل کو بجھا دیا تھا..

آپ برٹش کولمبیا کی کوہستانی بستیوں اور یُوکان کی ویران وسعتوں میں جتنے روز سفر کرتے ہیں، صعوبتیں اور کلفتیں سہتے اسی لیے سہتے ہیں کہ اس کے آخر میں الاسکا ہوگا..

پہلے تو ٹوک کے آسیب سے پالا پڑتا ہے اور پھر الاسکا میں جو پہلی شب آتی ہے وہ فیئر بینک کی اداس بستی میں آتی ہے اور آپ اس دوران کیسے کیسے خواب دیکھتے رہے ہیں..تو فیئر بینک نے میرے دل کو بجھا دیا تھا..

اگر چہ آرکٹک سرکل محض آدھ گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا لیکن وہاں تو ایک بورڈ آویزاں تھا جو آپ کو خبر کرتا تھا کہ آپ آرکٹک سرکل پر قدم رنجہ فرما چکے ہیں اور یہاں سے آگے آرکٹک کی دنیا شروع ہوتی ہے..کوئی سچ مچ کا سرکل یا دائرہ تو نہیں تھا جو نظر آتا ہو اور آپ اُس پر کھڑے ہو کر ایک پُرفخر تصویر بنوا سکیں..محض ایک بورڈ کی زیارت کے لیے کس نے بھی وہاں کا رُخ نہ کیا..البتہ چند سیاحوں نے اس امکان کے بارے میں معلومات حاصل کیں کہ..آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں یعنی آئے ہیں الاسکا تو ایک آدھ برفانی قطبی ریچھ ہی دیکھ چلیں..اور معلوم یہ ہوا کہ جن علاقوں میں کسی برفانی ریچھ کی موجودگی ہو سکتی ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک عدد دس نشستوں کا ہوائی جہاز کرائے پر حاصل کرنا ہوگا، ایک ڈے ٹرپ ہوگا، فی کس کرایہ پانچ سو ڈالر ہوگا کم از کم اور جو سیاحتی ادارہ اس نوعیت کے ٹور ترتیب دیتا ہے وہ یہ گارنٹی دینے سے قاصر ہے کہ بہر طور آپ کو کوئی ریچھ نظر آئے گا..تو اس منصوبے کو ترک کر دیا گیا..پانچ سو ڈالر خرچ کر کے اگر ریچھ نظر نہیں آتا تو پھر تو لٹیا ہی ڈوب گئی اور اگر نظر آ بھی جاتا ہے تو پھر بھی پانچ سو ڈالر میں صرف ایک ریچھ بہت مہنگا ہے اور یہ اصراف ہے جو ہم مسلمانوں میں جائز نہیں..

تو رختِ سفر..الاسکا کے صدر مقام اینکر ایج کے لیے باندھ لیا گیا جو صرف ایک سو برس پیشتر محض ایک خیمہ بستی تھی..

چونکہ شہر فیئر بینک کا کچھ زیادہ دور تک نہ جاتا تھا اس لیے فوراً ہی پیچھے رہ گیا..

ابھی کچھ مختصر مسافت طے کی ہے تو شاہراہ کے آس پاس وہی لہو آمیز آتش کے سلسلے شروع ہو گئے..منظروں نے دل جگر خون کر دینے کے سامان کرنے شروع کر دیے..

اینکر ایج کو جاتی شاہراہ بھی ٹیلر روڈ کی ایک سوتیلی بہن لگتی تھی، ہو بہو اُس پر گئی تھی..

ماؤنٹ میکنلے کبھی تو شاہراہ کے عین مقابل میں نمودار ہوتی جیپ کی ونڈ شیلڈ پر اپنے سرد سانس لیتی اُسے دُھندلانے لگتی اور کبھی وہ سرکتی سرکتی بائیں جانب جاتی اُن خزاں رسیدہ جنگلوں میں کبھی روپوش کبھی ظاہر ہوتی نخرے دکھلانے لگتی..

گونج پھر پرانے چاولوں میں کمی سُنڈی کی مانند اونگھ میں پڑی تھی..

''ہیلو..''

اُس کی سیاہ سحر طراز آنکھیں نیم وا ہوئیں..''تمہاری نیند ابھی تک پوری نہیں ہوئی؟''

وہ اپنی نشست پر کسمسائی ''نہیں..تم نے رات کو مجھے سونے ہی نہیں دیا..''

''استغفراللہ..''میں نے صدمے میں آ کر کانوں کو ہاتھ لگائے...یہ کیسی ناروا الزام تراشی تھی، وہ خود ایک ست الوجود کاہل اور افیونی قسم کی گونج تھی اور الزام مجھ معصوم پر دھرتی تھی..

''ہم رُک جاتے ہیں..تم اپنی نیند پوری کر لو..''

''ہاں...جیپ کے ہر جھٹکے سے میری نیند کھل جاتی ہے تو رُک جاتے ہیں..''

اُس نے ایک طویل جمائی لی ''میں اطمینان سے سونا چاہتی ہوں..'' اور وہ فوری طور پر آنکھیں موند کر دنیا جہان سے غافل ہو گئی..

جب میں نے اُس یہ صلاح دی کہ ہم رُک جاتے ہیں اور تم اپنی نیند پوری کر لو تو اس مشورے میں ایک ذاتی لالچ پنہاں تھا..

شاہراہ کے دائیں جانب مدھم پانیوں کا وہ دریا تھا جس پر کچھ بادل نقش ہوتے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتے چلے جاتے تھے اور وہ دریا تو گویا بیر بہوٹیوں کے سُرخ جنگل کے درمیان میں لال گلال آتشیں انباروں کے درمیان رواں تھا..بے انت بے بہا جھاڑیاں، بیلیں، ٹھگنے شجر سب کے سب گویا خون میں نہائے ہوئے اُس کے پانیوں پر یوں اُمڈتے چلے جاتے تھے کہ اگر اُن میں سے کوئی بیل کنارے سے پانیوں میں گرتی تھی تو وہ اُن میں یوں گھلتی تھی جیسے اُن میں لہو کے قطرے گھول دیے گئے ہوں اور وہ پانی شہباز قلندر کی مانند لال ہو جاتے تھے..مادھو لال ہو جاتے تھے..تو یہاں پانی اور آگ کی سُرخی کا ملاپ ہو رہا تھا..وہ دونوں وصل کی بے خودی میں تھے اور کیا جانئے کب یہ شفق رنگ منظر اختتام کو پہنچ جائے تو میں خود رُکنا چاہتا تھا، اس منظر کی دل نشیں لال سُرخ گھنی یکتائی میں مدھم بہتے دریا کے کناروں پر اُتر کر کچھ لمحوں کے لیے تنہا ہو جانا چاہتا تھا..

ایسے پُرفریب، دل میں یوں اترنے والے کہ اُسے بھی خون کر دیں منظر ایک عشقِ خاص کی مانند ہوتے ہیں کہ اگر اُن کے برابر میں سے گزرتے جائیں اور اُن کے ہمراہ چند لمحے تنہا نہ گزار لیں تو وہ عمر بھر کے لیے فنا ہو جاتے ہیں..قربت کے بغیر عشق ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے..تو وصال کُھلے عام نہیں ہوتا، تنہائی میں ہوتا ہے..

جو لوگ میرے سفرناموں کے انباروں سے رغبت رکھتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ میں کہاں کہاں..افغانستان میں..سنولیک پر یا جھیل جنیوا کے کناروں پر جان بُوجھ کر تنہا ہوا..الگ سے جا بیٹھا تاکہ اُس منظر کا وصل نصیب ہو..تو منظر کے ساتھ خلوت کی یہی ہوس تھی جب میں نے گونج سے کہا کہ..ہم رُک جاتے ہیں، تم نیند پوری کر لو..

چاندی رنگ کی جیپ اینکر ایج جانے والی شاہراہ کے کنارے پر تھم چکی تھی..میں اپنی ڈھلکتی ہوئی نیلی جین کو سنبھالتا..نہایت احتیاط سے ڈھلوان پر سے اُترتا، بھربھری مٹی میں بوسیدہ ہو چکی ٹہنیاں تھیں جن پر احتیاط سے اپنے جوگرز جماتا نشیب میں اُترتا تھا، بالآخر سُرخ انار ہو چکی جھاڑیوں کے اُس انبار تک آیا جن کے درمیان میں وہ مدھم دریا بہتا تھا، میں نے واپسی کے راستے کا تعین کرنے کی خاطر مڑ کر دیکھا تو میرے اوپر سرو کے ایک ٹیڑھے ہو چکے درخت اور زرد پتوں کی ایک خمار آلود دنیا کی جھریوں میں سے شاہراہ پر رُکی جیپ کا چاندی پن کیسا نمایاں ہوتا تھا..

اور اُس ڈھکی چھپی جیپ کے اندر ایک افیونی سُنڈی گونج پڑی سوتی تھی..

میں کسی ایسے مقام کی تلاش میں ہوا جہاں بیٹھ کر میں بس پل دو پل اس منظر پر آنکھیں رکھ سکوں..لیکن وہاں کوئی ایسا پتھر نہ تھا جس پر براجمان ہو کر میں قرۃ العین طاہرہ کے شعروں کو اپنے اوپر نازل ہونے دیتا...اگر جھاڑیوں کی ٹھنڈی ہو چکی سرخ آگ میں بیٹھتا تھا تو دریا اوجھل ہو جاتا تھا تو میں اس منظر کے سامنے ایک بے دام غلام کی مانند کھڑا ہو

گیا اور اُس عالم تنہائی میں اُسے اپنے اندر اترنے دیا..

یہاں اس نشیب تک بلندی پر شاہراہ پر سے گزرتی ٹریفک.. کبھی کبھار گزرتی ٹریفک کی بھی کانوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی..

یہ ایسی معجزہ تنہائی تھی جس میں اگر میں پارسا ہوتا تو مجھ پر پیغمبری اُتر آتی، دریا کے پار بھی وہی سرخ پتوں اور شجروں کے بن تھے.. تحیر کے کرشموں کی سُرخی میں ڈوبے ہوئے لہو رنگ تھے..

کوئی بھی کرشمہ ساز سحر طراز منظر ہو.. وہ آپ پر تب تک وارد نہیں ہوتا جب تک آپ اُسے ایک دیوتا مان کر اُس پر ایمان لا کر اُس کے آگے سرنگوں نہیں ہو جاتے.. اُسے بہ رضا و رغبت اپنے آپ پر حاوی نہیں ہو جانے دیتے.. اور اگر آپ سر نہیں جھکاتے، اپنے تکبر میں مبتلا گردن اکڑائے اُس پر نظر کرتے ہیں تو وہ منظر آپ کو اس قابل نہیں گردانتا کہ اپنے بھید اور حسن کے کرشمے آپ پر آشکار کرے.. وہ معدوم ہو جاتا ہے..

قدرت کے ایسے دم بخود کر دینے والے مظاہر دراصل منصور حلاج کی مانند انا الحق کی سرگوشیاں کرتے ہیں.. اُن کے پتے پتے بُوٹے بُوٹے میں اُس تخلیق کار کی رُوح تیرتی ہے، وہ سب اُس کی نشانیاں ہیں.. تو جو کوئی بھی ایسے مظاہر قدرت کے سامنے سر نہیں جھکاتا وہ اُس سے انکار کرتا ہے.. منکر ہے.. ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہے..

وقت کے گزرنے، بیتے جانے کے سارے آثار، کُل پیمانے تھم چکے تھے.. میں ہر سُرخ پتے، ہر جھاڑ جھنکار کے لہو پن کو.. اور اُن میں مدھم بہتے پانیوں کو یُوں دیکھتا تھا جیسے وہ میری حیات کا آخری منظر ہوں.. موت سے پہلے کا منظر ہوں.. اور اگر میری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوتی ہیں تو اُن میں کچھ دیر تو اس منظر کے لال گلال عکس ٹھہریں گے اور پھر فنا کی تاریکی غالب آئے گی.. اور اگر قضا یوں آ جائے، اس طور آ جائے تو کیا غم.. کچھ اور لمحے اور پھر میں نے اپنے انہماک سے باہر آ کر پیچھے مڑ کر بلندی کی جانب نظر کی تو وہاں ایک ٹیڑھے میڑھے سرو کے درخت اور زردی کے بچاؤ میں جھلکتی جیپ کو دیکھا..

اور یہ منظر.. ایک ویران الاسکن لینڈ سکیپ میں کہیں بلندی پر ایک جیپ کی جھلکیاں مجھے کچھ شناسا سا لگیں..

یہ منظر تو میں نے پہلے کہیں دیکھ رکھا تھا.. پر کہاں..

ایک نہایت پُرکشش اور اداس فلم ''اِن دے وائلڈ'' میں..

امریکی معاشرے میں ایک کامیاب اور متمول والدین کا خوش شکل بیٹا جب یونیورسٹی میں ایک بلند پوزیشن حاصل کرتا ہے تو اُس کے پُرفخر ماں باپ اُس کے پے ایک درخشاں مستقبل کے منصوبے اُس پر لاگو کر دیتے ہیں اور وہ انکاری ہو جاتا ہے کہ میں ابھی آوارگی کرنا چاہتا ہوں، مجھے دنیا دیکھنی ہے۔ میں آپ کے منصوبوں میں بندھ نہیں سکتا اور وہ سفر اختیار کرتا ہے.. یوں کہ اُس کی جیب میں جتنی بھی رقم ہوتی ہے، اُسے ایک شاہراہ کے کناروں پر رکھ کر جلا دیتا ہے کہ ان کے سہارے دنیا نہیں دیکھنی.. بے سہارا اور خالی جیب دیکھنی ہے.. اور وہ منزلیں مارتا برف پوش الاسکا جا پہنچتا ہے.. اور وہاں جب وہ سردی سے نیلا پڑ چکا ہوتا ہے، مرنے والا ہوتا ہے تو اُسے ایک متروک شدہ زنگ آلود بس کے ڈھانچے میں پناہ ملتی

ہے جو فیئر بینک سے اینکر اینج جاتے ہوئے خراب ہوئی تھی.. جسے ناقابل مرمت قرار دے کر وہیں ترک کر دیا گیا تھا..

وہ اُس میں رہائش اختیار کر لیتا ہے، روزانہ ڈائری لکھتا ہے.. اپنے ماں باپ کو اور خاص طور پر اپنی دوست بہن کو یاد کرتا ہے.. کبھی ریچھ آ جاتے ہیں اور اُسے سُونگھ کر چلے جاتے ہیں۔ ایک بار وہ ایک بارہ سنگھا شکار کرتا ہے لیکن اُس کا گوشت بھیڑیے کھا جاتے ہیں۔ بھوک سے عاجز آ کر وہ کسی جھاڑی کے بیر کھا لیتا ہے اور جب طبیعت بگڑتی ہے تو اُس متروک شدہ بس میں ''الاسکا کی جنگلی جھاڑیاں اور بُوٹے'' نام کی ایک تحقیقی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو اُسے علم ہوتا ہے کہ جو بیر اُس نے کھا لیے ہیں وہ نہایت زہریلے ہیں اور انہیں کھانے والا بہر طور موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے..

الاسکا کے اُن برف بھرے ویرانوں میں بارہ سنگھوں کے تعاقب میں سرگرداں چند شکاری آ نکلتے ہیں اور وہاں ایک موسموں کی ماری ہوئی زنگ آلود بس کے ڈھانچے کے اندر چیک شرٹ اور نیلی جین میں ملبوس ایک جوانِ رعنا مُردہ پڑا ہے اور اُسے مرے ہوئے بیس روز گزر چکے ہیں..

''اِن دے وائلڈ'' ایک تصوراتی کہانی نہ تھی، حقیقت پر مبنی تھی.. اُس نوجوان کے مردہ بدن کے قریب اُس کی ڈائری پڑی تھی اور وہی اس فلم کی سکرپٹ تھی.. کیمرے میں جو فلمیں محفوظ تھیں انہیں پرنٹ کروایا گیا تو اُن میں سے ایک تصویر میں وہ اُس زنگ آلو بس کے ڈھانچے سے ٹیک لگائے، چیک شرٹ اور بوسیدہ جین میں ملبوس کیمرے کے لینز میں دیکھتا مسکرا رہا ہے.. کہ میں نے طے شدہ راستوں سے انحراف کر کے.. دنیا دیکھ لی ہے..

''اِن دے وائلڈ'' کی اُس زنگ آلود متروک شدہ بس کے ساتھ ہی ذرا نیچے گہرائی میں ایک دریا بہتا تھا اور وہ نوجوان جب مُنہ ہاتھ دھونے کی خاطر نیچے اُترتا تھا تو ہمیشہ مڑ کر دیکھتا تھا اور اُسے وہ بس گھنے درختوں میں نیم روپوش نظر آتی..

اور میں بھی جب مڑ کر اوپر نگاہ کرتا تھا تو وہاں ہو بہو ''اِن دے وائلڈ'' کا وہی منظر ہو بہو نقش ہوتا.. ایک ٹیڑھے میڑھے سرو کے درخت اور سرخ جھاڑیوں میں سے وہ جیپ جھلکتی تھی.. اگرچہ وہ بس کی مانند ویران نہ تھی اُس میں ایک ایبونی گونج نیند میں مری پڑی تھی..

میں وہاں اُس منظر کے تحیر میں مبتلا دل ہی دل میں قیاس کے تصوراتی پنچھی اُڑاتا رہا کہ اگر مجھ پر وہی دن ہوتے جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر بطخ راج ہنس نظر آتی ہے اور میں یُوں ایک سہولت آمیز شریفانہ سفر نہ کر رہا ہوتا۔ حسب خصلت کاندھوں پر ایک رُک سیک ہوتا، مارا مارا پھرتا یہاں آ نکلتا تو یقیناً اس دریا کے کنارے بیر بوٹیوں کے لہو سے پھوٹتے انباروں میں کہیں اپنا خیمہ ایستادہ کر کے اِدھر ایک رات گزارتا.. محض ذہنی عیاشی کی خاطر میں نہایت سنجیدگی سے کوئی ایسا مقام تلاش کرنے لگا جہاں میں اپنا خیمہ نصب کرتا.. لیکن میں مکمل خاموشی میں دل جمعی سے ایسا مقام اس لیے نہ تلاش کر پایا کہ اس دوران میرے کانوں میں پولیس کے ہُوٹر کی ہاں ہاں مسلسل اُترنے لگی.. شاہراہ سے الگ ہو کر ایک پولیس جیپ ہماری پارک شدہ جیپ کے قریب رُک رہی تھی... میں فوراً گرتا پڑتا ڈھلوان پر چڑھتا اوپر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پولیس افسر نہایت استری شدہ نفیس وردی میں ملبوس، کولہے پر ابھرے ہوئے ریوالور پر ہاتھ رکھے جیپ کے اندر

جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے..

''یس آفیسر..''

اُس نے مجھے تحقیقی نظروں سے دیکھا، میرا جائزہ لیا اور یکدم چڑھائی چڑھنے سے میری جو حالت غیر ہوئی تھی اُس کا مشاہدہ کیا ''اینی پرابلم سر.. آپ کی جیپ یہاں کیوں کھڑی ہے؟''

''میں..'' شاید جیپ کو یُوں شاہراہ کے کنارے پر پارک کر دینا غیر قانونی تھا اس لیے میں تھوڑا سا نروس ہو گیا ''میں.. آئی ایم سوری.. لیکن.. میں ذرا اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی خاطر نیچے چلا گیا تھا.. تو ابھی چلا جاتا ہوں..''

''نہیں نہیں..'' وہ نہایت خوش اخلاق لہجے میں بولا ''میں نے آپ کی جیپ کو یُوں کنارے پر رُکا ہوا دیکھا تو مجھے شک ہوا کہ شاید آپ کسی پرابلم میں ہیں تو میں آپ کی مدد کروں.. پلیز اگر آپ ابھی ہلکے نہیں ہوئے تو اطمینان سے ہلکے ہو آیئے.. گڈ ڈے..''

عُونج جیپ کے اندرون میں مست سوتی تھی، اُسے کُچھ خبر نہ ہوئی کہ باہر پولیس کے ہُوٹر بجتے رہے ہیں اور میں واپس آ چکا ہوں.. البتہ اُس کی چونچ ایک معصوم سی پرندہ مسکراہٹ میں وا تھی، شاید کسی اڑان کے خواب میں تھی یا کسی ایسی نرغونج کے خیال میں تھی جو اُس کی بچپن کی محبت تھی..

یہ میرے حق میں بہتر ہوا کہ وہ ابھی تک بے خبر سوتی تھی کہ میں جو منظر اپنی آنکھوں میں بھر لایا تھا، کُچھ دیر میں اُسی کے تحیر میں گُم تنہا رہنا چاہتا تھا، گفتگو کسی سے بھی نہ کرنا چاہتا تھا..

یا تو ہر کوئی تیرا تذکرہ کرے.. یا پھر کوئی بھی ہم سے گفتگو نہ کرے..

○●○●○

''ماؤنٹ میکنلے کی برفیں ایک مُردہ بارہ سنگھے کو زندہ کرتی ہیں''

جب ہم فیئر بینک سے تقریباً پونے دو سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تو ''رائلے کریک'' نامی ایک کھلونا ماڈل قسم کے قصبے میں داخل ہوئے.. زرد پہاڑوں کی اوٹ میں سچ مچ کے گھر تو نہ تھے، گھروندوں کے خوش نما چوبی ڈھلوان چھتوں والے خوش نظر ماڈل تھے.. سوئٹزرلینڈ کے ''شیلے'' جھونپڑوں کی مانند تھے.. ہوٹل، ریستوران، ٹور آپریٹرز اور تحائف کی دل کش دوکانیں تھیں اور اُس قصبے میں جتنے بھی لوگ تھے وہاں کے نہ تھے، دنیا بھر سے آئے ہوئے پُرشوق سیاح اور آوارہ گرد تھے جو الاسکا کی سب سے بڑی کشش دینالی نیشنل پارک کی وحشی رعنائیوں کو دیکھنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس کے جنگلوں میں وافر تعداد میں مٹکنے والے بھاری بھرکم گرزلی بھالوؤں کی قربت کے لیے آئے تھے.. شمالی امریکہ کی برفیلی بلندیوں والی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ میکنلے کے دامن میں راتیں گزارنے کی خاطر چلے آئے تھے..

رائلے کریک.. دینالی پارک کا صدر دروازہ ہے..

اس قصبے میں صرف وہی قیام کرتے ہیں جو رات گئے یہاں پہنچتے ہیں یا کسی آفت میں مبتلا ہوتے ہیں ورنہ وہ یہاں پہنچتے ہی دینالی پارک کی ساٹھ ہزار ایکڑ میں پھیلی ہوئی گھنے جنگلوں کی اندھیر نگری میں اُتر جاتے ہیں.. کہا جاتا ہے کہ اگر دینالی پارک میں پیدل یا جیپ پر آوارہ گردی کرتے ہوئے پہلے روز ہی یکدم آپ کے سامنے ایک بہت بڑا بھالو.. ایک گرزلی ریچھ نمودار ہو کر دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ہُو ہُو نہ کرنے لگے تو آپ دنیا کے بدقسمت ترین شخص ہیں..

لیکن ہمارے سیاحتی منصوبوں میں دینالی پارک کی وحشی ونڈر لینڈ میں کُچھ روز بھٹکنا شامل نہ تھا کہ ہمارے پاس دن تھوڑے تھے.. یا تو ہم سیدھے یہاں رائلے کریک آ کر دینالی پارک میں اُتر جاتے اور پھر واپس چلے جاتے اور یا پھر الاسکا کے طول و عرض میں مسافتیں کرتے پھرتے..

میں بنیادی طور پر ایک باشعور، سوچ سمجھ کر قدم رکھنے والا شخص نہیں ہوں بلکہ کسی ایک چہرے یا جھیل پر شعور سے بیگانہ ہو کر مر مٹنے والا ایک شخص ہوں..

جیسے میں اپنے دوست نذیر صابر صاحب کی میز کے شیشے تلے سجے ایک کارڈ پر جھیل کرومبر کی تصویر دیکھ کر مر مٹا تھا.. تو ایسے ہی میں ماؤنٹ میکنلے کی ایک تصویر پر ریجھ گیا تھا... کوئی ایک گھنے ویرانوں میں ایک نیلگوں جھیل جزیرہ ہے اور اُس پر ماؤنٹ میکنلے کے برف انباروں کے ڈھیر یوں جُھکے ہوئے ہیں کہ پانیوں پر ایک اور ماؤنٹ میکنلے اپنی ساری کاملیت میں عکس ہوتی ہے..

جیسے فیئری میڈو کے داخلے پر ایک مختصر سا جوہڑ ہے اور اگر آپ کسی سویرے مُنہ اندھیرے بیدار ہو کر اُس کے کناروں پر چلے آئیں اور ذرا جھک کر ایک خاص زاویے پر اُسے نظر میں لائیں تو اُس جوہڑ کے شفاف پانیوں میں پوری کی پوری نانگا پربت عکس ہو رہی ہوتی ہے.. میں نے اس مقام کی ایک سویرے ایک تصویر اُتاری تھی.. وہ ایک عرصہ میری البم میں آویزاں رہی اور پھر ایک روز احساس ہوا کہ یہ تصویر تو اُلٹی لگی ہے، نانگا پربت کا نہ کوئی اُلٹا تھا اور نہ سیدھا. فرق تب کھلا جب میں نے غور سے دیکھا کہ اس تصویر میں چراگاہ میں چرتی ایک بکری اُلٹی نظر آ رہی ہے.. پانیوں پر فیئری میڈو کی سرد سویر میں عکس ہوتی نانگا پربت اتنی کاملیت میں تھی.. ماؤنٹ میکنلے بھی نانگا پربت کے مانند اُس جھیل میں یوں نقش ہوتی تھی کہ اُس کے اُلٹے سیدھے کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا..

بعد کے زمانوں میں جب میں ایک امریکی واقف کار کو اپنے سفر الاسکا کے قصے بیان کر رہا تھا تو اُس نے یکدم کہا "ٹھہرو.. ٹھہرو.. کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم الاسکا گئے اور دینالی پارک نہیں دیکھا.. جیسے ایک شخص انڈیا جائے اور تاج محل نہ دیکھے.. تم نے اگر دینالی پارک نہیں دیکھا تو آئی ایم سوری تم نے الاسکا نہیں دیکھا۔"

بے شک میں دینالی نہ دیکھ سکا.. لیکن آپس کی بات ہے کہ وہاں گھنے جنگلوں، ندیوں، جھیلوں اور برفانی بلندیوں کے سوا اور کیا ہوتا.. اور یہ سب کچھ تو میں اس سفر کے دوران اتنا دیکھ چکا تھا کہ جی بھر گیا تھا، آنکھیں عاجز آ چکی تھیں بلکہ کسی بے رُوح ویران بے جان دل کو آزار دینے والی سرزمین کو دیکھنے کے لیے ترستی تھیں۔

ہم نے "رائلے کریک" کے ایک بجھے ہوئے ریستوران میں بعد از دوپہر کچھ کھانا کھایا جو بیش قیمت تو تھا پر ذائقے سے قطعی طور پر بے بہرہ تھا.. اس ریستوران کا ماحول کچھ دوستانہ نہ تھا.. وہاں جتنے لوگ تھے وہ سب کے سب اپنی شناخت اور نسل کے تنہا جزیروں میں قید تھے.. آپس میں کچھ ربط نہ تھا.. البتہ ریستوران کی بار کے کاؤنٹر پر بھاری پیٹھوں والی جو دو خواتین بمشکل براجمان تھیں وہ ایک بہکے ہوئے سیاح کے مخمور پن سے چُہلیں کر رہی تھیں.. وہ قدرے ادھیڑ عُمر تھیں۔ خاصی ادھڑ چکی تھیں اور کچھ ایسی خوش نظر نہ تھیں.. اگر خوش نظر ہوتیں تو رزق روزگار کے لیے الاسکا میں ہی کیوں آ نکلتیں.. اپنے اپنے قصبوں اور بستیوں میں ہی دھندہ کیوں نہ کرتیں.. اس لیے کہ وہاں اُن کی کچھ مانگ نہ تھی..

گونج اس وقفے کے دوران سمٹی سمٹائی گُھوک سوتی رہی۔ یہاں تک کہ مجھے خدشہ ہوا کہ موصوفہ انتقال فرما چکی ہیں..

اور یہ کیا ہولناک خدشہ تھا کہ اگر ایک گونج انتقال کر جاتی ہے تو اُسے کیسے اور کہاں کفناتے دفناتے ہیں.. کیا اُس کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں، سوئم یا چالیسواں کرتے ہیں.. اور الاسکا میں کیا کوئی ایسا قبرستان ہوگا جو محض گونجوں کے لیے مختص ہوگا..

تو میں نے ذرا تشویش ناک ہو کر رائلے کریک سے باہر آتے ہوئے اُس کے سفید پروں کو چھوا.. اور وہ ایسے لگتے تھے جیسے حدّت سے بُھورے ہونے کو ہوں.. جیسے گرم توے پر چھڑکا ہوا سفید آٹا بھورا ہونے لگتا ہے.. میں نے اُسے چھوا تو اُس نے اپنے حدّت بھرے بدن کو تان کر ایک جمائی لی "کیا ہم اینکر ایج پہنچ گئے ہیں.."

"نہیں.."

"تو پھر تم نے مجھے جگایا کیوں ہے.. مجھے اپنی نیند پوری کر لینے دو۔"

"سنو گونج.." میں نے اُسے خوب جھنجھوڑا "ہم ابھی اینکر ایج کی راہ میں ہیں.. طویل فاصلے طے کر چکے اور رائلے کریک.. میں کھانا تناول فرما کر اب کے سفر میں ہیں۔"

وہ یکدم ہوشیار ہو گئی "تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں.. میں اُس ماؤنٹ میکنلے کو زمین پر دیکھنا چاہتی تھی جسے میں نے اپنی اڑانوں کے دوران بہت نیچے اپنے پروں تلے متعدد بار دیکھا ہے اور ہمیشہ اُسے ناپسند کیا ہے کہ اُس کے سفید وجود میں سے برفانی لہریں اوپر آسمانوں تک آتی تھیں۔ وہ مجھے منجمد کر دیتی تھیں اور میں گرتی گرتی بچتی تھی.."

"ماؤنٹ میکنلے ابھی تک یہیں ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھ لو۔" میں نے اُسے متوجہ کیا، جیپ کے عقبی شیشے میں اُس کے برف انبار پیچھے رہتے جا رہے تھے..

جب سے ہم الاسکا میں داخل ہوئے تھے تب سے جیپ کی ونڈ شیلڈ صرف تیز ہواؤں کی زد میں ہی نہ آتی تھی بلکہ اَن گنت کیڑے مکوڑے، پتنگے، بھنگے، بھنورے، مچھر اور جانے کیا کیا جو نظر میں نہ آتا تھا اس کے شیشے سے ٹکراتا بے جان ہو کر چپکتا جاتا تھا.. مردہ ہو کر چسپاں ہو جاتا تھا یُوں کہ ونڈ سکرین پر ایک نیم سیاہ لیپ سا پھر جاتا تھا اور اُس کے پار دیکھنا ناممکن ہو جاتا تھا.. میں نے اپنے تئیں بے حد کوشش کی کہ ونڈ سکرین کو صاف کر سکوں لیکن کیڑوں مکوڑوں کا وہ ملیدہ گوند کی مانند ایسا چپکا تھا کہ گیلی ٹاکی مارنے سے بھی کچھ افاقہ نہ ہوتا تھا اور تب گونج نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور میں اُس کی دانش کا قائل ہو گیا.. وہ ہر سو پچاس کلومیٹر کے بعد جیپ سے اُترتی.. ونڈ سکرین پر کوئی خاص محلول جو اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا چھڑکتی اور پھر ایک خاص وائپر سے اُسے پونچھنے میں مگن ہو جاتی.. اس دوران ظاہر ہے میں جیپ میں بیٹھا رہتا اور اُسے نہایت محویت سے تکتا رہتا.. وہ انتہائی انہماک سے کسی حد تک ایک افسردگی کے ساتھ ونڈ سکرین کو ہولے ہولے وائپر سے صاف کرتی رہتی.. میری جانب ہرگز نظر نہ کرتی اور وہ ویسے تو رُو بہ رُو ہوتی سوائے اس کے کہ ونڈ سکرین کا شیشہ درمیان میں حائل ہوتا.. اُن لمحوں میں مجھے اُس کے چہرے پر دُکھ کے آثار نظر آتے، کوئی ایسا رنج تھا جس میں وہ مجھے شریک نہ کر سکتی تھی لیکن وہ مجھے اتنی پُرکشش لگتی کہ اگر میں ایک نر گونج ہوتا تو اُس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا.. اور کبھی یہ پرکھنے کے لیے کہ ونڈ سکرین شفاف ہو چکی ہے، وہ اپنی آنکھیں اُس کے قریب لے آتی اور میرا جی چاہتا کہ میں ذرا آگے ہو کر اپنے ہونٹ ونڈ سکرین کے ساتھ لگا دوں..

اکثر یوں ہوتا کہ ونڈ شیلڈ صاف کرنے کی حاجت بھی نہ ہوتی اور میں کہتا کہ گونج مجھے اس کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا پلیز اسے شفاف کر دو..

جیپ کے پٹرول پیمانے کی سُرخ سوئی بہت نیچے تک گر چکی تھی.. اس سے پیشتر کہ ہم تشویش میں مبتلا ہوتے شاہراہ کے کنارے پر ایک ویران اور گھریلو سا صرف ایک پمپ والا گیس سٹیشن نظر آ گیا اور وہاں رُکتے ہیں تو نہ کوئی آدم اور نہ کوئی آدم زاد..

متعدد بار وقفوں کے ساتھ ہارن بجانے کے پُرشور نتیجے میں ایک نزدیکی جھونپڑے میں سے ایک فربہ خاتون نمودار ہوتی ہے، نہایت بے دلی سے جیپ کے خالی پیٹ کو لبریز کر کے رقم وصول کر کے کچھ بھی کہے بغیر واپس چلی جاتی ہے.. چونکہ ونڈسکرین ایک مرتبہ پھر کریش لینڈنگ کرنے والے کیڑے مکوڑوں کا قبرستان بن چکی ہے اس لیے کونج ایک مرتبہ پھر اُسے نہلانے اور پُونچھنے میں جت جاتی ہے.. اس دوران ویران شاہراہ کے کناروں اور اُس کے پس منظر میں ماؤنٹ میکنلے کی سفید پوشی ابھی تک دھندلاتی نظر آتی جاتی ہے ایک وسیع و عریض لینڈ روور اُترا.. جس کے ٹائروں تلے یکدم رُکنے سے جو مٹی آئی وہ دھول کے ذرّے ہو کر یوں اٹھی کہ ماؤنٹ میکنلے کو بھی روپوش کر دیا..

لینڈ روور کے اگلے حصے میں سے یکے بعد دیگرے تین امریکی نوجوان کود کر نیچے آئے، وہ تینوں میلے کچیلے تھے اور لفنگے سے لگتے تھے البتہ اُن میں سے ایک معنک نوجوان قدرے معصوم سا دکھائی دیتا تھا جو شاید عارضی طور پر لفنگا ہو گیا تھا... دوسرا ایک فرنچ داڑھی میں اتنا سفید فام اور گلابی سا کہ وہ سؤر سا دکھائی دیتا تھا.. اور تیسرے صاحب خوب فربہ اور پھیلے ہوئے..

لینڈ روور کے پچھلے کھلے ہوئے حصے میں تین پہیوں والی دو طاقتور موٹر سائیکلیں رسّوں سے بندھی تھیں جو الاسکا میں بے حد پاپولر تھیں کہ وہ جنگلوں اور ویرانوں کی اونچ نیچ میں نہایت متوازن انداز میں چل سکتی تھیں۔ اس نوعیت کی تین پہیوں والی موٹر سائیکلوں کو میں نے پہلی بار قطر کے صحرا میں دیکھا تھا اور قطری نوجوان انہیں زرد ریت کے ٹیلوں پر دوڑاتے مرحبا مرحبا کے نعرے لگاتے تھے..

موٹر سائیکلوں اور کیبن کے درمیان میں سیاہ رنگت کا ایک بہت بڑے حُجم کا.. بارہ سنگھا بندھا ہوا تھا اور ظاہر ہے وہ شکار ہو چکا تھا.. اُس کے پُر پیچ پُر شکوہ سینگ یوں بلند ہو رہے تھے جیسے وہ موٹر سائیکلوں پر اُگے ہوئے ہوں..

الاسکا کے شاہراہوں اور ذیلی راستوں پر یہ منظر بہت تواتر سے دکھائی دیتا تھا.. ایک لینڈ روور جس کے پچھلے حصے میں اگر وہ ابھی شکار کے لیے نکلے ہیں تو تین پہیوں والی موٹر سائیکلیں اور اگر کامیاب واپس آ رہے ہیں تو ایک مُوس یا بارہ سنگھا مردہ حالت میں جس کے خون آلود بدن پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں اور میں اس منظر کو دیکھ کر ہمیشہ سہم جاتا تھا کہ میں نہ تو اُڑان کرتی کسی مرغابی کو اور نہ ہی کسی کھوہ میں سے جھانکتے سنو ٹائیگر کو مار ڈالنے کا تصور کر سکتا تھا کہ میں کچھ ایسا مرد نہ تھا.. مردانگی کی دلیل کے ثبوت میں ہمیشہ یا تو فتح شدہ خواتین کے اعداد و شمار فخر سے پیش کیے جاتے ہیں اور یا پھر شکار شدہ جانوروں کے سینگ یا کھالیں.. شکار کرنا.. بگ گیم ہنٹنگ.. ارنسٹ ہیمنگوے کی مانند ایک مردانہ کھیل سمجھا جاتا ہے.. میں نے تو بھتو شیخ کی بنائی ہوئی غلیل سے جب پہلی چڑیا کو کیکر کے درخت سے مار گرایا تھا اور وہ میرے سامنے سُوکھی زمین پر یوں تڑپی تھی کہ اُس کا ناخن بھر کا بھیجہ باہر نکل آیا تھا تو میں ہمیشہ کے لیے شکار سے تائب ہو گیا تھا.. یوں جانیے کہ میں نامرد ہو گیا تھا۔

مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ جب ایک شکاری کی بندوق کے ٹیلی سکوپک لینز میں، ایک انسانی بدن سے کہیں خوش آثار جانور کا وجود.. میدانوں میں گھاس چرتا.. برفوں پر شاہانہ انداز میں ٹہلتا جب ظاہر ہوتا ہے تو اُس کے شاندار حُسن کی تمازت سے اُس شکاری کی آنکھیں چندھیا کیوں نہیں جاتیں اور وہ کیسے بندوق کی لبلبی دبا کر اُسے مار ڈالتا ہے.. مردہ کر

دیتا ہے اور وہ گھاس بھرا میدان اور برفیں اجڑ جاتی ہیں..

اگر مردانگی کا ثبوت صرف نسوانی فتوحات اور مردہ جانور ہیں تو مجھ ایسے نامرد کم ہی ہوں گے..

وہ تینوں شکاری جب شاہراہ سے بچھڑ کر دھول اور کنکر اُڑاتے ہمارے قریب آ رُکے ہیں، کود کر نیچے اُترے ہیں تو انہوں نے پہلی بار یہی دیکھا کہ ایک گیس سٹیشن ہے اور وہاں اُن کی توجہ کا کوئی طالب نہیں ہے.. البتہ ایک چاندی رنگ کی جیپ کھڑی ہے جس کی ملگجی ہو چکی ونڈسکرین کو ایک کونج نہلاتی ہے اور وائپر سے پُونچھتی شفاف کرتی ہے اور بہت ممکن ہے.. اور انہیں یُوں کود کر اترتے دیکھ کر اُس سلور جیپ میں سے اپنی ڈھلکتی نیلی جین اُڑستا فربہ ہوتا، ادھیڑ عمر گندمی رنگت کا ایک ایسا شخص اُترا ہے جس کی آنکھوں میں خُون اترا ہوا ہے.. جیسے اُن میں لال گلال بیر بہوٹیوں نے بسیرا کر رکھا ہو اور سُرخی اُس کی آنکھوں میں سے لہو کی مانند ٹپکنے کو ہے.. تو اُن تینوں میں سے جو بہت گورا گلابی... سؤر سا لگتا تھا، وہ اُس کے قریب آ کر ہیلو ہائے کے تبادلے کے بعد پُوچھتا ہے "یہاں کوئی ہے؟"

"آپ اگر اپنے لینڈ روور کے ہارن پر ہاتھ رکھتے ہیں.. اُسے عمل کرنے دیں تو کوئی ہے.."

وہی فربہ خاتون پھر سے اپنے جھونپڑے میں سے ظاہر ہوتی ہے، بے دلی سے اُن کے لینڈ روور کا شکم پٹرول سے بھرتی ہے اور کچھ کہے بغیر وصول شدہ رقم گنتی واپس چلی جاتی ہے..

"فنی وومین" وہ جو معنک تھا مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کہاں کے ہو؟"

"پاکستان.."

اُن تینوں نے اپنی نظروں سے کچھ تبادلہ سا کیا "اوہ واقعی.. ہم نے تو آج تک الاسکا میں کوئی پاکستانی نہیں دیکھا.."

"اور یقین کریں میں نے بھی پاکستان میں کبھی کسی الاسکن کو نہیں دیکھا۔"

وہ جو موٹا تازہ شکاری تھا، وہ ہنسنے لگا.. "شاید تم درست کہتے ہو.. اور وہ.. وہ کون ہے؟"

میرا اولین تاثر درست ثابت ہوا تھا کہ وہ لفنگے تھے، وہ مسلسل ونڈسکرین کو پُونچھنے میں مصروف کونج کو تاڑ رہے تھے، اگرچہ وہ تارڑ کے ساتھ تھی..

"یہ میری ہم سفر ہے.. فلوریڈا کی سرمئی کونجوں کے قبیلے میں سے ہے.. واہ.. کیا شاندار بارہ سنگھا ہے جو آپ نے شکار کیا ہے۔"

وہ کونج کو بھول بھال گئے اور اپنے شکار کے بارے میں پُرجوش ہو گئے "تم جانتے ہو کہ ہم پورے تین دن دینالی پارک کے جنگلوں میں خوار پھرتے پھرے اور اس دوران ہم نے کم از کم چار گرزلی ریچھ دیکھے لیکن حرام ہے کہ اگر ہمارے سامنے کسی بارہ سنگھے کا بچہ بھی آیا ہو.. اور صرف ہمیں الاسکا کے باسیوں کو بارہ سنگھوں کے شکار کے لیے کوئی اجازت درکار نہیں.. تو جب ہم مایوس ہو کر پلٹنے کو تھے تب یہ بیوٹی.. یہ جنگل کے اندھیروں میں سے یوں نمودار ہوا کہ ہم سناٹے میں آ گئے.. اور یہ اتنا بڑا تھا کہ اس کا سایہ ہمارے چہروں پر پڑتا تھا اور یوں ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا جیسے ہمارا ہی منتظر ہو.."

"آپ اس کا کیا کریں گے؟"

''پہلے تو ہم اپنے گاؤں میں گھوم کر اس کی نمائش کریں گے کہ یہ دیکھو لوگو ہم نے کیسا شاندار جانور شکار کیا ہے اور انہیں حسد سے راکھ کر دیں گے۔ پھر اس کے سینگ اور تھوتھنی کاٹ کر انہیں حنوط کروا کے اپنے گھر میں آویزاں کریں گے.. اور جو بقیہ دھڑ ہوگا وہ ڈگلس کے سپرد کر دیں گے جو کہنے کو تو ایک کسان ہے لیکن شکار شدہ بارہ سنگھوں کا گوشت نفاست سے کاٹنے میں مہارت رکھتا ہے.. گوشت کا کچھ حصہ تو ہم اپنے عزیزوں اور دوستوں میں بانٹ دیں گے اور بقیہ اپنے فریج میں محفوظ کر لیں گے.. تم نہیں جانتے کہ الاسکا کے سرمائی موسموں میں اس کا گوشت کیسے بدن میں آگ لگا دیتا ہے... اگر تم ہمارے ہمسائے ہوتے تو ہم تمہیں بھی اس کا سُرخ توانا گوشت بھیجتے..''

ایسے کسی شاندار جانور کو ہلاک کر دینا میرے نزدیک تو ایک جُرم ہے لیکن اگر اس جُرم کا ارتکاب ہو چکا ہے تو اُس کا گوشت کھا لینے میں کچھ قباحت نہیں جیسا کہ ہم نے ''یاک سرائے'' کے سفر کے دوران مارخور کی ران نہایت اشتیاق سے تناول فرمائی تھی۔ اگرچہ اناڑی باورچی نے اُسے شوربے میں غرق کر دیا تھا..

اس گفتگو کے دوران حرام ہے اگر کوبج نے ونڈ سکرین کو جھاڑنے پونچھنے میں کوئی وقفہ ڈالا ہو یا ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو.. وہ ورکشاپ کے کسی ''چھوٹے'' کی مانند صفائی ستھرائی میں مشغول رہی.. البتہ میں دیکھ سکتا تھا کہ اُن تینوں شکاریوں کی نظریں اُس کی جانب بھٹک بھٹک جاتی تھیں.. جیسے وہ اس امکان کا جائزہ لے رہے تھے کہ ایک کوبج کا شکار بھی اُسی بندوق سے کیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ انہوں نے بارہ سنگھے کو ہلاک کیا تھا..

ابھی ماؤنٹ میکنلے کی برفیں تیز دھوپ میں چاندی کے گہنوں کی مانند جگ مگ کرتی تھیں اور ابھی پیتل کے زیورات کی مانند مدھم پڑنے لگی تھیں کہ دوپہر ڈھل رہی تھی.. اینکر ایج ابھی خاصے فاصلے پر تھا..

ہم جس خطے میں سے گزر کر آئے تھے اسے الاسکا کا سُنہری دل کہا جاتا تھا.. اب ہمیں اس دل کے پار جانا تھا..

شکاریوں کے لینڈ روور کے بھاری ٹائر گھومے، اُن کے بے تحاشا گھومنے سے چند کنکر اُڑے، کچھ دھول اٹھی اور پھر اُس کے ٹائر شاہراہ کے ہموار پن پر رواں ہو گئے.. اور جب وہ لینڈ روور دور ہوتا تھا تو اُس مردہ بارہ سنگھے کے گنجلک اور عالی مرتبت سینگ یوں اٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ ماؤنٹ میکنلے کی برفوں میں چھید کر ڈالیں گے.. اُن میں دفن ہو کر پھر سے زندہ ہو جائیں گے اور اپنے آبائی جنگل کو لوٹ جائیں گے..

○●○●○

''سرِ شام سُرخی میں ڈوبی چٹانیں اور ایک تبتی جھیل''

اور جب الاسکا کے دل کے پار ہم انجانے اور پرائے خطوں میں سفر کرتے جاتے تھے تو دوپہر ڈھلتی تھی تو ہمارے برابر میں ایک انوکھی اور سحر سُہانی جھیل چلنے لگی جو بہت دور جو برفوں کے مدھم دھوپ میں ڈھلتے سلسلے تھے اُن کے دامن سے شروع ہو کر ہمارے پاؤں تک چلی آتی تھی.. میں اس جھیل کے نام کا تعین نہ کر سکا بس یہ جانتا ہوں کہ وہ ولو اور وسیلا کے مختصر قصبوں سے آگے کہیں تھی، شاید جھیل نہ تھی آبنائے الاسکا کی ایک شاخ تھی.. شاید ''کک اِن لیٹ'' کے پانیوں کا ذخیرہ تھا پر جو بھی تھا اپنے حُسن سے کسی بھی دل ناتواں کو ٹھہرا سکتا تھا.. کناروں کے ساتھ ساتھ خزاں رسیدہ بَن بچھے تھے.. سورج کی زرد کرنوں میں ڈوبے کچھ گھر تھے اور اُس کے پانیوں پر جو برف پوش پہاڑوں کے دامن کو بھگوتے تھے ایک عجب الوہی امن تھا.. ایک ٹھہراؤ تھا.. نہ کوئی ہلچل تھی اور نہ ہی لہروں کا کچھ شور.. اور مجھے اس منظر میں بار بار تبت کی لینڈ سکیپ کے شائبے جھلکتے نظر آتے.. کہ وہ اپنے دھیان میں گم شانت اپنے پانیوں پر سکون کی ایک ہلکی مسکراہٹ پھیلائے ایک مہاتما بدھ کی رُوح تھی جو تیرتی ہوئی یہاں الاسکا تک آ گئی تھی..

وہ ایک ناقابل حصول شنگریلا کی مانند ایک انسانی پہنچ سے دور چاندنگر کی طرح دکھائی دے رہی تھی..

میں ہر دو چار قدم پر ''رُکو رُکو'' کی درخواست کرتا.. جیپ سے اُتر کر جھیل کو اپنے کیمرے میں سمونے کی کوشش کرتا.. اُس ڈھلتی دوپہر میں گہرے سانس لے کر اپنے آپ کو یقین دلاتا کہ یہ میں ہوں جو اس انجانی الوہی اور کسی اسرار میں ڈوبی ہوئی جھیل کو دیکھ رہا ہوں.. اور پھر بے وجہ مسکراتا اپنے آپ سے پُوچھتا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں..

اور کیا ہم یہیں کہیں شب گزاری کے لیے ٹھہر نہیں سکتے.. اینکر ایج تک پہنچنا کیا کسی پیغمبر کا حکم ہے کہ روگردانی نہیں ہو سکتی..

یہ جو بھی کچھ تھا، آبنائے الاسکا کی کوئی شاخ تھی.. کوئی جھیل تھی، پانیوں کا ذخیرہ تھا، جو بھی تھا اس کے کناروں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے بار بار ٹھہرنے اور رُکنے کو جی چاہتا.. دل ٹھہر جاتا پر جیپ کہاں تک ٹھہرتی کہ اُس نے ہمیں بہر طور اینکر ایج لے جانا تھا..

اس تبتی نوعیت کی فسوں کاری کی گرفت میں سے بمشکل باہر آتے ہیں، اُس سے بچھڑ کر سفر جاری رکھتے ہیں تو ایک اور مصیبت کا سامنا ہو جاتا ہے.. ہمارے عین سامنے شاہراہ کے آگے حائل ہوتا چٹانوں کا ایک ایسا سلسلہ بلند ہو رہا ہے جو شفق کے رنگوں میں سراسر نہایا گلابی ہو رہا ہے جیسے وہ پیٹرا کی چٹانیں ہوں جو غروب آفتاب کے لمحوں میں گلاب رنگ

ہو رہی ہوں..اور اُن کے دامن میں پھیلے جنگل بھی غروب کی زد میں آ کر زرد ہو رہے تھے..

میں نے زندگی بھر ایک پورے چٹانی سلسلے کو یُوں سورج کی زردی میں پتستما ہوتے نہیں دیکھا..ہاں ایک بار جب میں ایک جیپ میں سوار صبح سویرے وادیٔ شمشال کی جانب سفر کرتا تھا تو وہاں میں نے چٹانوں پر طلوع کی کرنوں کے طلسم بکھرتے دیکھے اور وہ مایا تہذیب کے گہنوں کی مانند زرد ہونے لگی تھیں..

میری الاسکا البم میں ایک ایسی تصویر محفوظ ہے جو بقیہ سب تصویروں سے یوں الگ نظر آتی ہے جیسے رعایا کے درمیان میں ایک زرد رنگت چینی شہزادی..اس تصویر میں اینکر ایج جانے والی شاہراہ پر صرف ایک سیاہ رنگ کی کار ہے اور اُس پر گلابی چٹانوں کا ایک سلسلہ امڈتا چلا آتا ہے اور ان کے دامن میں جو جنگل ہیں وہ بھی اتنے شرمیلے ہیں کہ اُن کے رخسار سرخ ہو رہے ہیں اور جُوں جُوں وہ کار اُن چٹانوں کے قریب ہو رہی ہے تو وہ بھی گلابی ہوئی جاتی ہے..تب مجھے احساس ہوا کہ سارے منظر ایک سے نہیں ہوتے..اُن کا موازنہ کرنا حماقت ہے..ایسی جھیلیں، بلندیاں، برفیں، ویرانے اور چٹانیں بہت سے خطوں میں ہو سکتی ہیں لیکن جب وہ الاسکا میں ہوتی ہیں تو اُن کے رنگ رُوپ اور خوش نمائیاں اور خوش نظریاں سب سے جدا ہوتی ہیں...

اور جب میں نے کُونج پر نگاہ کی تو اُس کے سفید پروں پر بھی اُن چٹانوں کی سرخی اثر انداز ہو رہی تھی..اُن جنگلوں کے ہونٹوں کے گلاب کھل رہے تھے..

○●○●○

"اینکر ایج کی سویر میں ستند رنگھ..اوئے چٹے باندرو"

نیند کی کوئی شہریت نہیں ہوتی..

کوئی سرحد نہیں ہوتی..وہ اپنی من مرضی سے کہیں بھی آ سکتی ہے اور کہیں بھی جا سکتی ہے..اسے کسی پاسپورٹ اور ویزے کی حاجت نہیں ہوتی کہ یہ ایک عارضی موت ہوتی ہے اور وہ کہیں بھی آ سکتی ہے..لیکن اس نیند میں جو خواب آتے ہیں، غنودگی کے عالم میں جو وا ہے اور سراب ہوتے ہیں وہ سب کے سب سرحدوں میں قید ہوتے ہیں..وہ سب اُس دھرتی کی کوکھ میں سے پھوٹتے ہیں جہاں سے وہ شخص آیا ہوتا ہے جو نیند میں ہے..وہ خوابوں میں بھی اپنے موسموں، شجروں، چہروں اور زبان کی حد بندیوں سے فرار حاصل نہیں کر سکتا..

"اوئے ماں کے خصمو..چٹے باندرو"

اینکر ایج کی پہلی سویر میں.."میرل فیلڈ اِن" کے مختصر کمرے میں کمفرٹر میں چہرہ یُوں روپوش کیے کہ صرف میری ناک تھی جو سانس لینے کے لیے اُس میں سے ظاہر ہوتی تھی اور ابھی میں نیند کے جھونکوں میں ہلکورے لے رہا تھا..بیداری کے در پر دستک دینے کو جی نہ چاہ رہا تھا تو میرے کانوں میں پنجابی کی کچھ نہایت بلیغ گالیاں ہولے ہولے اُترنے لگیں جن کے درمیان امریکی لہجے میں ڈھلی کچھ سرزنشیں بھی تھیں تو میں یقیناً ایک خواب میں تھا ورنہ الاسکا کے صدر مقام اینکر ایج کے ایک موٹل کے کمرے کے باہر بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص یوں بے دریغ پنجابی میں ایسی گالیاں دے رہا ہو جو ہرگز شریف النفس نہ تھیں..اور جانے کسے دے رہا ہو..

اوئے ماں کے خصمو، چٹے باندرو..اوئے بہن یا ہو یو..وہاٹ دے فک آر یُو ڈوئنگ..ڈیم یُو..میں تمہیں دس ڈالر فی گھنٹہ اجرت دے رہا ہوں اور..تمہاری بہن کو..یُو سسٹر فکر..تمہاری ماں کو..یُو مدر فکر..یُو سن آف بچز..کام نہیں کرو گے تو آئی وِل فائر یُو..فک یُو..

میں نے ہراساں ہو کر کُونج کی جانب دیکھا کہ کہیں وہ تو یہ دل ربا اور معنی خیز گالیاں نہیں سُن رہی..لیکن وہ واش روم کے باہر جو میٹ تھا اُس پر پَر سکیڑے گُھوک سوئی ہوئی تھی اور میں نے شکر کیا کہ یہ بلیغ گالیاں اُس کے کانوں میں نہیں اُتر رہیں، آفٹر آل وہ ایک لیڈی تھی..

میں نے کمفرٹر کو اپنے وجود سے الگ کیا..بستر سے پاؤں لٹکا کر سلیپر پہنے اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا..

"میرل فیلڈ موٹل" کی نقل نما عمارت کے ایک کونے پر تین چار گورے مزدور ایک واٹر ٹینک نما شے کی تعمیر میں جتے ہوئے تھے.. وہ مسکراتے آپس میں چہلیں کرتے کنکریٹ کے بلاک ایک دوسرے پر آویزاں کر کے اُن میں سیمنٹ بھرتے تھے.. اور اس تعمیراتی مصروفیت کی دیکھ بھال کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جو سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا.. رنگ رُوپ سے دیسی لگتا تھا اور یہ وہی تھا جو ان گورے مزدوروں کو پنجابی میں گالیاں دیتے اُنہیں تیزی سے کام کرنے پر اُکسا رہا تھا۔

وہ نیم وحشی لگتے، مضبوط پٹھوں والے.. جن کے بازوؤں پر ٹیٹو کھدے ہوئے تھے گورے مزدور تھے اُن پر اُن مغلظات کا جو چاہے وہ پنجابی میں برسائی گئی تھیں یا انگریزی میں، کچھ اثر نہ ہوتا تھا.. وہ قہقہے لگاتے چہلیں کرتے اپنے کام کی رفتار میں چنداں اضافہ نہ کرتے تھے..

اوئے میں تمہاری بہن کو.. آئی وِل فک یور سسٹر..

اُن میں سے ایک درمیانی عمر کا مزدور.. جو گھنیری مونچھیں اپنے ہونٹوں پر لٹکائے ہوئے تھا اور لگتا تھا کہ اتنی سویرے بھی قدرے ٹُن ہو چکا ہے کہنے لگا "مسٹر.. اِف یُو وانٹ ٹو فک مائی سسٹر.. اور اگر اُسے کچھ اعتراض نہیں تو مجھے بھی نہیں۔" بقیہ گوروں نے اُسے اس بیان پر خوب خوب داد دی..

"بڑے بے غیرت ہو بھئی.." اُس دیسی شکل کے بندے نے عاجز ہو کر کہا اور وہ پلٹ کر کہیں جانے کو تھا کہ اُس کی نظر دروازے میں سے جھانکتے مجھ پر پڑ گئی "سر.." وہ مؤدب ہو گیا "کین آئی ڈو اینی سروس ٹو یُو.."

"نو تھینک یُو.."

"آئی ہوپ یُو سلیپٹ ویل سَر.."

"آئی ڈِڈ.. آر یو فرام پنجاب؟"

"آہو.." اُس نے ذرا چونک کر کہا..

"آئی ایم فرام پاکستان.. لاہور.."

اب یہ جو لفظ لاہور کا ہے، ایک اسم اعظم ہے، یہ ہر در کھول دیتا ہے.. آپ دلّی میں ہوں، ٹمبکٹو میں یا برزبین میں جونہی آپ کسی دیسی شکل کے بندے کو "لاہور" کہتے ہیں تو وہ پگھل جاتا ہے.. دشمن دوست ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں نمی آنے لگتی ہے۔ برصغیر کا کوئی بھی شہر اپنے نام میں ایسا سامری پن نہیں رکھتا.. میں نے بڑے بڑے متکبر سرداروں اور متعصب ہندوؤں کو لاہور کے نام پر موم ہوتے اور آبدیدہ ہوتے دیکھا ہے۔

"تُسی لاہور دے او.." وہ میری جانب یُوں کھنچا چلا آیا جیسے میں خود لاہور ہوں ایک مقناطیس ہوں "تُسی الاسکا وِچ؟"

"ہاں جی.. میں الاسکا وِچ.."

"میں ستندر سنگھ ہاں.. یہ میرل فیلڈ آپاں دا موٹل اے.. کی حال اے؟"

"آپ ان گورے حضرات کو گالیوں سے کیوں نواز رہے تھے.."

"اوئے یہ گورے باندر" وہ پھر قدرے طیش میں آ گیا "لو جی میں نے ان ماں کے یاروں کو دہاڑی کی مزدوری دی کہ شام سے پہلے پہلے یہ واٹر ٹینک بنا دیں اور یہ.. میں ان کی بہن کو.. بیڑاں پیتے ہیں، تمباکو چبتے ہیں اور کام نہیں کرتے باندر کی اولادیں.."

ستندر سنگھ نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا۔ اُس کا پورا خاندان ہندوستان، امریکہ اور کینیڈا میں بکھرا ہوا تھا.. وہ خود اینکراج کا باسی نہ تھا، کینیڈا کے کسی اور شہر میں رہتا تھا اور صرف موسم گرما میں بال بچوں سمیت اپنے اس موٹل کی دیکھ بھال کے لیے یہاں عارضی طور پر منتقل ہو جاتا تھا..

سکھ حضرات کینیڈا کے ابتدائی آباد کاروں میں شمار ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اگر سکھ سرتوڑ مشقت اور لگن کے ساتھ یہاں کے ویرانوں کو آباد نہ کرتے تو وہ کینیڈا نہ ہوتا جو آج ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی کے بعد پنجابی کینیڈا کی سب سے بڑی زبان ہے یہاں تک کہ وہاں کے ایک صوبے کا وزیر اعلیٰ بھی ایک سردار منتخب ہوا تھا۔ کینیڈا میں آباد سکھوں کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے رواج، ثقافت اور بولی محفوظ رکھے ہیں، اُنہیں بھلایا نہیں.. وہ سکھ نوجوان جن کے باپ دادے، پردادے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے وہ بھی اتنی ٹھیٹھ پنجابی بولتے ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے.. یعنی ابھی تک وینکوور کو جو کینیڈا کا سب سے خوش نظر شہر ہے بنکوور ہی بولتے ہیں، جیسا کہ اُن کے ان پڑھ آباؤ اجداد بولتے تھے.. اور وہ دیگر سفید فاموں کی نسبت کہیں زیادہ متمول ہیں، وینکوور میں اگر آپ کوئی عالی شان رہائش دیکھتے ہیں تو وہ یقیناً کسی سردار کی ہے..

اسی یوکان اور الاسکا کی طویل مسافت کے بعد مجھے ناگہانی طور پر جرمنی سے ایک سرکاری دعوت موصول ہوئی کہ آئیے اور ایک ادبی سیمینار میں پاکستان کی نمائندگی کیجیے.. آپ کے ناول "راکھ" کے حوالے سے ایک خصوصی تقریب ہو گی جس میں اس ناول کے کچھ ابواب کے جرمن ترجمے ڈرامائی انداز میں پیش کیے جائیں گے.. یہ ایک الگ المناک داستان ہے کہ اس دعوت کے نتیجے میں ٹونج مجھ سے روٹھ گئی۔ تو ٹورنٹو ایئر پورٹ پر جب کہ میں جرمنی جانے والی پرواز کے لیے کسٹم اور سکیورٹی کے مراحل میں سے گزر رہا تھا تو وہاں تعینات ایک خوش آثار کینیڈین خاتون آفیسر نے مجھے نہایت سرد انداز میں اطلاع کی کہ سر آپ جو بیگ ساتھ لیے جا رہے ہیں اس میں کچھ لائٹر ہیں اور آئی ایم سوری آپ انہیں جہاز کے اندر نہیں لے جا سکتے.. میں نے چپکے سے وہ درجن بھر لائٹر جو میں الاسکا سے دوستوں کو تحفے میں دینے کی خاطر لایا تھا، کاؤنٹر پر رکھ دیئے.. یہ میری غلطی تھی، مجھے اُنہیں اپنے ساتھ لانے کی بجائے اپنے سوٹ کیس میں رکھنا چاہیے تھا جو آپ سے الگ جہاز میں سٹور کر دیا جاتا ہے.. جونہی چیکنگ وغیرہ مکمل ہوئی میں نے یونہی خوشدلی سے اُس خوش شکل بھری بھری کینیڈین افسر خاتون کو کہا.. "مجھے اپنے لائٹرز کو کھو دینے کا کچھ غم نہیں۔ دُکھ تو صرف یہ ہے کہ جب میں اس طویل پرواز کے بعد فرینکفرٹ ایئر پورٹ پر اُتروں گا تو مجھے ایک سگریٹ کی شدید طلب ہو گی اور اُسے سلگانے کے لیے میرے پاس ایک لائٹر بھی نہ ہو گا.."

خاتون کسٹم آفیسر کے چہرے پر وہی کرختگی اور سنجیدگی تھی جب اُس نے اُن میں سے ایک لائٹر کو اپنی ہتھیلی سے دھکیل کر میرے آگے کر دیا اور کہا "ویر جی.. تُسی چھیتی نال اینوں چک لو.."

میں پہلے تو بے وقوف سا ہو گیا کہ یہ کینیڈین خاتون نیلی وردی میں ملبوس پنجابی کیسے بولنے لگی ہے اور پھر میں

نے فوراً وہ لائٹر جھپٹ لیا..

وہ ایک کینیڈین سردارنی تھی جو اپنی زبان اور اُس کے ٹھیٹھ لہجے سے جدا نہ ہوئی تھی اور اُس نے میرے لیے ایک دیر کے لیے قانون کی خلاف ورزی کا خطرہ مول لے لیا تھا.. زندگی میں پہلی بار ایک سکھنی کے دیرینہ بھائی ہوئے تو لطف آ گیا.. اگرچہ کچھ قلق بھی ہوا..

اس سے پیشتر کہ بارے اینکر ایج کچھ بیاں ہو جائے میں ایک دلچسپ ''سانحے'' کا تذکرہ کرنا چاہوں گا..

ہمارے سیاحتی گروپ میں کل پانچ لینڈ روور اور جیپیں تھیں اور اُن میں سے ایک کی ڈرائیور ایک ایسی لڑکی تھی جو تھی تو کینیڈین پر اُس کے آبائی وطن کا کچھ تعین نہ ہو پاتا تھا اور وہ تھی بھی اتنی سڑیل مزاج کہ کوئی بھی اُس سے یہ نہ پوچھتا تھا کہ تم کہاں کی ہو.. حالانکہ میں نے بھی مقدور بھر کوشش کر دیکھی.. شاید بنگال کی تھی یا بہار کی.. اڑیسہ کی تھی یا سری لنکا کی.. پر کچھ کالی کالی سی تھی.. تو اُس نے ایک سویر موٹل کے احاطے میں پارک شدہ اپنی جیپ کو ذرا بے دھیانی میں بیک کیا تو پیچھے کھڑی ایک کھٹارا کوئی چالیس برس پرانے ماڈل کی لمبی چوڑی شورلٹ گاڑی سے جا ٹکرائی جس کے نتیجے میں اُس کھٹارا کار کی بیک لائٹس شکستہ ہو کر بکھر گئیں.. اُس شورلٹ کا مالک ایک دراز قامت سُرخ گردن والا مشٹنڈہ گورا تھا اور اُس نے تو ہنگامہ کھڑا کر دیا.. میری یہ کار تو ایک میوزیم میں رکھنے کے قابل ہے.. ونٹیج کار ہے.. ایک نایاب انٹیک ہے اور یہ جو بیک لائٹس سمیش ہو گئی ہیں تو یہ کسی آٹو سٹور سے ملنے والی نہیں ہیں.. ایسی لائٹس تو اب مینوفیکچر ہی نہیں ہوتیں تو مجھے اس انٹیک کار کی پوری قیمت ادا کی جائے ورنہ میں تو مقدمہ کر دوں گا۔

اب اُس بنگالی، بہاری، اڑیسن یا سری لنکن کالی کالی لڑکی کے تو چھکے چھوٹ گئے.. اُس کے چہرے پر بے شمار ہوائیاں اڑنے لگیں کہ وہ گورا بالکل درست کہتا تھا، وہ مقدمہ کر کے اُسے قلاش کر سکتا تھا.. تو اُس لڑکی نے کالی کالی نے ایک زرد ہراساں چہرے کے ساتھ جس پر ہوائیاں اُڑتی جا رہی تھیں اور چھکے چھوٹتے جا رہے تھے مجھ سے رجوع کیا کہ.. اُس نے دیکھا تھا کہ میں اُس میرل اِن موٹل کے موٹے سکھ مالک کے ساتھ اکثر گپیں ہانک رہا ہوتا تھا کہ پلیز میری ہیلپ کرو نہیں تو میں لُٹ گئی.. اگرچہ وہ جتنی کالی کالی تھی اُس کے لُٹ جانے کے امکان کم کم تھے..

چنانچہ میں نے اُس پر ترس کھا کر ڈرا ڈرتے ڈرتے ستیندر سنگھ سے بات کی جو اس لمحے ناشتے کے کمرے میں ایک گوری ویٹرس کی ماں بہن ایک کر رہا تھا کہ تم گاہکوں کا کچھ خیال نہیں رکھ رہی اور خود بھی ناشتہ کرتی چلی جا رہی ہو جب کہ طے یہ تھا کہ تم موٹل کے مکینوں کے بعد انڈوں پر ہاتھ ڈالو گی..

وہ ایک خالص کاروباری سکھ تھا اور اُس نے ایک سرد لہجے میں کہا ''یہ کُڑی کون ہے جس نے اس گورے کی بیک لائٹ سمیش کی ہے..''

''پتہ نہیں کون ہے لیکن ہمارے سیاحتی گروپ میں شامل ہے.. اور اُس بے چاری کی لُٹیا ڈوب رہی ہے تو اسے ڈوبنے سے بچا لیجیے سردار جی..''

''تمہاری کُوی ہے؟'' ستیندر نے اُسی سرد کاروباری لہجے میں پوچھا..

''نہیں نہیں.. وہ تو میری.. نہیں نہیں.. میری کُوی نہیں ہے..''

ستیندر کی سرد مہری پل بھر میں رخصت ہو گئی اور وہ میرے قریب ہو کر بولا ''مہاراج اگر آپ سفارش کرتے ہو تو یونہی تو نہیں کرتے.... کچھ ہے ناں گڑ بڑ۔''

میں نے فی الفور فیصلہ کر لیا کہ اگر اقرار کرنے سے اُس لڑکی کی خلاصی ہو سکتی ہے تو کچھ حرج نہیں ''آہو'' میں نے اُس کے کاندھے پر ایک دھپ رسید کرتے ہوئے کہا.. ''سردار جی.. آپ کا کچھ جواب نہیں.. معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے ہو.. ہاں میری کُڑی ہے.. گڑ بڑ ہے..''

اس اقرار پر اُس نے جواباً میرے کندھے پر ذرا زور دار دھپ لگائی اور کہنے لگا ''گل ای کوئی نئیں، جس گورے کی شورلٹ کی بیک لائٹس ٹوٹی ہیں وہ تو میرا اپنا نوکر ہے.. ایئر پورٹ سے مہمانوں کو یہاں لانے کی ڈیوٹی کرتا ہے.. لیکن تمہاری کُوی ہے ناں..''

''ہاں ہاں بالکل..''

اُس نے فوری طور پر اپنی شورلٹ کے گرد پھیرے ڈالتے افسوس میں سر ہلاتے گورے کو دفتر میں طلب کیا اور جب اُس نے اپنا کیس پیش کیا تو ستیندر کہنے لگا ''ٹل فِشٹ اوئے.. یہاں سے سو کلومیٹر کے فاصلے پر فلاں قصبے میں ایک سردار کا جنک یارڈ ہے وہاں سے تمہیں اس شورلٹ کی بیک لائٹس مل جائیں گی اور وہاں تک آنے جانے کے پٹرول کا خرچہ میں ادا کروں گا.. لیکن آئندہ تم نے اس کُڑی کو تنگ نہیں کرنا یہ ہمارے لاہوری یار کی کُوی ہے.. تنگ کرو گے تو میں تمہاری بہن کو..''

چنانچہ اُس سردار کے جنک یارڈ سے واقعی شورلٹ کے اُس قدیم ماڈل کی بیک لائٹس دستیاب ہو گئیں اور اُس کُڑی کی جان صرف ساٹھ ڈالر میں چھوٹ گئی.. ورنہ وہ تو عمر بھر کے لیے رہن رکھی جاتی..

○●○●○

''ایک اور سورج الاسکا کے سمندروں میں ڈوب جانے دو''

ہم ڈھلتی شام میں اینکر ایج میں داخل ہوئے تھے اور اس کا ایک سبب تھا..

فیئر بینک سے اینکر ایج کا فاصلہ تو صرف پونے چھ سو کلو میٹر تھا لیکن راستے میں منظروں کی جو زنجیریں پاؤں پڑ جاتی تھیں.. کبھی آتشِ سرد میں رواں وہ دریا اور اس زنجیر کی کڑیاں سرخ بیر بہوٹیاں تھیں۔ کبھی ماؤنٹ مکینلے کی پُرشکوہ برفیں بیڑیاں بن کر جکڑ لیتی ہیں اور کبھی وہ جھیل جو تبت کا ایک پُرفسوں منظر لگتی تھی.. اور ہاں شفق رنگ چٹانوں کے وہ انبار جن کی فصیلیں ہمارا راستہ روکتی تھیں' ہمارا سفر کھوٹا کرتی تھیں.. اور کیا وہ مردہ بارہ سنگھا بھولنے کے لائق تھا جس کے بادشاہ سینگ ماؤنٹ مکینلے کی برفوں میں چھید کرتے تھے.. تو یہی سبب تھا کہ ہم ڈھلتی شام میں اینکر ایج میں داخل ہوئے.. اور ابھی وہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ ختم ہو گیا یعنی موٹلوں اور ہوٹلوں کی چھان پھٹک کرتے چلے گئے کہ یہاں قیام کریں یا یہ مقام بہتر ہے تو یکدم آگے سمندر آ گیا یعنی اینکر ایج ختم ہو گیا.. جیسے ہالینڈ وغیرہ میں آپ احتیاط نہ کریں ڈرائیو کرتے ہوئے ذرا بے دھیان ہو جائیں تو آپ یا تو سمندر میں گر جاتے ہیں اور یا پھر جرمنی میں داخل ہو جاتے ہیں.. چنانچہ ہم پھر سے واپس ہو لیے... جو موٹل آرام دہ اور مناسب آسائش کے لگتے تھے اُن کے باہر ''نو ویکنسی'' کے سرخ نیون سائن روشن تھے... بہرحال ہم نے بہتری کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے 420-سِٹکا سٹریٹ پر واقع ''میرل فیلڈ اِن'' میں ڈیرے ڈال لیے اگرچہ اُس کی ظاہری شکل کچھ سادہ اور دیہاتی سی تھی....

ایسے موٹلوں میں صرف بنیادی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں.. صبح کا ناشتہ مہیا کیا جاتا ہے لیکن باقاعدہ ریستوران وغیرہ کا بکھیڑا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ڈیرے ڈالتے ہی کُل سیاح مخلوق نے رات کے کھانے کے لیے شہر کا رُخ کر لیا..

جب ہم بے دھیانی میں الاسکا کے صدر مقام کے طول کو یہی کوئی دس بارہ منٹ میں طے کر کے اس کے آخری سرے پر سمندر تک پہنچ گئے تھے تو مجھے اُس شام میں سرمئی ہوتے پانیوں سے ذرا فاصلے پر کچھ کوتاہ قامت پہاڑیاں دکھائی دی تھیں جن کے پیچھے وہ ڈوبتا سورج ڈوبنے کو تھا اور اس منظر نے بھی میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں..

ہم نے بھی اپنے کمرے سے باہر نکلنے سے پیشتر واش روم میں اپنے آپ کو چند چھینٹوں سے تر و تازہ کیا.. کچھ یوڈی کلون چھڑک کے آفٹر شیو لوشن لگایا' جین وہی رہنے دی البتہ ذرا بہتر حالت کی ٹی شرٹ پہن لی.. اور جب میں ''ہم'' کہتا ہوں تو یہ وہ شاہانہ ''ہم'' ہوتا ہے اس میں ٹونج شامل نہیں ہوتی.. ظاہر ہے اُسے نہ واش روم استعمال کرنے کی حاجت تھی اور نہ آفٹر شیو لگانے کی اور نہ ہی کپڑے بدلنے کی کہ وہ تو بے لباس پھرتی تھی..

ہم ''میرل فیلڈ اِن'' میں سے نکلے ہیں تو اُس نے دوہائی دی ''مجھے فوراً کچھ کھلاؤ پلاؤ.. میں بہت بھوکی ہوں.. اتنا سوئی ہوں کہ لاغر ہو گئی ہوں' پَروں میں جان نہیں رہی.. چلو چلو کچھ کھائیں..''

تب میں نے نہایت عاجزی سے ایک درخواست پیش کی کہ ''ٹونج بی بی.. دیکھو وہاں اینکر ایج کے آخر میں الاسکا کے سمندروں کی جو ایک خلیج ہے جو پورے شہر کو اپنی آغوش میں لیتی ہے وہاں سورج ڈوب رہا ہے.. اور ایسے ڈوب رہا ہے کہ اُس منظر کو دیکھتے ہوئے دل ڈوبتا ہے.. تو کیا ہم کھانے سے پیشتر صرف چند لمحوں کے لیے وہاں نہیں جا سکتے.. سورج کو ڈوبو دیں پھر جو جی میں آئے کریں.. پلیز..''

اُس نے اپنی لامبی چونچ یوں کٹکٹائی جیسے کفِ افسوس ملتی ہو اور پھر اپنا مختصر سَر جس میں اُس کی سیاہ آنکھیں چڑیلوں کی مانند ہنستی تھیں' ہلاتے ہوئے کہنے لگی ''یہ انسان لوگ کتنے کم عقل اور بودے سے ہوتے ہیں.. کسی ایک منظر کو دیکھنے کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں اور اُس میں تنہا ہونے کی خاطر احمقوں کی مانند منہ کھولے آنکھیں جھپکاتے رہتے ہیں.. اگر ہم پرندے یوں دورانِ پرواز نیچے گزرتے منظروں سے مبہوت ہو کر اُن میں اترنے لگیں تو ہم منزل پر کبھی نہ پہنچیں.. اور تنہا ہونا تو ایک پرندے کی موت ہے کہ وہ ڈار سے الگ ہوا تو گویا اُس تنہائی میں مر گیا کہ وہ اکیلا اُڑان کر کے اپنی منزل پر پہنچنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم کہتے ہو کہ اینکر ایج کے آخر میں کہیں پہاڑیوں میں سورج ڈوب رہا ہے تو وہاں چلتے ہیں..''

''نہیں چلتے..'' میں اُس کی سرزنش اور اپنے آپ کو کم عقل اور بودا قرار دینے پر رنجیدہ ہو گیا۔ ''سورج تو لاکھوں برسوں سے اس دنیا کے لاکھوں خطوں میں ہر شام ڈوبتے ہی رہتے ہیں تو الاسکا میں ایک اور سورج ڈوبتا ہے تو ڈوب جانے دو.. آؤ اپنے پیٹ بھرتے ہیں۔''

''خفا نہیں ہونا۔'' وہ اِک ناز سے پھڑپھڑائی.. اِک نزاکت سے نخرِیلی ہوئی یوں کہ مجھے غلام فرید کی روہی کی جٹیاں یاد آ گئیں۔

وِچ روہی دے رہندیاں نازک ناز دیاں جٹیاں
راتیں کرن شکار دلاں دے ڈیہیں ولوڑن مٹیاں..

روہی کے صحرا میں ایسی نازک ناز جٹیاں رہتی ہیں جو رات کو تو دِلوں کے شکار کرتی ہیں اور دن کو دودھ بلوتی ہیں..

کیا ٹونج بھی ایک ایسی ہی جٹی تھی..

''خفا نہیں ہونا.. میں تمہارا ساتھ دوں گی لیکن تم نے مجھے جیپ میں چھوڑ کر اُس منظر میں تنہا ہونے کی خاطر سمندر میں نہیں اتر جانا..''

اور وہ منظر ایسا تھا کہ ساحل کی نرم ریت میں سے کہیں کہیں پانی پھوٹتے تھے اور سمندر کے پانیوں کے پار کچھ فاصلے پر جو پہاڑیاں تھیں' وہ ایک شب دیجور کی مانند کوئلہ سیاہ تھیں اور اُن سیاہ ہو چکی پہاڑیوں کے سلسلے میں سے گویا ٹکور کی

مدھم روشنیاں جنم لے رہی تھیں کہ ہمارے پہنچنے تک سورج ڈوب چکا تھا اور اُس کے گلابی آثار اُن کی سیاہی میں سے پھوٹ رہے تھے.. ساحل اور ان کے درمیان الاسکا کا سمندر ہموار اور خوابیدہ تھا جو ایک گلاب رنگت کے خواب میں گلاب ہورہا تھا. یہ ایسا منظر تھا کہ مونج بھی جیپ میں سے نکل کر میرے برابر میں آ بیٹھی اور ایک مبہوت پن میں منتقل ہو کر گویا حنوط ہو گئی.

میں نے اپنی آشفتہ سری اور فصل گل کے آنے سے جو دیوانگی طاری ہوتی ہے' اُن زمانوں میں کیسے کیسے طلوع اور کیا کیا غروب دیکھے تھے.. یونانی دیومالا کے ایجئین سمندروں پر.. نانگا پربت اور سنو لیک پر.. دریائے چناب پر.. ماسکو کی سفید راتوں میں لیکن.. ان خطوں میں جو غروب ہوتا ہے وہ دل کو بھی لے ڈوبتا ہے.. اس کے شفق رنگ ایسے ہوتے ہیں جیسے یہ کائنات کی تخلیق کے بعد ظہور میں آنے والی پہلی شفق ہے.. ایسی رنگین کہ آنکھوں میں اتر کر اُنہیں بھی شفق رنگ کر دیں.. ایسی شفق جسے ابھی زمانوں نے آلودہ نہیں کیا اتنی شفاف اور کھری۔ وقت اُس پر اثر انداز نہیں ہوا۔ وہ ابھی ابھی رنگ ریز کے ہاتھوں سے رنگی گئی ہے..

الاسکا کی راتیں.. اس آخری شمال کی راتیں کبھی بھی مکمل طور پر گھٹا ٹوپ اندھیاری نہیں ہوتیں ایسے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے.. اُن میں اتنی روشنی بدستور رہتی ہے کہ شب وصل محبوب کے نین نقش یکسر گم نہیں ہوتے۔

"چلیں.." میں نے مونج کو اُس کی حنوط شدہ حالت سے بیدار کیا۔

"کہاں.." وہ جیسے خواب میں بڑبڑائی..

"جہاں تم پیٹ بھر کر اپنا پاستا یا سبز رسلاد کھا سکو.."

"مجھے اس شام میں احساس ہوا ہے کہ تم انسان یونہی منظروں کا وصل حاصل کرنے کی خاطر مرے نہیں جاتے.. اُڑان کرتے ہوئے جب میرے پروں تلے ایسے منظر گزرتے تھے تو میں نے برا کیا جو اُن میں تنہا ہونے کے لیے اپنی ڈار کو ترک کر کے نیچے نہ اُتر آئی.. بے شک میں بچھڑ جاتی' مرجاتی.. گر لاتی رہتی.. مجھے اس شام احساس ہوا ہے.."

اینکر اتج کے باسی اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا بھر میں اُن کا شہر بے مثال ہے.. اس کے ہم پلہ کوئی بستی نہیں' اس کے مقابلے پر کوئی نہیں ٹھہرتا تو وہ درست کہتے ہیں۔ حیات گزارنے کے لیے اپنے آپ کو ایسی طفل تسلیاں دینی پڑتی ہیں.. لاہور ہو یا دلّی.. روم' غرناطہ یا نیویارک ہو بے شک ٹمبکٹو ہو ہر شہر کے باسی اسی گھمنڈ میں مبتلا رہتے ہیں کہ بس ہم ہی ہم ہیں.. ہم سا کوئی ہو تو سامنے آئے.. اگر اُنہیں یہ تکبر اور خوش فہمی نصیب نہ ہو تو وہ حیات کا طویل سفر کیسے طے کریں.. اپنے آپ کو یکتا اور اعلیٰ ہونے کا فریب نہ دیں تو پیدا ہوتے ہی مرجائیں.. اینکر اتج کو "بڑا سیب" کا نام دیا گیا ہے جس کے اردگرد پورا الاسکا گھومتا ہے.. ہر بڑا گلیشیئر.. دریا' برفانی چوٹیاں اور گہرے تاریک جنگل اور پُرفسوں سمندر یہاں سے نہایت مختصر فاصلوں پر منتظر ہیں.. اور یہاں کی آبادی بھی تو الاسکا کے دیگر شہروں کی مانند قلیل نہیں' پورے سوا دو لاکھ نفوس اس میں سانس لیتے ہیں..

یہاں کے باسی یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ اینکر اتج اس لیے عظیم ہے کہ یہ اصل الاسکا سے صرف بیس منٹ کی مسافت پر واقع ہے.. اس لیے کہ الاسکا جو کچھ ہے وہ اینکر اتج ہرگز نہیں ہے اور یا تو یہ آپ پر یوں حاوی ہو جاتا ہے کہ آپ

اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یا پھر آپ اس سے شدید نفرت کرنے لگتے ہیں۔ درمیانی راستہ کوئی نہیں.. میں اس شام کے ڈوبنے کے منظر کو دیکھنے کے بعد اس شہر سے کم از کم نفرت تو نہیں کر سکتا..

اینکر اتج دنیا کے دیگر شہروں کی نسبت ابھی ایک غوں غوں کرتا نومولود بچہ ہے جو ابھی ابھی ماں کی کوکھ سے باہر آیا ہے اور اُس کا ناڑو ابھی یعنی 1915ء میں منقطع ہوا ہے.. تب اسی مقام پر جہاں ہم ڈوبنے کے منظر میں تھے محض چند عارضی خیمے تھے جن کے مکین رزق روزگار کے لیے مجبوراً ان میں قیام کرتے تھے اور اُن کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہاں فوجی اڈے قائم ہوئے اور پھر اس مقام کا نصیب جاگا تو 1950ء میں کیپٹن کُک خلیج میں سے کالا سونا یعنی تیل اُبل پڑا. ٹرانس الاسکا پائپ لائن بچھنے لگی.. بھاگ بیدار ہو گئے.. اس ویرانے میں جہاں ریچھ راج کرتے تھے عمارتیں سر اُٹھانے لگیں اور ماؤنٹ میکنلے کی بلندی کے مقابل آ گئیں اور یہ ایک شہر کی صورت اختیار کرنے لگا..

دنیا بھر میں کسی بھی خطے کا یہ واحد صدر مقام ہے جسے پیدا ہوئے ابھی سو برس بھی نہیں گزرے.. نومولود ہے..

○●○●○

''برفانی بطخ'' ریستوران میں..کچھ اخلاق باختہ خواتین

اینکر اَیج کے..717 ویسٹ' تھرڈ ایونیو پر ساحل پر جھانکتے ''سنوگوز'' برفانی بطخ نامی ریستوران کے تاریک ہوتے ماحول میں ابھی تک غروب کی روشنی ٹھہری ہوئی تھی..

بہت گہما گہمی نہ تھی..

بے شک جنرل آئزن ہاور نے اسے امریکہ کی انچاسویں ریاست ڈکلیئر کیا لیکن یہ مزاج میں امریکی نہ ہوئی' مین لینڈ سے الگ تھلگ اپنے ذاتی تشخص پر نازاں رہی۔ بقیہ امریکہ سے ہم آہنگ نہ ہوئی..جدا رہی..الاسکا میں رہنے والے یہاں آنے والے امریکیوں کو غیر ملکی سمجھتے رہے اور امریکی جب الاسکا میں آتے ہیں تو مقامی اُن کے لیے اجنبی ٹھہرتے ہیں..

یہی مزاج ''سنوگوز'' میں نمایاں ہوتا تھا..

ٹوِنج خصلتاً جین مت کی پیروکار تھی' گوشت سے پرہیز کرتی تھی' گھاس پھونس جسے وہ سلاد کا نام دیتی تھی اُس پر ٹھونگے مارتی رہتی تھی لیکن میں ازل کا مسلمان مجھے تو گوشت درکار تھا یا کم از کم مچھلی درکار تھی..

اور جو مچھلی میرے آگے ایک پلیٹ میں سجی وہ سالمن تھی..سرخ رنگت کی نمکین مزاج اور ریچھوں کی مرغوب ترین غذا..اور میں نے اسے ریچھوں کے اشتیاق سے ہی کھایا کہ مجھے بہت بھوک لگی تھی..

بار کاؤنٹر پر براجمان وہ دو خواتین جو چنچل سی تھیں' کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائے' سگریٹ کے کش لگاتیں ''سنوگوز'' ریستوران پر طائرانہ نظریں اس آس میں ڈالتی تھیں کہ شاید اُن کی نظر کے طائر کے پنجوں میں کوئی بھولا اجنبی پنچھی آ جائے اور اُن کے رزق کا کچھ سامان ہو جائے..میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یُوکان اور الاسکا کی ویرانیوں میں کہیں کہیں جو مختصر بستیاں ہیں وہاں کا رُخ ایسی خواتین کرتی ہیں جو عمر اور بدن میں ڈھل چکی ہوتی ہیں اور اُن کا کاروبار مندا پڑ جاتا ہے..یہ علاقے اُن کی شکارگاہ ہوتے ہیں' چونکہ شکاری بھی تنہائی اور ویرانی سے تنگ آ چکا ہوتا ہے تو وہ بہ رضا و رغبت جو ہے جہاں ہے کہ حاضر مال پر قناعت کر جاتا ہے..

ٹوِنج میری چوری پکڑی' اُن کی جانب دیکھتے دیکھ لیا ''ایسی واہیات اخلاق باختہ عورتوں کو کیسی رغبت سے تکتے جا رہے ہو..ٹھرکی!''

حیات اقبال میں کہیں مذکور ہے کہ جن دنوں طوائفیں ہیرا منڈی میں منتقل نہیں ہوئی تھیں اور اندرون شہر چوک

بکلا کے آس پاس رہائش رکھتی تھیں حضرت علامہ اُدھر سے گزرتے ہوئے ہمیشہ ایک کریہہ النظر طوائف کے پاس رُک کر اُس کا حال احوال دریافت کرتے اور شاید اُسے اپنے تازہ ترین کلام سے بھی نوازتے ہوں گے تاکہ اُسے معلوم ہے کہ اُس نے اپنی خودی کتنی بلند کرنی ہے..تو اُن کے ایک قریبی دوست نے بصد ادب استفسار کیا حضرت اگر ٹھہرنا ہے تو کسی خوبرو کے پاس ٹھہریئے یہاں کیوں رُک جاتے ہیں تو علامہ نے کہا کہ اس عورت کے پاس اس کی بدشکلی کے باعث کوئی نہیں ٹھہرتا ہوگا اور وہ کیسی شکستہ دل ہوتی ہوگی تو اگر میں پل دو پل اُس کے پاس ٹھہر جاتا ہوں' کچھ کلام کر لیتا ہوں تو اُس کا دکھ کچھ تو کم ہو جاتا ہوگا کہ کوئی تو ہے جو مجھے اس قابل سمجھتا ہے کہ ٹھہر جائے اور میرے حال احوال دریافت کر لے..

میں نے ٹوِنج کو اپنے شاعر مشرق کا یہ قصہ سنایا کہ میرے نزدیک یہ اُن کی بلند اخلاقی کی گواہی تھی' وہ کریہہ النظر لوگوں کا بھی دل رکھ لیتے تھے..اور ٹوِنج سے کہا کہ مجھے بھی ان خواتین سے چنداں دلچسپی نہیں ہے لیکن اُن بے چاریوں کی جانب اُن کے بے ڈول بدنوں اور میک اپ سے لتھڑے ہوئے چہروں کی وجہ سے کوئی نہیں دیکھتا..اور اگر میں نے اُن کی جانب رغبت کی ایک نظر ڈالی تو کیا برا کیا..اُن کا دکھ کچھ تو کم ہوا ہوگا..

''جھوٹے..'' وہ مسکرانے لگی۔

''سنوگوز'' کے اندر اگرچہ ایک بے رونق رونقی تھی لیکن ہم باہر آئے تو اینکر اَیج میں بے رونقی بھی نہ تھی..گلیاں بازار سُونے پڑے تھے اگرچہ اُن میں شمال کی شفق ٹھہری ہوئی تھی..یہ سرِ شام سو جانے والے پرندوں کا شجر تھا..بے شک اس شجر کا پتہ پتہ شفق کی گلاب رنگت میں رنگا جاتا تھا لیکن اُن پرندوں پر اس کے طلسم کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا اور رات اترتے ہی اپنے گھونسلوں میں خوابیدہ ہو جاتے تھے..

○●○●○

''خمار میں گم ایک اسکیمو سے ملاقات''

الاسکا کی ''لونلی پلینٹ'' کی گائیڈ بک میں اینکر ایج کے قابل دید مقامات کے باب کے شروع میں رقم تھا کہ آپ اس شہر کو دیکھنے کا آغاز چوتھے ایونیو پر واقع ''لاگ کیبن انفرمیشن سنٹر'' سے کیجیے' تو ہم نے کیا۔

اور یہ وہی دن تھا.. جب اینکر ایج کی پہلی سویر میں میں سردار ستونت سنگھ کی سیر حاصل گالیاں سُن کر میں بیدار ہوا تھا اور بے مزہ نہ ہوا تھا..

دبیز شہتیروں سے تعمیر کردہ اس کیبن کی کچی چھت پر اتنی گھنی گھاس اُگی ہوئی تھی کہ اُس میں پوشیدہ یقیناً کچھ پرندوں کے گھونسلے تھے.. یہ کیبن اس شہر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ایک خزانہ تھا..

اندر جاتے ہیں تو چوبی کاؤنٹر کے پیچھے ایک سفید بالوں والے بلند قامت بزرگ سیاہ چشمہ آنکھوں پر چڑھائے چند پریشان حال سیاح لڑکیوں کی تسلی اور تشفی کر رہے ہیں اور اُنہیں معلومات بہم پہنچا رہے ہیں.. سفید قمیض کے اوپر وہ ایک شوخ نیلی جیکٹ چڑھائے ہوئے ہیں اور یوں دکھائی دے رہے ہیں جیسے ابھی ابھی جوگنگ کر کے لوٹے ہیں..

ان بزرگوار کے عقب میں ایک بورڈ پر درجنوں پرچیاں اور اعلانات چسپاں ہیں جو الاسکا آنے والے سیاحوں کی آرزوؤں کے آئینہ دار تھے.....

''مجھے ایک مرد ہم سفر ہے جو دینالی نیشنل پارک میں کوہ نوردی کے دوران میرا ساتھ دے سکے.. ویسے میں شادی شدہ ہوں.. فون نمبر....''

''میں الاسکا سے عاجز آ چکا ہوں.. اپنے وطن امریکہ واپس جانا چاہتا ہوں.. کوئی ہے جو مجھے لفٹ عنایت کر دے..''

اور ایک پیغام تو مجھے نہایت شاعرانہ لگا ''تم مجھے الاسکا میں نہیں ملو گی تو اور کہاں ملو گی۔ مندرجہ ذیل فون پر رابطہ کرو..''

اُن پریشان حال سیاح لڑکیوں کی پریشانی دور کر کے بزرگوار ہماری جانب متوجہ ہوئے لیکن سب سے پہلے اُنہوں نے ایک موٹا تازہ رنگین میگزین ''2006ء آفیشل اینکر ایج وزیٹر گائیڈ'' نام کا ہمیں مفت میں عطا کر دیا اور پھر کہنے لگے ''ویلکم ٹو الاسکا.. میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں..'' میری شباہت کو ذرا غور سے دیکھا تو ایک مربیانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے ''انڈین؟''

میں نے بھی اُنہیں ایک مسکراہٹ سے نوازا اگرچہ قدرے زہر آلود' نہیں.. پاکستانی۔''

''پاکستانی؟'' شاید اُنہیں صدمہ ہوا یا وہ پُرمسرت ہوئے ''آپ یہاں الاسکا میں کیسے آ گئے.. لیکن یُو آر ویلکم ان الاسکا..''

ان بزرگوار کے عقب میں جس بورڈ پر سیاحوں کی آرزوئیں درج تھیں وہاں میں نے پہلی بار غور کیا کہ دنیا کے بےشمار ملکوں کے کرنسی نوٹ بھی چسپاں ہیں.. بزرگوار نے میری نظروں کے زاویے سے جانچ لیا کہ میری توجہ کرنسی کے اُن بھانت بھانت کے نوٹوں پر مرکوز ہے ''ہمارے اس انفرمیشن کیبن میں دنیا بھر سے سیاح آتے ہیں تو میں اُن سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ یادگار کے طور پر اپنے ملک کی کرنسی کا کسی بھی مالیت کا نوٹ عطا کر دیں.. تاکہ سند رہے کہ اُس ملک کا ایک باشندہ بھی الاسکا آیا تھا..''

اور لامحالہ یہ سوال میرے ہونٹوں پر آیا کہ پاکستان..

بزرگوار نے اپنے سیاہ چشمے کو ناک سے ذرا اوپر کیا اور اُن لاتعداد چسپاں شدہ نوٹوں کے معائنے میں محو ہو گئے.. اور پھر فوراً ہی بول اٹھے ''ہاں.. ہے..''

یہ ایک پانچ روپے کا چڑمرسا بوسیدہ نوٹ تھا.. اُس پر شائع شدہ لفظ ''پاکستان'' اور بابا جناح کی تصویر دیکھ کر مت پوچھیے کہ مجھ پر کیا گزری.. یکدم جدائی کا ایک اتھاہ اور تاریک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا جس کے آسمان پر کوئی ایک ستارہ بھی نہ تھا جو میری شکستہ کشتی کی رہنمائی کرتا.. یہ نوٹ دیکھ کر یکدم مجھے اُن بے انت فاصلوں کا احساس ہوا جو الاسکا اور میرے گھر کے درمیان حائل تھے.. میں اس قدر بچھڑا ہوں.. دنیا کے آخری سرے پر ایک ایسے الاسکن شہر میں ہوں جس کے نام سے میں صرف تلمیذ حقانی کے حوالے سے واقف تھا.. میں ایسا دل گرفتہ ہوا کہ وہ بزرگوار مجھ سے بار بار جو کچھ کہہ رہے تھے' وہ مجھے سنائی ہی نہ دیتا تھا.. اور وہ کہہ رہے تھے کہ یہ نوٹ تمہارے ملک کا ہی ہے ناں..

''ہیلو..'' گونج کی آواز اُس اداس سناٹے میں آئی ''تم سوتے ہو یا جاگتے ہو؟''

''سوری..'' میں نے چونک کر سر جھٹکا اور مجھے سب کچھ سنائی دینے لگا.. میں نے اپنی نیلی جین کی بیک پاکٹ میں پھنسے بٹوے کو نکالا.. اُس میں امریکی اور کینیڈین ڈالرز کے علاوہ دو چار پاکستانی کرنسی نوٹ بھی تھے اور اُن میں جو دس روپے والا تھا وہ ذرا نیا نکور لگتا تھا ''براہ کرم اُس پاکستانی نوٹ کے برابر یہ بھی چسپاں کر دیجیے..'' بزرگوار بہت پُرتشکر ہوئے اور نہایت اہتمام سے پاکستانی نوٹ کو اُس نوٹوں کے عجائب گھر میں سجا دیا..

میرے وہ ہم وطن جنہیں الاسکا کے صدر مقام اینکر ایج جانے کا اتفاق ہو تو پلیز وہ اُس لاگ کیبن میں جا کر کاؤنٹر کے عقب میں جو چوبی دیوار ہے اُس پر نصب وہ دس روپے کا نوٹ ضرور تلاش کریں جو میری وہاں موجودگی کی گواہی دے گا..

اس لاگ کیبن سے باہر آئے تو گونج مجھ سے بچھڑ گئی.. بچھڑنے لگی تو میں نے پوچھا کہ کہاں جا رہی ہو تو وہ کہنے لگی ''واش رُوم'' کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے.. تم جو ہر دوسرے قدم پر جیپ رُکواتے پھرتے ہو کہ رکو رکو مجھ پر بوجھ پڑ گیا ہے تو کیا میں نے کبھی اعتراض کیا۔

بس ہر وقت مرنے مارنے پر تلی رہتی تھی' کیا ہوا جو میں نے پوچھ لیا.. بہر طور میں نے گردن کھجلا کر ذرا خجالت کا اظہار کر دیا اور پھر لاگ کیبن کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر گونج کی واپسی کے انتظار میں محو تماشا ہو گیا۔

اینکر ایج کی مدھم دھوپ والی نرم سویر.. چوڑے فٹ پاتھ بے ہجوم.. اکا دکا لوگ.. وہ جہاں سے بھی آ رہے تھے مدھم سُروں میں آ رہے تھے اور وہ جہاں بھی جا رہے تھے وہاں جانے کی اُنہیں کچھ جلدی نہ تھی.. اور یہی کیفیت شاہراہ کی تھی جس کے پار آنکھیں بند کر کے بھی جایا جا سکتا تھا کہ اُس پر بھی جو ٹریفک رواں تھی گنی چُنی اور سست رفتار تھی.. جیسے سکردو ایئرپورٹ پر آپ جونہی جہاز میں سے باہر آ کر وہاں کی کھری فضا میں پہلا سانس لیتے ہیں تو وہ شفاف کنواری ہوا کھنکتی گھنٹیاں بجاتی آپ کے بدن میں اُتر کر اُسے ایک پوتر مندر میں بدل دیتی ہے' الاسکا کی ہوا میں بھی وہی تاثیر تھی.. غالب' غالب امکان ہے کہ نہ کبھی سکردو گئے اور الاسکا تو بالکل ہی نہیں گئے تو اس کے باوجود وہ کیسے کوچہ بلّی ماراں میں بیٹھے بیٹھے جان گئے کہ ہے ہوا میں شراب کی تاثیر.. بادہ پیمائی ہے بادہ نوشی.. اور پھر اس شہر کا آسمان تھا جو افلاک سے اُتر کر تمہارے قدموں میں بچھا جاتا تھا کہ اُسے روکنے اور پوشیدہ کر دینے والی کثیر المنزلہ عمارتوں کے یہاں انبار نہ تھے.. بیشتر عمارتیں زمین کے ساتھ لگی ہوئیں' دو یا تین منزلہ تھیں.. یوں آسمان بے دریغ زمین پر اُتر کر راج کرتا تھا اور آپ گویا اُس کی ہلکی نیلاہٹ میں ناک ڈبو کر افلاک کے سانس محسوس کر سکتے تھے..

سڑک کے پار "وائلڈ لائف اینڈ گلیشیئر کروزز" کے دفتر کے نیچے ایک لامبے قد کی جین کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے' پی کیپ پہنے' بُت بنی کھڑی لڑکی تھی اور اُس کا سراپا دل کش لگ رہا تھا.. لیکن جب اُس نے ایک بار گردن موڑ کر جانے کس کی جانب دیکھا تو وہ ایک لڑکا تھا.. گونج درست ہی کہتی تھی "ٹھرکی!"

بائیں جانب جو چوک تھا اُس کے کونے پر "پولر بیئر گفٹس" نام کا سیاحتی تحفوں کا ایک سٹور تھا جس کے باہر کھڑکیوں کی جگہ الاسکا کی لینڈ سکیپ کی بہت بڑی بڑی اور لمبی چوڑی تصویریں آویزاں تھیں.. سٹور کے صدر دروازے کے باہر مجھ ایسے سیاحوں کو راغب کرنے کی خاطر ایک براؤن رنگ کا ریچھ اپنی اگلی ٹانگیں اٹھائے یوں کھڑا تھا جیسے کرتب دکھا رہا ہو اور وہ بھی بغیر مداری کے.. اور ظاہر ہے یہ ریچھ زندہ نہ تھا ورنہ اتنی دیر تک پچھلی ٹانگوں پر کھڑا نہ رہتا.. اور چونکہ الاسکا آنے سے پیشتر احتیاطاً میں نے ریچھوں کی عادات اور اُن کے خصائل کے بارے میں کچھ مطالعہ کیا تھا تو میں جانتا تھا کہ ایک ریچھ جب جنگل میں سے نمودار ہو کر یکدم اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر نہایت خشمگیں نظر آتا ہے تو وہ طیش میں آ کر آپ پر حملہ آور ہونے کو نہیں ہے بلکہ اُس غریب کی نظر اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ جب ذرا دور تک دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر منظر وسیع کر لیتا ہے.. تو "پولر بیئر گفٹس" سٹور کے باہر جو ریچھ مدتوں سے یونہی پنجے سمیٹے کھڑا تھا تو اُس کی نظر کمزور نہ تھی' وہ نابینا تھا۔

لاگ کیبن کے باہر فٹ پاتھ کے کناروں پر نیلے رنگ کے دو چوبی بنچ نصب تھے کہ اگر استراحت فرمانے کو جی چاہے تو فرما لیجیے.. ان کے برابر میں سرخ پھولوں سے لدے ہوئے کچھ گلستان گملے تھے اور اُن کے ساتھ ایک آہنی کھمبا بلند ہو رہا تھا جس کے پہلو میں سے درجنوں تیر نما اشارے نمایاں ہوتے تھے جن پر اینکر ایج کی اس چوتھی سٹریٹ کے چوک سے دور دراز کے شہروں کے فاصلے رقم تھے.. جیسے ایک زمانے میں لاہور کے عجائب گھر کے قریب ایک سائن بورڈ

نصب ہوا کرتا تھا جس پر درج تھا کہ... لاہور سے پکاڈلی سرکس لندن.. اتنے کلومیٹر..

چونکہ میں نے اس "سنگ میل" کی ایک واضح تصویر اُتاری تھی تو میں اُسے سامنے رکھ کر اُن شہروں کے ہوائی فاصلے درج کرتا ہوں.. اور یاد رہے کہ یہ فاصلے میلوں میں ہیں۔

وینکوور (برٹش کولمبیا.. کینیڈا)	1309 ہوائی میل
بوسٹن (یو ایس اے)	" 3328
ڈینور "	" 2387
فرینکفورٹ (جرمنی)	" 4854
برلن "	" 3420
برسلز (بیلجیئم)	" 4566
ایمسٹرڈیم (ہالینڈ)	" 4475
کوپن ہیگن (ڈنمارک)	" 4313
فیئر بینک (الاسکا)	" 358
سیورڈ (الاسکا)	" 127

میں نے ایک تو برلن تک کے ہوائی فاصلے کو ذہن میں محفوظ کیا کیونکہ مجھے الاسکا سے واپسی پر کیلگری۔ ٹورنٹو کے راستے جرمن حکومت کی خصوصی دعوت پر ایک ادبی سیمینار میں شرکت کے لیے وہاں پہنچنا تھا اور دوسرا فاصلہ' بہت کم فاصلہ.. سیورڈ کا تھا.. جو اینکر ایج کے بعد ہماری اگلی منزل تھا اور اس منزلوں کی مسافت کے کھمبے کے عین نیچے جو نیلا بنچ تھا اُس پر اطمینان سے براجمان' دنیا و مافیہا سے بظاہر بے خبر ایک نظروں میں کُھب جانے والا کیا ہی پیار کرنے کے لائق ایک ایسا بوڑھا تھا جس کے لامبے گھنیرے بال اور بے ترتیب داڑھی قطب شمالی کی برفوں ایسی پاکیزہ سفید تھی.. وہ اپنے آپ میں مسکرا رہا تھا اور اُسے وہ مسافتوں کا سنگ میل پڑھنے کی کچھ حاجت نہ تھی کہ وہ جہاں تھا وہاں سے اُس کی آبائی سرزمین کا فاصلہ... زیرو کلومیٹر تھا.. وہ ان گنت صدیوں سے.. جب یہ برف زار اور وسعتیں کُن فیکون کہنے سے وجود میں آئیں اور یہاں زندگی کے پہلے آثار پانیوں میں سے پیدا ہوئے وہ تب سے یہاں تھا.. اور یہ جو سفید فام لوگ اُسے متعجب نگاہوں سے تکتے فٹ پاتھ پر چلتے جاتے تھے تو یہ جی ابھی سو دو سو برس ہوئے کہ اِدھر آ نکلے تھے' اُس کی سرزمین پر قابض ہو گئے تھے.. جہاں یہ آج کا اینکر ایج ہے۔ یہاں تو ان گنت زمانوں سے خدا کی برفانی اور ویرانی سلطنت تھی جس کا وہ شہزادہ تھا.. اور آج وہ فقیر تھا..

اُس بوڑھے کی آنکھیں ترچھیں منگول تھیں' پستہ قد تھا' ناک قدرے چوڑی تھی اور اُس کے چہرے پر برفوں ایسی معصوم مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وہ ایک اسکیمو تھا..

اینکر ایج کی لاگ کیبن انفرمیشن سنٹر کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نیلے بنچ پر براجمان نیلی جیکٹ اور سیاہ پتلون میں بوسیدہ جوگرز میں' بے وجہ مسکراتا' قدرے حواس باختہ لگتا.. اس لیے کہ وہ ایک خمار میں تھا.. امریکہ میں جتنے بھی بچے کھچے ریڈ انڈین محفوظ تو نہیں حنوط کر لیے گئے ہیں' اُن کی بستیوں کو ایک ثقافتی ورثہ کے طور پر پھر سے جوں کا توں تعمیر کر لیا گیا ہے تو وہاں چند ریڈ انڈین لوگوں کو جیسے فینسی ڈریس شو میں بہروپ کرتے ہیں' اُنہیں آبائی لباس پہنا کر آباد کر دیا گیا ہے اور جونہی وہ کسی گورے سیاح کو دیکھتے ہیں تو ''تاتا باک ڈانس'' کرنے لگتے ہیں اور اس سے فارغ ہو کر نیلی جینوں اور ٹی شرٹوں میں ملبوس ہو کر حکومت کی جانب سے عطا کردہ الاؤنس سے شراب خرید کر اُسے غٹ غٹ پی کر ٹُن ہو جاتے ہیں کہ اور کیا کریں اور یوں بھی اپنے درخشاں ماضی کو بھلا دینے کا واحد ذریعہ خمار ہے..

الاسکا میں بھی یہی صورتِ حال ہے..

آبائی لوگوں کو حکومت کی جانب سے اسی نوعیت کی مالی امداد فراہم کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں یہاں جتنے بھی اسکیمو نسل کے لوگ ہیں' مرد و زن سب کے سب اُنہیں کچھ کام کرنے کی حاجت نہیں ہے تو وہ سب کے سب بیشتر اوقات نشے میں گم ملتے ہیں.. کینیڈا میں امریکہ کی نسبت صورت حال قدرے مختلف اور بہتر ہے.. یہاں آبائی لوگوں کے گاؤں اور بستیاں ہیں جہاں وہ ایک میوزیم پیس نہیں ہیں' سچ مچ کے انسان ہیں' کھیتی باڑی کرتے ہیں' کاروبار کرتے ہیں اور اُنہیں ایک قانون کے مطابق اُن کی آبائی سرزمینوں کا کچھ کرایہ ملتا ہے..

پاکستانی نژاد ایک نہایت محنتی اور جانفشانی سے کام کرنے والے بینکر نے شدید گلہ کیا کہ.. ''تارڑ صاحب ہم لوگ دن رات مشقت کرتے ہلکان ہو جاتے ہیں.. ہماری آمدن کا تقریباً نصف حصہ ٹیکسوں میں کٹ جاتا ہے اور یہ جو مقامی آبائی انڈین لوگ ہیں' ہاتھ پر ہاتھ دھرے نکمے بیٹھے رہتے ہیں اور ہمارے ٹیکس اُن پر خرچ کیے جاتے ہیں.. ناانصافی کی انتہا ہے..''

اُن کی شکایت بھی بجا تھی..

لیکن.. کوئی بھی تازہ آبادکار یہ حقیقت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اس سرزمین کے آبائی وارث تو وہی ہیں جن کے طفیل وہ آج اپنے ملکوں کی نسبت کہیں زیادہ خوشحال اور دولت مند ہو رہے ہیں..

زورآور نے ہمیشہ راج کیا ہے چاہے وہ وحشی اور تہذیب و تمدن سے یکسر بیگانہ ہی کیوں نہ ہو.. اور وہ اکثر ہوتا ہے..

منگول اپنے گھوڑوں کا خون پیتے آسمانی خداؤں کے پھریرے لہراتے تہذیب کے درخشاں بغداد کو ملیامیٹ کر کے فرات کو سرخ کر دیتے ہیں..

آریائی وحشی ہڑپہ اور موہنجوداڑو ایسی تہذیب یافتہ بستیوں کو صرف گھوڑے اور لوہے کے زور سے برباد کر دیتے تھے..

بلاد عجم ایران کی اُس سلطنت کو جو نہ صرف یونان کی تہذیب کی ہم سری کرتی تھی بلکہ ایک وقت میں اُس

ے برتر تھی.. اُس کو روند ڈالتے ہیں.. ہسپانوی صرف بندوق اور بارود کے زور پر جنوبی امریکہ کی شاندار اِنکا تہذیب کو تہس نہس کر دیتے ہیں اور سونے کی اُن سلطنتوں کے گہنے لُوٹ لیتے ہیں.. اور پھر یورپ بھر کے بدکردار اور تہذیب سے ناآشنا گورے محض اسلحے کی برتری کے سبب کیسے شاندار بدنوں اور اخلاق والے خوبصورت ریڈ انڈین لوگوں کو اُن کی اپنی سرزمین سے بے دخل کر دیتے ہیں..

اور زورآوروں کے ظلم کی یہ داستانیں بہت طویل ہیں..

اور اُدھر کینیڈا میں الاسکا میں بھی فرانسیسی اور انگریز قدم جماتے ہیں اور وہ جو زمین کے بیٹے تھے اُن سے اُن کی سرزمین چھین لیتے ہیں اور جو ہلاکت سے بچ جاتے ہیں اُن کے وظیفے لگا دیتے ہیں کہ اب تم ایک میوزیم پیس ہو' کچھ کام کاج نہ کرو' شراب پیو اور اُس میں اپنے ماضی کو غرق کر دو..

میں لاگ کیبن کے سامنے ایک نیلے بنچ پر براجمان اپنی زندگی کے پہلے اسکیمو.. اگرچہ قدرے مخمور اسکیمو سے کچھ میل ملاپ کرنے کی چاہت میں اُس کے برابر میں جا بیٹھا۔

اب ایک اسکیمو سے جانے کونسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں تو میں چپ بیٹھا رہا.. اُس نے میری جانب کچھ توجہ نہ کی.. سڑک پر سے گزرتی ٹریفک پر اپنی مہین آنکھیں رکھے بے وجہ مسکراتا رہا....

وہ کڈلی سار رولی پولی' گلے لگا کر خوب بھینچنے کے لائق ایک اسکیمو تھا..

میں نے اپنے پاکستانی گولڈ لیف کے آخری پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا.. جونہی میں نے پہلا کش لگا کر الاسکا کی ستھری فضا کو دھوئیں سے آلودہ کیا تو وہ متوجہ ہو گیا.. اور نہایت امریکی لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''تم مجھے ایک سگریٹ پلا سکتے ہو؟''

میں نے فوراً گولڈ لیف کا پیکٹ اُس کی جانب بڑھا دیا ''پلیز..''

اُس نے پیکٹ کو ذرا غور سے دیکھا ''یہ تو کوئی اجنبی برانڈ ہے.. کہاں کا ہے؟''

''پاکستان کا..''

''پے کِستان.. یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''

''اس لیے کہ میں بھی پے کِستان سے آیا۔''

''اوہ.. ہاں.. پے کِستان..''

''کیا آپ پے کِستان کو جانتے ہیں کہ یہ کہاں ہے؟''

''یہیں کہیں اس دنیا میں کہیں ہے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ تمہاری پرابلم ہے انڈیا کے ساتھ.. اباؤٹ کے شمیر..''

اب ذرا توجہ کیجیے کہ دنیا کے آخری سرے پر واقع الاسکا کے صدر مقام اینکر ایج میں ایک اسکیمو بھی یہ جانتا ہے کہ پاکستان کی پرابلم ہے انڈیا کے ساتھ کشمیر کے حوالے سے..

''ہاں وہی پاکستان..''

''تو کیا تم انڈیا سے نفرت کرتے ہو؟''

''نہیں.. ہمارے درمیان ایک ماضی مشترک ہے۔ کم از کم میں تو انڈیا کے لیے نفرت کا لفظ استعمال نہیں کر سکتا.. ہو سکتا ہے انڈیا ہمیں پسند نہ کرتا ہو..''

''کے شمیر.. کے شمیر..'' وہ اپنے خمار میں ہنسا ''او کے... مجھے ایک پے کستانی سگریٹ پینے دو۔''

اسکیمو بابا نے میرا پیش کردہ سگریٹ سلگا کر اُس کا دھواں بدن میں اُتارا تو ایک جھرجھری سی لی ''اوہ.. گڈ پے کستان سگریٹ.. ویری پاورفل.. لیکن'' وہ پھر ہنسا ''انڈیا پے کستان.. کے شمیر ناٹ گڈ پرابلم..''

میں اُس اسکیمو بابا میں سے کچھ زیادہ معلومات کشید نہ کر سکا کہ وہ وہاں تھا جہاں سے اُسے اپنی خبر بھی نہ آتی تھی.. کچھ غتر بود تھا..

''وَن فوٹو؟'' میں نے کیمرہ نکال کر گزارش کی..

''اوہ ہاں.. لیکن.. صرف ایک فوٹو..''

میں نے لاگ کیبن میں سے نکلنے والے ایک سیاح سے درخواست کی کہ وہ ہم دونوں کی ایک تصویر اُتار دے.. اور وہ تصویر اتر گئی..

اس تصویر میں وہ سب کچھ نمایاں ہے جو میں بیان کر چکا ہوں.. وہ آہنی سنگ میل جس پر دنیا بھر کے فاصلے رقم ہیں.. ''پولر بیئر گفٹس'' سٹور کے باہر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا احمق بھالو.. میں الاسکا کی مدھم کرنوں کی سویر میں ہنستے ہوئے بابا اسکیمو کو تک رہا ہوں اور وہ ایک ٹُن شدہ حالت میں اپنی ایک ٹانگ اٹھائے اپنے جوگر کی نمائش کرتے ہوئے مسکرا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ.. بگ پرابلم.. انڈیا پے کستان' کے شمیر.. بگ پرابلم..

میں اس نایاب اسکیمو کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتا تھا کہ شاید یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری اسکیمو تھا.. بھلا جینوئن اور سو فیصد آتھنٹک اسکیمو روز روز ملتے ہیں.. کبھی گکھڑ منڈی یا بھائی پھیرو میں ملتے ہیں.. نہیں ملتے ناں!.. تو اس لیے میں اسے ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتا تھا.. لیکن میں اُس سے جو سوال کرتا وہ جواب میں میری جانب دیکھتا اور اُس کی ترچھی منگول آنکھیں مسکرانے لگتیں.. کبھی کبھار وہ کچھ بڑبڑاتا.. میں پوچھتا کہ کہاں کے رہنے والے ہو تو وہ اینکر ایج کے کوچہ و بازار کی جانب ایک مُبہم سا اشارہ کرتا.. کچھ دیر بعد کہنے لگا.. ''پے کستانی سگریٹ ویری گڈ' نو پرابلم..''

میں نے فوراً گولڈ لیف کا ایک اور سگریٹ نذر کر دیا..

''الاسکا ویری گڈ؟'' اُس نے سگریٹ میں سے ایک ایسا طول کش کھینچا کہ وہ آدھا ہو کر پژمردہ سا ہو گیا... اُس کا دھواں اُس کے وجود کے اندر ہی کہیں دفن ہو گیا..

''یس.. الاسکا اِز امیزنگ.. ویری گڈ۔''

''پے کستان آلسو ویری گڈ..'' اُس نے مجھ سے نہیں سگریٹ سے مخاطب ہو کر کہا..

''پے کستان.. زندہ باد..'' میں نے بابے کے ساتھ یونہی شغل کرنے کی خاطر کہا..

''یہ تم نے کیا کہا..؟'' وہ ذرا ہوشیار ہوا..

''پے کستان.. زندہ باد.. یعنی پے کستان ویری گڈ..''

''اوہ.. ہاں.. کیوں نہیں پے کستان زندہ باڈ.. ویری گڈ..''

مجھے گمان نہیں بلکہ سو فیصد یقین ہے کہ وہ تاریخ میں پہلا اسکیمو تھا جس نے ''پاکستان زندہ باڈ'' کا نعرہ لگایا تھا۔

مجھے احساس ہوا کہ اُس کی خود فراموشی' کم گوئی اور مسلسل مسکراہٹ محض خمار کا کرشمہ نہ تھا.. اُسے یہاں سے جو بھی گزرتا تھا ایک انسان کے طور پر نہیں بلکہ ایک عجوبے' ایک میوزیم پیس کی صورت میں دیکھتا تھا.. اُس کے ہمراہ تصویریں اُتروانا تھا' اُسے ہاتھ لگا کر اطمینان کرتا تھا کہ کیا یہ واقعی ایک سچ مچ کا اسکیمو ہے اور اُسے اپنی ہی سرزمین پر ایک عجوبہ ہو جانا پسند نہ تھا.. اُس کے نیم سرخ منگولی خدوخال پر ایک برفانی مشقت نقش تھی جو گواہی دیتی تھی کہ یہ جو بھرا پُرا آباد اینکر ایج کا شہر اُس کے آس پاس رواں ہے تو یہ ایک سو برس پیشتر تک یہاں نہ تھا اور اُن زمانوں کو بیتے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا جب وہ ایک برف کے بنے ہوئے گھر اِگلو میں رہتا تھا.. رینڈیئر کے ریوڑ پالتا تھا.. منجمد برف میں شگاف کر کے اُس کے نیچے جو پانی رواں تھے اُن میں سے مچھلیاں شکار کرتا تھا.. اور برفوں پر پھسلنے والی گاڑی کے آگے قطبی سفید کُتے جوت کر برفوں کی دنیا میں اپنا رزق تلاش کرنے کے لیے نکل جاتا تھا..

یہ برفانی ماضی کب کا پگھل چکا تھا.. اور اس کے پانی تاریخ کے مہیب کنوئیں میں کب کے دفن ہو چکے تھے.. جہاں اُس کا اِگلو ہوا کرتا تھا وہاں دور دیسوں سے آئے ہوئے گوروں کے شہر اور قصبے اُبھرتے تھے اور جہاں اُس کی برفانی رتھ کو بادامی اور نیلی آنکھوں والے کُتے کھینچتے تھے وہاں شاہراہیں تعمیر ہو چکی تھیں.... اُس کا ماضی اور اُس کی روایات ان کے تلے کہیں دم توڑ چکے تھے..

اُسے تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا گیا تھا.. ریڈ انڈینز اور آسٹریلیا کے ابورجینز کی مانند.. اور کوئی دن جاتا ہے جب تاریخ کے اس کوڑے دان میں فلسطینی بھی پھینک دیئے جائیں گے.. لیکن صرف ایک فرق کے ساتھ کہ اُنہیں صرف اسرائیلی بل ڈوزر ہی اُس کوڑے دان کی جانب نہیں دھکیلیں گے بلکہ اُن کے ہم مذہب پر تقدس اسلامی ملک بھی اُس بل ڈوزر کو دھکے لگائیں گے اور امت مسلمہ کو چار چاند لگائیں گے۔

میں دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ یہاں سے نزدیک ترین شراب خانہ کہاں واقع ہے تاکہ میں اسکیمو بابا کو اپنے پلّے سے کچھ شراب پلا کر اسے مزید مخمور کر کے اس کی زبان کو آوارہ کر دوں.. وہ مے پرستی کی حالت میں ذرا کھل جائے اور مجھے اپنے پگھل چکے اِگلو گھر میں ایک شب بسر کرنے کی پیش کر دے اور مجھے اپنی برف پر پھسلنے والی گاڑی میں اپنے پہلو میں کھڑا کر کے برفانی کُتوں کو شُشکارتا اُن برف زاروں تک لے جائے جہاں آج تک کوئی پاکستانی نہیں گیا..

○●○●○

''آؤ اس اسکیمو شہزادے کو کچھ شراب پلاتے ہیں''

میں ابھی انہی خوابوں اور خیالوں میں تھا کہ لاگ کیبن کے عقب میں سے گونج کا سفید سراپا نمودار ہوگیا..وہ حسب خصلت ایک روئی سی شکل بنائے ایک تیر کی مانند سیدھی میری جانب بیگانگی سے چلی آ رہی تھی جب وہ یکدم ٹھٹک گئی۔ مجھے اسکیمو بابا جی کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھنے پر ذرا ٹھٹکی اور رُک گئی.. میں نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ چلی آؤ' پر وہ اپنے مقام سے ٹس سے مس نہ ہوئی' جیسے فٹ پاتھ کے سیمنٹ میں اُس کے پنجے جکڑے گئے ہوں..اُس نے اپنی لامبی گردن کو خم دے کر مجھے پاس آ جانے کو کہا..

میں نے اسکیمو بابا سے رخصت چاہی اور جدائی کے تحفے کے طور پر ایک اور سگریٹ کی پیشکش کی جو اُس نے مسکراتے ہوئے قبول نہ کی اور اُس کے آخری الفاظ تھے..''پے کستان گڈ..سگریٹ گڈ..کے شمیر بگ پرابلم۔''

''میری غیر موجودگی میں تم اس اسکیمو بوڑھے کے ساتھ کیوں یار یار ہو رہے تھے..ان لوگوں سے دور رہنا چاہیے..''

''یہ لوگ..یہی لوگ اس سرزمین کے آبائی بیٹے ہیں..''

''بُل شٹ..'' وہ خفا سی ہوگئی ''نکمے اور شرابی۔ گند ذہن اور دھوکے باز.. یہ بوڑھا یونہی تو اتفاقاً ٹورسٹ انفرمیشن کی اس کیبن کے باہر ایک بنچ پر یونہی تو نہیں بیٹھا ہوا.. یہ ہر ٹورسٹ کو جھوٹی سچی کہانیاں سُنا کر پیسے بٹورتا ہوگا اور اُن کے پلّے سے شراب پیتا ہوگا..مجھے یقین ہے۔''

''اور تم بھی یقین کرو گونج اُس نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا..سوائے ایک سگریٹ کے۔''

یہ گونج بھی تو فلوریڈا کی تھی' اس میں بھی نسلی تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا.. پرندے جن خطوں میں آباد ہوتے ہیں اُن پر اُن خطوں کے تعصب اور منافرت کا اثر ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ گونج بھی ایک آبادکار تھی' کسی اور ملک سے آ کر یہاں آ بسی تھی..میں کسی وقت ''برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا'' کی ورق گردانی کر کے پتہ کروں گا کہ کیا یہ فلوریڈا کی گرے کرین کونجیں تب بھی تھیں جب وہاں ریڈ انڈین رہتے تھے یا یہ یورپی آبادکاروں کے ہمراہ کہیں سے درآمد ہوئی تھیں..میں نے اُس سے کچھ بحث نہ کی' میں نہیں چاہتا تھا کہ اُسے کوئی ایسا بہانہ مہیا کر دوں جس کی آڑ لے کر وہ مجھے الاسکا میں تنہا چھوڑ کر فلوریڈا پرواز کر جائے..

''تم درست کہتی ہو..''میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا..

''تو اب کہاں چلیں۔'' چونکہ وہ فراغت حاصل کر کے ہلکی پھلکی ہوگئی تھی اس لیے وہ بہتر موڈ میں آ گئی۔

''میں تمہاری غیر موجودگی کے دوران بزرگوار کے عطا کردہ ویز میگزین ''2006ء آفیشل اینکراج وزیٹرز گائیڈ'' کا نہایت اہتمام سے تفصیلی مطالعہ کر چکا ہوں تو گونج جی یہاں تو ایک دو معمولی عجائب گھروں اور ایک تھیٹر کے سوا دیکھنے کو کچھ بھی نہیں..جو کچھ ہے یہاں سے باہر ہے..ویسے یہاں لاتعداد ریستوران ہیں' کسی میں چاکلیٹ کی آبشار ہے' کسی میں سالمن مچھلی تازہ شکار کردہ ہے..پھر لومڑیوں اور بھیڑیوں کی کھالوں کے مہنگے اوورکوٹوں کے سٹور ہیں اور پھر شہر سے باہر کسی مقام پر جیسے لاہور میں نوگزے کی قبر ہے ایسے آپ نوگز لمبی مچھلی شکار کر سکتے ہیں..''

''تو اینکراج میں دیکھنے کو کچھ نہیں؟''

''نہیں..سوائے اس نیلے بنچ پر براجمان خمار آلود مسکراتے اسکیمو بوڑھے کے..آؤ یار اسے دوست بناتے ہیں' اسے ساتھ لے جا کر کہیں شراب پلاتے ہیں اور اس کی گمشدہ زمین کی کہانیاں سنتے ہیں..''

''تم ایک ناقابل علاج رومینٹک ہو۔'' وہ میرے رویئے سے خوش نہ ہوئی..

ہم نے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا' اینکراج کی شفاف تنہائی میں اس کے سیدھے سادے بازاروں میں چلتے رہے.. ایک سووینئر سٹور سے کچھ یادگار اشیاء خریدیں..وہی' کی رنگ' لائٹر' ٹی شرٹس' کھلونا ریچھ اور اسی نوعیت کا سیاحتی کاٹھ کباڑ.. اسی سٹور کے ایک اور حصے میں زنانہ اور مردانہ ملبوسات تھے اور اُن میں سے ایک ملبوس کو دیکھ کر میں نہایت پُراشتیاق ہوا..یہ ایک نہایت باریک زنانہ زیر جامہ یعنی پینٹی تھی اور جس پر ایک ریچھ کی شبیہہ تھی اور اُس پر لکھا تھا ''الاسکا یہاں نہیں ہے''... یہ ایک گہری رمزیہ عبارت تھی کہ بھلا الاسکا یہاں ایسے گرم مقام پر کہاں ہو سکتا ہے..

میں نے یونہی مذاق میں گونج سے کہا کہ اگر تم ایک لڑکی ہوتیں تو میں تمہیں یہ پینٹی خرید دیتا اور وہ مسکرا کر کہنے لگی ''ٹھرکی..''

ہم بالآخر سمندر کے کناروں پر ایک راستے پر چلتے چلتے ایک دھوپ بھرے پارک کی ڈھلوان گھاس تک پہنچے.. اور یہ تو وہی جگہ تھی گزرے تھے ہم جہاں سے..یہ وہی مقام تھا جہاں پچھلی شب ہم نے شفق کے نرالے رنگ دیکھے تھے اور اس سمندر کا سامنا کرتے ہریاول پارک کی گھاس پر دراز ہو کر دھوپ سینکنا اور آنکھیں بند کر کے اونگھنا بھی کیا' کمال کی فراغت اور عیاشی تھی..

پارک اور سمندر کے درمیان ریل کی پٹڑی بچھی تھی..ایک بار جب میں اُس افیونی اونگھ سے باہر آیا تو وجہ وہ ٹرین کے گزرنے کی' پٹڑی پر گھسٹتے آہنی پہیوں کی گڑگڑاہٹ تھی جو میرے کانوں میں در آئی تھی..میں نے بمشکل اپنی اونگھتی آنکھیں کھولیں..سمندر کے منظر کو روپوش کرتی ایک ٹرین اور وہ بھی ہماری طرح اونگھتی ہوئی ایک ٹرین شور کرتی گزرتی تھی جس کے انجن پر ''الاسکا..4.15'' درج تھا..

میں پھر چونکا کہ میں کہاں ہوں..الاسکا میں کیسے ہوں..لیکن ٹرین کے انجن پر اگر الاسکا لکھا ہوا ہے تو میں الاسکا میں ہی ہوں گا..ٹرین گزر گئی تو پھر سے اونگھ آ گئی..اور یونہی شام ہوگئی..اور یونہی غروب کے زمانے آ گئے اور یونہی ہر شے

شفق کے نرالے رنگوں میں رنگ گئی..

اور گونج تو.. ہر رنگ میں رنگی جاتی تھی..

میں نے اُس اونگھ سے بیدار ہو کر اپنی ہتھیلی آنکھوں کے سامنے کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری اُنگلیاں بھی اِک رنگِ حنا میں ہیں.. ایسی حنا جو صرف الاسکا کی ویرانیوں اور تنہائیوں میں ہی پس کر اپنے رنگ بھڑکیلے اور تیز کرتی ہے.. رنگ لاتی ہے حنا.. پتھر پہ نہیں.. الاسکا میں پس جانے کے بعد..

ایسی حنا آلود الاسکن شام میں یہ کیا ہے کہ ایک پرندے کی رفاقت ہے.. کوئی محبوب نظر ہوتا.. کوئی عشق خاص ہوتا..

''میں بھی اسی قلق میں مبتلا ہوں۔'' گونج نے ایک سوگوار لہجے میں کہا ''کہ یہ کیا ہے کہ یہاں اس حنائی شام میں ایک انسان کی رفاقت ہے' کوئی جانِ جاں مرد گونج ہوتا.. کوئی قدیمی عشق ہوتا..''

کسی کو کچھ بھی یہاں حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم اور کسی کو تُو نہ ملا

ستونت سنگھ سے اکثر صبح سویرے ناشتے کے کمرے میں ملاقات ہو جاتی.. وہ صرف نگرانی کرنے کے لیے آتا کہ اُس کی موٹی الاسکن ملازمہ کیا موٹل میں قیام پذیر گاہکوں کی مناسب طور پر میزبانی کر رہی ہے یا نہیں.. اور وہ اُسے کمرے میں داخل ہوتے ہی نہایت شستہ لہجے میں کہتا کہ.. ہیلو مسز جیکسن.. ہاؤ آر یو دِس مارننگ مسز جیکسن.. یُو لُک گُڈ دِس مارننگ.. اور اس کے بعد نہایت اہتمام سے پنجابی میں اُس کی ماں بہن ایک دیتا.. اوئے موٹیے تیری تو میں ماں کی.. لیکن بدستور مسکراتے ہوئے کہتا یوں کہ وہ مسز جیکسن یا جو بھی اُس کا نام تھا اُس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ مسٹر سنگھ نے اُس کی والدہ محترمہ کے ساتھ ایک نہایت معیوب عمل کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا ہے..

میں اگر کھلا چھوڑ دیا جاؤں کہ نہ کلوسٹرال ہائی ہو گا اور نہ بلڈ پریشر تو میں ناشتے پر پراٹھا پسند کرتا ہوں' رات کے کسی بھی ٹھنڈے سالن کے ساتھ.. اور اگر پراٹھا نہ ہو تو سب ناشتے بیکار.. تو میں زیادہ سے زیادہ ایک ٹوسٹ' پنیر یا مارملیڈ کے ساتھ پر گزارا کر لیتا ہوں.. جب کہ یہاں چونکہ ناشتہ آن ہاؤس تھا' کرائے کی رقم میں شامل تھا۔ چنانچہ موٹل میں قیام پذیر سیاح حضرات بے دریغ انڈے پراٹھے کھاتے چلے جاتے تھے.. ٹوسٹ اور مکھن نگلتے چلے جاتے تھے' پھر چائے یا کافی کے کپ بھرتے اور خالی کرتے چلے جاتے تھے.. تاکہ.. لنچ کی حاجت نہ رہے..

ستونت سنگھ میری پلیٹ کی ویرانی دیکھ کر جس میں زیادہ سے زیادہ ایک اُبلا ہوا انڈہ لڑھک رہا ہوتا اور ایک آدھ توسٹ بے جان پڑا ہوتا.. نہایت رنجیدہ ہوتا اور نہایت پیار سے سرزنش کرتا کہ.. ''مہاراج یہ چٹے باندر تو میرے انڈوں اور ڈبل روٹیوں کا صفایا پھیر رہے ہیں.. مارملیڈ اور جیم کی بوتلیں خالی کر رہے ہیں تو آپ ایک پنجابی بھرا ہو کر بھی صرف ایک توسٹ کو چوہے کی مانند کتر رہے ہو تو کچھ تو کھاؤ پیو.. جان بناؤ..''

اور ایک صبح اُس نے میرے قریب آ کر نہایت رازداری سے سرگوشی کی ''مہاراج آپ کا یارانہ ٹُٹ گیا ہے؟''

''کس کے ساتھ..''

''وہی جو آپ کی کُڑی تھی' جس نے اپنی گاڑی بیک کرتے ہوئے میرے ڈرائیور کی کار کی بتیاں توڑ دی تھیں اور آپ نے سفارش کی تھی تو وہ کُڑی..'' وہ مزید قریب آ گیا ''آپ کے ساتھ تو کبھی نظر نہیں آئی.. وہ ایک امریکی باندر کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے اور.. میں تو نظر رکھتا ہوں نا.. وہ کبھی کبھی اُس کے کمرے میں غائب ہو جاتی ہے.. سونہہ گرو کی..''

''سردار جی.. میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ ہمارے سیاحتی گروپ میں شامل ایک لڑکی تھی اور میرا اُس کے ساتھ کچھ یارانہ وغیرہ نہ تھا۔''

''چھڈو جی.. ہم سے چھپاتے ہو.. آپ نے اگر یارانہ نہیں تھا تو سفارش کیوں کی تھی' کچھ اَن بن ہو گئی ہے..''

''ہاں ہو گئی ہے۔'' میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

گونج نے پہلے دن سے اُسے پسند نہ کیا تھا..

وہ ہمیشہ اعتراض کرتی کہ جب کبھی تمہیں یہ سنگھ بندہ ملتا ہے تو تم دونوں ایک عجیب جناتی زبان میں گفتگو کرنے لگتے ہو' قہقہے لگاتے ہاتھ ملاتے ہو اور کبھی کبھار گلے لگ جاتے ہو.. جیسے تم ہوموز ہو.. ہم جنس پرست ہو..

میں نے اُسے بتایا کہ اس نوعیت کے اعتراض پہلے بھی مجھ پر ہو چکے ہیں جب میں اپنے سردار دوست سکھدیپ کے ساتھ ساؤتھ اینڈ کی ہائی سٹریٹ میں اس کا ہاتھ تھامے گھوما کرتا تھا تو میری ایک دوست انجیلا کی چند سہیلیوں نے اس ارتکاب جرم کو دیکھ لیا تھا اور وہ اُسے طعنے دیتی تھیں کہ تمہارا بوائے فرینڈ تو ہومو ہے.. میں نے بڑی مشکل سے ناراض ہو چکی انجیلا کو منایا تھا کہ ہمارے ہاں لڑکے بالے اسی طور گھوما کرتے ہیں لیکن لڑکیوں بالیوں کے ساتھ یوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومنا ممنوع ہے..

گونج کو میں نے اس ایک مرد کے ساتھ گلے لگ جانے کے ثقافتی رویئے سے آگاہ کرنا مناسب نہ جانا کہ یہ تاریخی عوامل تھے جنہیں وہ ایک مغربی گونج ہونے کی حیثیت میں سمجھنے سے قاصر تھی..

○●○●○

''غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بُوئے دوست. تلمیذ حقّانی الاسکا میں''

اینکر اتیج میں قیام کا یہ تیسرا دن تھا..

ہم تمام ریستوران' بارز اور قابل دید مقام کھنگال چکے تھے.. سمندر کے کنارے بیٹھ کر ڈھیروں شفق کو اپنے چہروں پر گلنار کر چکے تھے.. وہاں کے پارک میں سارا دن اونگھنے والے بوڑھوں نے بھی ہمیں پہچاننا شروع کر دیا تھا جب ایک ڈھلتی شام میں موٹل کو لوٹتے ہوئے ہم ایک مختلف راستے سے لوٹے تو ایک جدید طرز کی عمارت کے ماتھے پر ''الاسکا نیٹو ہوسپٹل'' کے الفاظ آنکھوں میں اُتر گئے..

اور وہاں سے.. اُس ہسپتال کے شیشے کے فراخ صدر دروازے میں سے ایک خوشبو فرار ہوئی اور اس نے میرا گھیراؤ کر لیا۔

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بُوئے دوست
یہ ہسپتال میرے دوست کا ندیم رہا تھا..
اُس کا چارہ گر اُس کا غم گسار رہا تھا..

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ دوست لاہور کا ہو اور اُس کا ندیم یہاں اتنی بے بہا دُوریوں پر الاسکا میں ہو.. لیکن زندگی کے کھیل تماشے اور دھوکے یہی ہیں، یہ تمہیں ایسے ایسے فریب دیتی ہیں کہ تم دنگ رہ جاتے ہو۔ تمہیں دھوبی پڑا دے کر چاروں شانے چت کر دیتی ہے اور تمہارے سینے پر سوار ہو کر کہتی ہے.. اب بولو.. بڑے سیانے بیانے بنے پھرتے تھے، اپنی دانش وری کے گھمنڈ میں دعوے کرتے تھے کہ میں زندگی کو جانتا ہوں.. اب بولو.. کیا تم نے لاہور کی اُن تپتی دوپہروں میں گمان بھی کیا تھا کہ وہ جو تمہارا دوست، تمہارا محسن اور بے مثال شخص ہوا کرتا تھا اُس کا ندیم اینکر اتیج الاسکا ہو گا اور.. کبھی تم وہاں ہو گے اور اُسے یاد کرو گے..

''زکوزکو..'' میں نے التجا کی..

''کیوں؟'' سلوچ حسب اطوار ایک اونگھ میں تھی ''مجھے نیند آ رہی ہے.. میں موٹل پہنچ کر سونا چاہتی ہوں.. یہاں.. اس نیم ویران شاہراہ پر تم نے کیا دیکھ لیا ہے کہ زکوزکو کا غل مچا دیا ہے۔''

''سلوچ.. میرے تن بدن میں ایک صحرا نے جنم لیا ہے اور اُس میں ایک ایسا غزال چوکڑیاں بھرتا ہے، جس کا بدن سونے کا ہے اور جس کا دل کسی ایک قوم، قبیلے یا عقیدے میں نہیں کل جہان میں دھڑکتا ہے اور وہ غزال کبھی یہاں اس الاسکا نیٹو ہوسپٹل'' میں لاچار رہا ہے.. اس لیے زکوزکو..''

''او کے..'' سلوچ نے کندھے سکیڑ کر ناگواری سے کہا..

چیمبر لین روڈ پر واقع میری آبائی دکان ''کسان اینڈ کمپنی'' کو چھوتی سرکتی موچی دروازے کی جانب بل کھاتی جاتی سڑک پر گرمیوں کی ایک اور دوپہر دم توڑتی تھی اور میں حسب معمول گاہکوں کے نہ آنے کی دعائیں کرتا اُس لکیر دار رجسٹر پر جھکا جو میں نے اردو بازار کی ایک دوکان سے شاید پونے دو روپے میں خریدا تھا، اُس پر جھکا اپنی ایک طویل سترہ ملکوں پر محیط آبلہ پائی اور آوارگی اور در بدری کی تفصیل رقم کر رہا تھا.. اور رجسٹر کا کاغذ اتنا کھردرا اور موٹا تھا کہ اُس پر سیاہی پھیلتی تھی اور میرے لکھے ہوئے حروف جا بجا دھبوں کی صورت اختیار کرتے تھے جب ایک دراز قامت قدرے پُر آسائش جسامت کا شخص اپنے سکوٹر کو فٹ پاتھ پر ایستادہ کرتا ہے اور ذرا جھجکتے اور جھکتے ہوئے دوکان کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ جب میں اُسے ایک گاہک جان کر قدرے بے رُخی سے کہتا ہوں ''جی فرمایئے۔''

وہ کچھ دیر اپنا سانس درست کرتا ہے.. پھر کچھ اور دیر اپنے گھنے بال درست کرتا ہے اور پھر براہ راست مجھ سے مخاطب نہیں ہوتا.. دوکان کے فرش پر نظریں رکھتے ہوئے کہتا ہے ''پنجاب پبلک لائبریری کے لائبریرین نذیر صاحب جو کہ میرے دوست ہیں انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ لائبریری کے تہہ خانے میں پچھلے ایک برس سے اُترتے ہیں اور شام تک باہر نہیں آتے.. وہاں جو نایاب اور بھر بھرے نسخے ہیں، اُندلس کے بارے میں آپ اُن کی ورق گردانی کرتے ہیں.. تو آپ کرتے ہیں؟''

''جی..'' میں نے اقرار کیا ''میں وہاں پچھلے ایک برس سے اپنے اُندلس کے سفرنامے کے لیے کچھ نایاب تاریخی مواد کی جستجو میں رہتا ہوں..''

''آپ اُندلس گئے ہیں ناں..'' اُس نے یکدم بے تابی سے پوچھا۔

اور اُس کے اس سوال سے میں کچھ خفا ہو گیا ''جی.. ظاہر ہے اگر میں پچھلے ایک برس سے پنجاب پبلک لائبریری کے تہہ خانے میں اُن کتابوں کے ورق پلٹتا رہا ہوں جو پلٹنے سے بھی بھُر نے کو آتے تھے تو.. میں اُندلس گیا ہوں۔''

''اُندلس''.. اُس اجنبی شخص کی آنکھوں میں ایک ایسی عقیدت نقش ہوئی جو صرف ایک مُرشد کو دیکھ لینے سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اگر میں احتیاط نہ کرتا تو وہ محض اس پاداش میں کہ میں اُندلس گیا تھا، مجھے چومنے لگتا..

یہ تلمیذ حقانی تھا..

اُندلس کا اتنا شیدائی کہ اگر سیون اپ کا کوئی اشتہار دیکھ لیتا تو اُس کے صرف ''ایس'' پر قربان ہونے لگتا کہ ایس سے سپین کا آغاز ہوتا ہے اور وہاں اُندلس ہے.. اُن زمانوں کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں پرفارم کرنے کی خاطر موسیقی کا ایک بینڈ سپین سے آیا اور اُن میں جو ڈھولچی تھا اُس کا تعلق اُندلس سے تھا تو حقانی صاحب اُس کے لیے پھولوں کا ایک گلدستہ لے کر آ گئے۔ اُس کی بلائیں لیں، قدموں میں بچھ گئے کہ یہ اُندلس سے آیا ہے.. وہ غریب ڈھولچی قدرے نروس ہو گیا کہ یہ لمبا تڑنگا خوش وجاہت شخص جانے کیوں خواہ مخواہ مجھ سے لپٹ لپٹ جاتا ہے۔

تلمیذ حقانی کا آنا جانا ہو گیا۔

وہ واپڈا کے تعلقاتِ عامہ کے شعبے سے وابستہ تھا.. ایک صحافتی پس منظر رکھتا تھا.. سبطِ حسن کے زمانوں میں ''لیل و نہار'' ایسے یکتا اور نظریاتی جریدے میں ''سو وہ بھی ہے آدمی'' ایسے فیچر لکھا کرتا تھا.. اور اردو ادب سے شدید طور پر شغف رکھتا تھا. شُوگر اور دیگر عوارض کے باوجود عمدہ خوراک کا رسیا تھا اور پرہیز نہ کرتا تھا..

ایک روز جب تکلف برطرف ہو چکا تھا اور ایک دوستانہ قربت نے جنم لے لیا تھا، وہ کہنے لگا ''تارڑ صاحب.. یہ جو آپ دن رات اپنا سفرنامہ اس لکیر دار رجسٹر پر لکھتے اس کے صفحے کے صفحے سیاہ کرتے رہتے ہو، مغز ماری کرتے رہتے ہو تو اس کی اشاعت کا بھی کچھ ارادہ ہے کہ نہیں..''

میں نے بلا جھجک اُس کے سامنے اپنا دل کھول دیا ''حقانی صاحب.. میں جوان گرم دوپہروں میں.. ہر اُس گاہک کو کوستا جو میری دوکان میں داخل ہوتا ہے.. سر جھکائے اس ماحول میں پسینے سے تر ایسے کہ رجسٹر کے صفحے بھی میری بھیگی ہوئی اُنگلیوں سے بھیگ جاتے ہیں تو محض اس لیے کہ میں اپنی مسافتوں کی کتھا صرف اپنی تشفی کے لیے رقم کر سکوں.. اگرچہ دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس لکیر دار پونے دو روپے کے اردو بازاری رجسٹر پر جو لکھ رہا ہوں وہ خلق تک پہنچ جائے. لیکن ایک گمنام شخص کی تحریر کی اشاعت کون کرے گا..''

''کوشش تو کرنی چاہیے۔''

''وہ میں نے کر دیکھی.. درجنوں ادبی، نیم ادبی.. یہاں تک کہ فلمی رسائل کو بھی درخواستیں روانہ کیں کہ حضور اس بندۂ ناچیز نے ایک سفرنامہ تحریر کیا ہے اور یقین کیجیے کمال کا ہے.. اگر آپ شائع فرمائیں تو یہ پُر تقصیر از حد ممنون ہوگا۔ حرام ہے کسی ایک نے بھی میری درخواست کی رسید بھی دی ہے تو میں نے طے کر لیا ہے کہ یہ سفرنامہ تحریر کر کے میں خود ہی اسے پڑھتا رہوں گا اور اپنا رانجھا ذاتی طور پر راضی کرتا رہوں گا.. اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔''

تلمیذ نے اپنے ہونٹوں پر ہتھیلی جما کر ایک خفیف سا کھنگورا مارا.. ''ویسے میری نظر میں ایک بُوٹے سے قد کا، قدرے گول مٹول.. شُوگر کا مریض ہونے کے باوجود روسٹ شدہ بکرے کی رانوں کا شوقین.. اگرچہ آج تک اُس نے بندوق نامی کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن پاکستان بھر میں شکاریات کا سب سے بڑا مصنف ایک اردو سپیکنگ رانجھا ہے جو شاید آپ کے سفرناموں کو شائع کرنے پر راضی ہو جائے..''

شاہراہ فاطمہ جناح جو بھلے وقتوں میں کوئنز روڈ ہوا کرتی تھی، وہاں نوائے وقت بلڈنگ کی تیسری منزل پر واقع ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے دفتر میں ایک مختصر کیبن میں قید اور فروکش مقبول جہانگیر سر جھکائے کچھ لکھتا چلا جا رہا تھا اور سموسے کھائے چلا جا رہا تھا.. اسے دیکھ کر مجھے از حد مایوسی ہوئی۔ وہ ایک مختصر قامت کا گول مٹول سا بچہ تھا۔ شکاریات کے موضوع پر لکھنے والوں میں سے وہ سب سے قد آور تھا.. اُس کے انٹرویوز اور جادوئی نثر اور مشہور شخصیتوں کے خاکوں کی بڑی دھوم تھی.. بلکہ بہت دنوں بعد جب تلمیذ کے توسط سے اس گول مٹول آدمی سے میری قربت ہوئی تو انہی دنوں اُس کے دفتر میں حفیظ جالندھری سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور جب حفیظ صاحب نے اپنی بوڑھی اور گھگھیائی ہوئی آواز میں ملکہ پکھراج

کو مطعون کرتے ہوئے کہ وہ کیا جانے کہ راگ کیا ہے ''ابھی تو میں جوان ہوں'' گانا شروع کیا تو یقین کیجیے کوئنز روڈ پر جو چند شجر تھے اور اُن میں جو چند پرندے تھے، وہ تاب نہ لا سکے اور پھڑ پھڑاتے ہوئے اُن شجروں سے گر کر جاں بحق ہو گئے..

تلمیذ حقانی نے ایک مناسب توصیفی تعارف کروایا.. میں نے مؤدب ہو کر اپنے سفرنامے کا ایک باب پیش کیا، اردو سپیکنگ رانجھے نے اُس پر صرف ایک نظر ڈالی اور کہا ''چھپ جائے گا.. اب فرمائیے کہ آپ کے لیے بھنا ہوا گوشت منگوایا جائے یا نیلے گنبد کے مُرغ چنے..''

میرا سفرنامہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں ''جائیونہ بدلیس'' کے عنوان سے قسط وار چھپنے لگا..

''جائیونہ بدلیس'' مقبول کی قبولیت کے باعث خاصا مقبول ہوا اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے اشاعتی ادارے ''پیراڈائز سبکرپشن ایجنسی'' نے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی.. بلکہ مناسب رائلٹی کی پیشکش بھی کی جو کہ اُن زمانوں میں ایک غیر معروف مصنف کے لیے ایک انہونی سی بات تھی.. سفرنامے کا عنوان ''جائیونہ بدلیس''، فلمی قرار دیا گیا اور تلمیذ حقانی نے اقبال کے مصرعے ''نکلے تری تلاش میں قافلۂ ہائے رنگ و بو'' میں سے قافلۂ ہائے رنگ و بُو کو تو رخصت کر دیا اور ''نکلے تری تلاش میں'' کو رکھ لیا.. شفیق الرحمٰن صاحب کے مشورے کے بعد یہی عنوان طے پا گیا..

اور ہاں جب سرورق کا معاملہ زیرِ بحث آیا تو مقبول جہانگیر اُس لمحے میری دوکان پر براجمان چائے کی چسکیاں لگا رہا تھا اور اُس کی نظر سڑک کے پار ایک قصائی کی دوکان کے باہر کنڈوں سے لٹکتے بکروں پر تھی.. اور ہٹتی نہ تھی ''تارڑ صاحب یہ جو ان میں سے تیسرا بکرا ہے اگر اس کی ران حاصل کر کے اُسے خوب بھون کر کھایا جائے تو زندگی کیسی حسین ہو جائے۔''

''نہیں مقبول.. آپ کو شُوگر کا عارضہ ہے اور آپ کے لیے بُھنا ہوا گوشت زہر ہے۔''

لیکن مقبول اصرار کرتا رہا اور پھر کہنے لگا ''اگر آپ میرے لیے بکرے کی یہ ران حاصل کر لیں تو آپ کے سفرنامے کا سرورق مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی بنائیں گے.. کہیے منظور..''

میں نے اپنے ملازم بابا نذیر کو سامنے بھیجا اور وہ اُس ران کا گوشت بنوا لایا.. اور ہاں میں بہت مُصر ہوا لیکن قیمت مقبول نے ادا کی..

''اچھا تو اب فرمائیے جب کہ آپ بکرے کی ایک ران حاصل کر چکے ہیں تو اس کے نتیجے میں چغتائی صاحب میرے سفرنامے کا سرورق کیسے بنائیں گے.. میں نے تو آج تک اُن کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور ظاہر ہے وہ تو میرے وجود سے بھی آگاہ نہیں..''

''یہ میری ذمہ داری ہے..'' یہ کہہ کر مقبول نے وہ ران ایک مگدر کی مانند کاندھے پر رکھی اور چلا گیا.. چنانچہ ''نکلے تری تلاش میں'' کا اولین سرورق چغتائی صاحب کا ایک شاہکار ہے جو تلمیذ کے راستے مقبول کی عنائت سے مجھے نصیب ہوا..

مقبول کا خلوص اور بھولپن ہر شخص کو جیت لیتا تھا اور اردو زبان پر اُسے جو عبور حاصل تھا اور اُس کے اندر جو کشش

اور سحر بھر دینے پر وہ قادر تھا ایسا جوہر میں نے بہت کم لوگوں میں پایا ہے بلکہ جس نوعیت کے خاکے وہ لکھتا تھا اور جن زمانوں کے قصے وہ سناتا تھا انہیں پڑھ کر یہ تاثر ابھرتا تھا کہ وہ ایک نہایت قدیم اور بوسیدہ روح ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ اگر ایک روح کے پاؤں ہوتے ہیں تو.. اس لیے اُسے دیکھ کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی تھی کہ وہ تو ہم سے بھی کمسن نظر دکھتا تھا.. ایک بار وہ مجھے اُن زمانوں کے ناول نگار ایم اسلم کے ہاں اُن کی رہائش گاہ بارود خانے میں لے گیا۔ ایم اسلم نے سینکڑوں ناول لکھے.. وہ جیسے بھی تھے بہر طور انہوں نے اپنے تئیں نہایت شاندار لکھے.. اور میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص ہے جو مقبول جہانگیر کی آمد پر بے حد خوش ہے اور وہ ہماری مدارات کرتا ہے.. کمرے کے کونے میں ایک گراموفون رکھا ہے اور اُس پر ایک ریکارڈ ساکت ہے.. ایم اسلم اپنے پسندیدہ ریکارڈ سنتے ہوئے اپنے ناولوں کے پلاٹ تیار کرتے تھے.. دیوار کے ایک کیل سے ایک چھوٹا سا بستہ لٹک رہا ہے.. یہ بستہ اُس بچے کا تھا جو شاید ایم اسلم نے گود میں لے رکھا تھا اور ایک روز وہ بچہ سکول گیا اور پھر کبھی نہ لوٹا.. مقبول نے بتایا کہ ایم اسلم اس بستے کو دیکھ کر روتے رہتے ہیں، اُس ملاقات کے چند روز بعد اُن کا انتقال ہو گیا..

"نکلے تری تلاش میں" کی اشاعت نے مجھے یکدم گمنامی کے اندھیروں میں سے نکال کر ادبی دنیا کی شہرت کی چکا چوند میں لا کھڑا کیا.. اور تلمیذ مجھ سے کہیں بڑھ کر اس کامیابی پر پُرفخر ہوتا تھا.. خاص طور پر جب اس کا ایک باب ایم اے یونیورسٹی کے اردو کے نصاب میں شامل کر لیا گیا..

اگر تلمیذ اور مقبول نہ ہوتے تو میں آج ایک گمنام ستر برس کا بوڑھا ہوتا جس کے تحریر کردہ سفرنامے جن لکیردار کاغذوں والے رجسٹروں پر لکھے گئے تھے وہ کب کے بھربھرے ہو کر خاک میں خاک ہو چکے ہوتے..

اور پھر تلمیذ اپنی زندگی کے واحد عشق، اُندلس سے ملاقات کے لیے گیا..

اُس نے صادقین کی منت سماجت کر کے ایک کھال پر "مسجد قرطبہ" کے چند شعروں کی خطاطی کروائی.. اور وہ ایک ایسا شاہکار تھا کہ اگر میں ہوتا تو مکمل طور پر بے ایمان ہو کر اُسے گول کر جاتا لیکن تلمیذ قرطبہ پہنچا اور شہر کے میئر کو چمڑے پر رقم وہ خطاطی اہل پاکستان کی جانب سے پیش کر دی۔ تلمیذ حقانی کی جانب سے پیش کردہ صادقین کی یہ خطاطی قرطبہ کے ٹاؤن ہال میں آج بھی آویزاں ہو گی لیکن اُسے دیکھنے والے صرف صادقین کے کمال فن کے معترف ہوں گے اور تلمیذ کو نہیں جانتے ہوں گے..

اُندلس سے واپسی پر اُس نے مجھے اُس سرزمین کے قصے سنائے.. داستانیں بیان کیں.. یہاں تک کہ وہ خصوصی طور پر "کبالا روخو" نامی قرطبن ریستوران میں بھی گیا جہاں میں نے لبنانی نائلہ سعد کے ساتھ ایک مہک آور شب، شانگریا کے سرخ مشروب کو حلق میں سے اتارتے ہوئے گزاری تھی اور وہ ثبوت کے طور پر "کبالا روخو" کی ایک چھوٹی سی سووینئر صراحی بھی میرے لیے لایا تھا.. جو ابھی تک میری سٹڈی میں محفوظ ہے..

ایک روز میں اُس کے اُندلسی قصے کہانیوں سے عاجز آ گیا اور میں نے کہا "تلمیذ.. جو کچھ تم سناتے ہو، جو کہانیاں تم بیان کرتے ہو تو خدا کے لیے انہیں ایک سفید کاغذ پر بھی تحریر کر دو.."

چنانچہ اُس نے میرے بار بار اصرار کرنے پر اُندلس کے سفر کے بارے میں ایک باب لکھ دیا، مجھے سنایا تو میں بتا

نہیں سکتا کہ اُس میں کتنا عشق اور کتنی ادبی مہارت تھی.. وہ اُندلس کے بارے میں ایک ایسا صحیفہ تھا جو لگتا تھا کہ آسمان سے اترا تھا.. اس ایک باب کے بعد وہ دوبارہ نہ کھلا، مقفل ہو گیا۔ میں جب کبھی ناراض ہوتا کہ تلمیذ اس سفرنامے کو مکمل کیوں نہیں کرتے تو وہ ہمیشہ اور یہ ایک بہانہ تھا کہتا تھا کہ آپ کے "اُندلس میں اجنبی" کے بعد گنجائش نہیں رہی ہے اور میں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اگر تلمیذ اپنے اُندلس کے سفرنامے کو مکمل کر لیتا تو میرا "اُندلس میں اجنبی" اُس کے سامنے ہیچ ہوتا.. گہنا جاتا... اُس میں ایک خاص قابلیت اور بے گانگی تھی.. وہ ٹوٹ کر محبت تو کر سکتا تھا لیکن ایک میز پر بیٹھ کر پہروں مشقت نہیں کر سکتا تھا.. اور بڑا نثری ادب ہے کیا؟ دس فیصد تخلیقی صلاحیت اور نوے فیصد جبری مشقت..

مجھے گزشتہ حیات میں خالص پائے کے سونے کے بنے ہوئے صرف تین دوست نصیب ہوئے ہیں، خاور زمان۔ سنگِ میل کے نیاز احمد اور تلمیذ حقانی.. ان تینوں کی محبت اور بے وجہ خلوص نے مجھ کھوٹے کو ایسا کھرا کیا کہ میرا سکہ ہر سو کھنکنے لگا.. اگر یہ نہ ہوتے تو آج میں جو ہوں، یہ نہ ہوتا.. تلمیذ اگرچہ بہت یار باش تھا لیکن اُس کے دوستوں کی تعداد بے حد مختصر تھی.. مقبول جہانگیر.. امجد خان، رفیق ڈوگر، گوندی اور بشیر سلمی.. اور یہ بشیر سلمی سال کے بارہ مہینے اپنے کوٹ کے کالر پر یا قمیض کے کاج میں ایک سرخ گلاب سجائے رکھتے..

تلمیذ حقانی نے مجھ پر کوئی ایک وار نہ کیا تھا.. اُس نے... اس لیے بھی کہ اُس کا ایک ہی بیٹا تھا اور وہ ایک بیٹی کی کمی شدت سے محسوس کرتا تھا میری عینی کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا..

اب یہ جو عینی ہے اسے ایک بیٹی بن جانے پر کمال کا ملکہ حاصل ہے.. وہ نہ صرف خاور زمان کی اور تلمیذ حقانی کی بلکہ شفیق الرحمٰن کی بھی ایک ڈکلیئر شدہ بیٹی تھی.. اور یہ تینوں اُس پر بری طرح نچھاور ہوتے رہے.. کہ ان تینوں کی اپنی کوئی بیٹی نہ تھی..

اگر خاور زمان ایک مدت کے بعد آسٹریلیا میں پاکستانی سفیر ہونے کے بعد میرے گھر میں داخل ہو رہا ہے تو اُس کے ہاتھوں میں عینی کے لیے تحفے ہیں..

عینی جب اپنے میرٹ پر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل ہوتی ہے تو مجھ سے کہیں زیادہ پُرفخر شفیق الرحمٰن ہوتے ہیں کہ وہ بھی اسی کالج کے طالب علم رہے تھے.. وہ عینی کو اپنے صندوق میں سنبھالے ہوئے وہ نوٹس اور کتابیں بھیجتے ہیں جو اُن کے زمانۂ طالب علمی کی یادگاریں ہیں اور وہ اُسے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ بیٹی تم نہیں جانتیں لیکن میں نے اپنی پہلی کتاب "کرنیں" کنگ ایڈورڈز کالج کے زمانوں میں لکھی تھی اور وہ ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو میں یہی خواہش کرتا کہ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل ہو اور عینی نے میری تمنا کو پورا کر دیا.. اور تلمیذ حقانی.. اگر وہ حیدر آباد سندھ سے لوٹ رہا ہے تو اُس کے ہاتھوں میں رنگین چوڑیوں کے ڈبے ہیں۔ اگر سری لنکا سے واپس آ رہا ہے تو صرف عینی کے لیے اُن خطوں کے ہار سنگھار اور کنگن لاتا ہے..

اور جب وہ کنیئرڈ کالج میں زیر تعلیم تھی تو تلمیذ کہتا "عینی.. اگر تم نے ایف ایس سی میں اتنے نمبر حاصل کر لیے کہ تم کسی بھی میڈیکل کالج میں داخل ہو جاؤ.. اگرچہ میں پسند کروں گا کہ تم کے ای میں داخل ہو جاؤ تو تمہارا پہلا سفید کوٹ اور پہلا سٹیتھوسکوپ میرے ذمے ہے.. تم نے نہیں خریدنا.."

آج بھی..زمانے گزر چکے..جب عینی مجھے امریکہ سے فون کرتی ہے تو ہمیشہ نہیں، کبھی کبھار پوچھتی ہے کہ ابو، تلمیذ انکل کا کیا حال ہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور پھر وہ ایک بھرائی ہوئی آواز میں کہتی ہے...ابو میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں ہیں پھر بھی جی چاہتا ہے کہ اُن کا حال پوچھوں...میں لونگ آئی لینڈ کے "سٹونی بُرک ہوسپٹل" میں ریذیڈنسی کر رہی ہوں...ایک سفید کوٹ میں ہوں..گلے میں ایک سٹیتھوسکوپ لٹکتی ہے لیکن ابو.." اور پھر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی..

مجھے اُن تینوں سے بہت حسد ہوتا کہ بیٹی میری ہے اور یہ تینوں اُسے مجھ سے چھین کر لے گئے ہیں..

تلمیذ حقانی کی داستان اتنی طویل ہو سکتی ہے کہ اُس پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے..میں اسے مختصر کرتا ہوں..

تلمیذ کا اکلوتا بیٹا اویس، کینیڈا میں مقیم اپنے ماموں کی بیٹی سے بیاہا گیا اور وہ تلمیذ کو بھی جو اس دوران واپڈا کے ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی حیثیت سے ریٹائر ہو چکا تھا..بصد اصرار اپنے ساتھ لے گیا..اگرچہ وہ جانا نہ چاہتا تھا..اویس ٹورنٹو میں ایک بڑے بینک میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ اُس کے ماں باپ اُس کے ہمراہ رہیں..تلمیذ ٹورنٹو میں شدید تنہائی کا شکار ہو گیا، وہ اپنے دوستوں اور لاہور کی یاد میں گُھلتا رہتا..اُسے خبر ملتی کہ فلاں صاحب لاہور کے ہیں تو فاصلے طے کرتا اُن کے پاس جا پہنچتا اور کہتا کہ پلیز آپ مجھ سے لاہور کی باتیں کریں..

وہ عینی کو بھی جو کہ فلوریڈا میں تھی باقاعدگی سے فون کرتا رہتا..اور عینی مجھے رپورٹ دیتی کہ ابو تلمیذ انکل کینیڈا میں بالکل مس فٹ ہیں اور اُن کی صحت بھی گرتی جا رہی ہے..میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے پاس آ کر کچھ دن گزاریں لیکن وہ نہیں آتے، بہت بجھے بجھے سے ہیں..وہ اُس کے لیے فکرمند ہوتی رہتی..

بالآخر اویس نے جس کی رگوں میں اپنے باپ کا بے غرض اور محبت سے سرشار خون دوڑ رہا تھا، یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بینک کی شاندار ملازمت ترک کر کے اپنے والد کو اُس کی خواہش کے مطابق پاکستان لے جائے گا..بھلے وہاں اُسے کوئی کام کی نوکری ملتی ہے یا نہیں..اور اُس کی بیوی اگرچہ کینیڈا میں پلی بڑھی تھی لیکن وہ بھی کچھ معترض نہ ہوئی اور اویس کی خاطر اور اپنے سسر کے لیے پاکستان میں ایک مشکل حیات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوگئی..

ٹورنٹو سے پرواز کرنے والی فلائٹ شاید ایروفلوٹ کی تھی جس نے ماسکو کے راستے پاکستان پہنچنا تھا..

ابھی فلائٹ اپنی مکمل اڑان میں نہ آئی تھی کہ یکدم تلمیذ کے سانسوں میں رکاوٹ آنے لگی..وہ شکایت کرنے والوں میں سے نہیں تھا، سہہ جانے والوں میں سے تھا لیکن اویس نے محسوس کیا کہ اُس کی حالت بگڑتی جاتی ہے..ایک ہم سفر ڈاکٹر نے اُس کا چیک اپ کیا اور کہا کہ انہیں فوری طبّی امداد کی ضرورت ہے..یہ شاید ماسکو تک کا سفر سہار نہ سکیں..اور اُن لمحوں میں یہ فلائٹ الاسکا کے ویرانوں پر سے گزر رہی تھی۔

اگرچہ یہ شیڈول میں نہ تھا لیکن روسی پائلٹ نے ایک پاکستانی مسافر کی جان بچانے کی خاطر جیٹ ہوائی جہاز اینکر ایج میں اُتار لیا..ایئرپورٹ پر طبّی عملہ اور ایک ایمبولینس منتظر تھی، اُسے اینکر ایج کے اسی "الاسکا نیٹو ہوسپٹل" میں لایا گیا..فوری طبّی امداد سے اُس کی حالت سنبھلنے لگی لیکن ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ اُسے تب تک سفر کی اجازت نہیں دے سکتے جب تک اُس کی صحت اس قابل نہیں ہو جاتی..

جب کبھی آپ کسی غیر ملک سے اپنے وطن کو لوٹتے ہیں تو آپ کی جیب میں کیش رقم کچھ کم ہی ہوتی ہے کہ گھر

ہی تو جانا ہے، کونسا راستے میں کہیں ٹھہرنا ہے..اور اگر آپ کو مجبوراً ٹھہرنا پڑ جائے اور وہ بھی اینکر ایج الاسکا میں جو بقیہ امریکہ سے کہیں مہنگا شہر ہے تو آپ کے اندر تشویش اور سراسیمگی تو ہوگی لیکن..بقول تلمیذ وہاں انسان نہیں تھے فرشتے تھے..ڈاکٹروں نے کہا کہ مسٹر حقانی آپ اخراجات کو بھول جائیں..سب بندوبست ہو جائیں گے صرف صحت یاب ہو جائیں..ایک سٹاف نرس نے اپنا کمرہ خالی کر کے تلمیذ کے بال بچوں کے سپرد کر دیا کہ میرا کیا ہے یہاں سے صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر میری بہن رہتی ہے، میں اُس کے ہاں شفٹ کر جاتی ہوں.. مجھے روزانہ آنے جانے میں کچھ دشواری نہ ہوگی..ہسپتال کی کینٹین سے کھانا آنے لگا..اور جب وہ سفر کے قابل ٹھہرایا گیا تو اُسے رخصت کرنے کے لیے ہسپتال کا کل عملہ اینکر ایج ایئرپورٹ پر موجود تھا اور کوئی ایک فرد ایسا نہ تھا جس کے ہاتھوں میں اُس کے لیے پھول یا کوئی تحفہ نہ ہو..یاد رہے کہ یہ سب امریکی تھے جنہیں ہم گالیاں دیتے نہیں تھکتے۔

میں اُسے ملنے کے لیے ماڈل ٹاؤن میں واقع اُس کے ایک قریبی عزیز کے گھر گیا۔وہ بہت لاغر ہو چکا تھا لیکن اُس کی شرمندہ سی دوستانہ مسکراہٹ اُسی طور توانا تھی..جانے اُسے کیسے کیسے عوارض لاحق ہو گئے تھے۔اُس کے بدن سے کوئی بھی ملبوس چھوتا تو وہ اذیت سے کراہ اٹھتا...ہم بیتے دنوں کی یادوں میں گُم ہو گئے..مقبول جہانگیر کو بہت یاد کیا جو یونہی بلا اطلاع چلتے پھرتے چلا گیا تھا..میں نے محسوس کیا کہ وہ باتیں کرتا یکدم کچھ بہک سا جاتا ہے..چوکنا ہو کر کہتا ہے..

"مستنصر صاحب.." اور اس نے اتنی طویل قربت کے باوجود کبھی بھی مجھے "صاحب" کے لاحقے کے بغیر صرف مستنصر نہ کہا اگرچہ میں اُس کا جونیئر ہونے کے باوجود اُسے صرف "تلمیذ" کہتا تھا "اس کمرے کی کھڑکی کے باہر کچھ لوگ ہیں جو ہماری باتیں سن رہے ہیں۔ذرا آہستہ بات کریں، مخدوش سے لوگ ہیں۔"

"کونسی کھڑکی کے باہر.."

"یہی شیشے کی بڑی کھڑکی جو آپ کے عقب میں ہے..وہ باہر ٹہل رہے ہیں..میرا خیال ہے تین لوگ ہیں، ہم پر نظر رکھتے ہیں، آہستہ بات کریں۔"

اور میرے عقب میں ایک دیوار تھی..کھڑکی تو کیا ایک روزن بھی نہ تھا..

یہ علامتیں اچھی نہ تھیں..

میرے اباجی بھی آخری دنوں میں انہی وسوسوں کا شکار ہو گئے تھے کہ رات کے وقت میرے کمرے میں کچھ لوگ گھومتے پھرتے ہیں، مجھے ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ مستنصر تم ان کا کچھ کرو..اور جب ہم اُنہیں یقین دلاتے کہ اباجی تمام دروازے مقفل ہوتے ہیں تو بھلا کوئی بھی آپ کے کمرے میں کیسے آ سکتا ہے تو وہ ناراض ہو جاتے کہ تم سمجھتے ہو کہ میں بہک گیا ہوں..جھوٹ بول رہا ہوں..اور ہم چپ ہو جاتے۔

وہ اینکر ایج کا تذکرہ کرتے ہوئے نمناک ہو جاتا...."وہ پائلٹ مستنصر صاحب کیسا عظیم انسان تھا جس نے اپنی فلائٹ کا رخ میرے لیے موڑ دیا..اور اینکر ایج کے ہسپتال کا عملہ مجھ ایسے گمنام اجنبی کے لیے کیسا مسیحا ثابت ہوا۔وہ الاسکن معالج اب بھی اویس کے ساتھ رابطہ رکھے ہوئے ہیں اور میری علالت کی تفصیل پوچھتے دوائیاں تجویز کرتے رہتے ہیں..وہ سب مجھے اینکر ایج کے ایئرپورٹ پر رخصت کرنے کے لیے آئے..یہ جو میرے پاس المونیم کا نہایت ہلکے وزن کا

واکر ہے جس کے سہارے میں واش روم تک چلا جاتا ہوں یہ مجھے ایک نرس نے تحفے میں دیا تھا. کیا ایسے لوگ جہنم میں جا سکتے ہیں مستنصر صاحب.." وہ اپنے محسنوں کو یاد کرتے رونے لگتا اور چپ نہ ہوتا..

تلمیذ کا آبائی گھر.. ایک وسیع صحن والا، جس کی چھوٹی اینٹوں سے تعمیر کردہ دیواریں بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں باغبانپورہ میں تھا جہاں میں اور میمونہ اپنے بچوں سمیت جایا کرتے تھے، اُسی گھر کی قربت میں ایک قبرستان تھا جس کی دھول اور ویران مٹی میں ہم نے اُسے دفن کیا..

ایک سونے کا شخص جو خاک ہوا.. مجھے یقین ہے کہ جس مٹی میں وہ خاک ہوا اُس کا ہر ذرہ سونے کی مانند دمکتا ہوگا.. اور اُس دمک میں جنت کے کیسے کیسے شاندار محل اجاگر ہوتے خواہش کرتے ہوں گے کہ کاش کہ یہ شخص اپنے قیام کے لیے ہمیں پسند کرلے..

اینکر ایج، الاسکا میں قیام کا غالباً یہ تیسرا دن تھا۔

اور ایک ہسپتال.. "الاسکا نیٹو ہوسپٹل"

؎ غالب ندیم دوست سے آتی ہے بُوئے دوست

اُس کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے ایک خوشبو آئی.. ندیم دوست سے بُوئے دوست آئی.. کہ اسی ہسپتال میں ایک ایسا غزال رہا تھا جس کا بدن محبت کے پاسے سونے سے بنا ہوا تھا اور اُس کا دل صرف اس جہان میں نہیں کل جہانوں میں دھڑکتا تھا. صرف میرے لیے نہیں میری بیٹی عینی کے لیے بھی دھڑکتا تھا اور وہ معاشرے کے تاریک فریب میں دمکتا سنہری غزال باغبانپورہ کے ایک قبرستان میں دفن اب بھی لَو دیتا ہے..

○●○●○

"اِک شبِ گلاب، الاسکا کے سمندروں پر"

"کیا واقعی وہ سونے سے بنا ہوا ایک شخص تھا؟"

"سونا تو ایک حقیر دھات ہے کونج.. وہ جانے کس سے بنا ہوا ایک شخص تھا.. اگر وہ نہ ہوتا تو آج میں الاسکا میں نہ ہوتا، تمہارے ساتھ نہ ہوتا.. گمنامی کے اندھیروں میں پڑا ایک رائیگاں شخص ہوتا۔ ویسے پوری وادیٔ یُوکان میں اتنا سونا نہیں ہے جتنے سونے سے وہ بنا ہوا تھا۔" کونج ان طویل مسافتوں کے دوران میری مزاج شناس ہو چکی تھی، میرے دل کی تختی پر لکھی اب بجھتی ہوئی عبارتوں کی تلمیذ اداسی کو پڑھ چکی تھی۔

"اینکر ایج میں یہ ہماری آخری شب ہے۔ کل سویرے ہم نے یہاں سے رخصت ہو جانا ہے اور سیوارڈ کے قصبے کا رُخ کرنا ہے جہاں گلف آف الاسکا کے سمندروں میں گرتے مسمار ہوتے نیلی برفوں والے گلیشیئر، وہیل مچھلیوں کے اژدھام اور سمندری پرندے ہمارے منتظر ہیں تو آج کی شب ہم اینکر ایج کے سب سے مہنگے ریستوران میں ڈنر کرتے ہیں تاکہ تمہاری اداسی اُس سونے کے شخص کے لیے کچھ تو کم ہو.."

اُداسی اگر ایک بار اور وہ بھی تلمیذ کے لیے اُتر آئے تو جنگل کی آگ کی مانند پھیلتی جاتی ہے، نہ کم ہوتی ہے، نہ بجھتی ہے۔

اُس ریستوران کے باہر فٹ پاتھ پر جو کھمبے تھے، اُن پر پھولوں کے انبار بوجھ ہوتے تھے.. اور اُن کی سرخی ریستوران کے اندر تک آتی ہمارے چہروں کو بھی گل و گلزار کرتی تھی۔ ڈنر سے فارغ ہو کر ہم اس ریستوران سے باہر آئے تو اینکر ایج خاموشی کی ٹکسال میں ڈھلا ایک خاموش سکہ تھا اور ہم حسب عادت گلف آف الاسکا کی ایک سمندری خلیج کے کناروں پر آ بیٹھے..

رات کے دس بج چکے تھے۔

اور شمال کی انوکھی شفق نہ صرف گُلوں میں رنگ بھرتی تھی بلکہ ہمارے سامنے جو سمندر بہت خاموش بہت چُپ لیٹا تھا، اُس میں اُتر کر اُس کی سیاہی میں اپنی گلاب رنگت گھولتی تھی، اسی سمندر میں ہزاروں سالمن مچھلیاں شب بھر کے لیے آرام کرتی تھیں کہ کل صبح سویرے یہاں ایسے سیاح آئیں گے جو اینکر ایج آتے ہی اس لیے ہیں کہ سالمن شکار کریں.. بلکہ ایک فائیو سٹار ہوٹل کے اشتہار میں درج تھا کہ آپ ہمارے ہوٹل کے صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر سمندر

میں کنڈی ڈال کر کسی بھاری اور بے وقوف مچھلی کو پھانس سکتے ہیں۔ اُن سمندروں کو تکتے ہوئے جن میں شفق گھل رہی تھی اور مچھلیاں آرام کر رہی تھیں، ہم اس یقین کے اسیر ہو گئے کہ واقعی یہ دنیا کا آخری سرا ہے۔ ان سمندروں کے پار اور کوئی جہان نہیں، کوئی بستی کوئی نفس نہیں اور اگر ہم ذرا سے آگے ہوں گے تو اس آخری سرے سے گر کر فنا کی تاریک گہرائیوں میں گر جائیں گے۔

اور میرے برابر میں اس شب گلاب میں بیٹھی ہوئی کونج تھی، ایک پرندہ تھا یا کیا تھا.. یا شمالی روشنیوں کے کرشمے سے وجود میں آنے والا ایک ایسا بدن تھا جس کی مہک کو جب وہ گرمی پہ آتا تھا، میں پہچانتا تھا.. وہ مجھ سے جُڑی بیٹھی تھی اور ایک ہلکی حدّت جیسے آپ ایک پرندے کو مٹھی میں لیتے ہو تو تمہاری ہتھیلی پر دھک دھک دستک دیتی ہے ایسی حدّت میرے بدن میں اُس کے جُڑنے سے سرایت کر رہی تھی..

اور پھر یکدم وہ شفق جو ہولے ہولے مدھم پڑتی جاتی تھی، سمندر میں گھلتی یکدم ڈوب گئی.. ہم دونوں کے چہرے جو ابھی اُس کی رنگینیوں سے روشن تھے، وہ بھی ڈوب گئے تھے، تاریک ہو گئے تھے....

جانے کونسی سائنس ہے جس کی رُو سے اگر آپ ایک مقام پر تادیر قائم رہیں اور پھر چلے جائیں تو اُس مقام پر آپ کا ایک شائبہ ابد تک موجود رہتا ہے جس کی شناخت ہو سکتی ہے تو شاید ہم بھی بقاء کی ایک سایہ تصویر ہو جائیں تو اگر آج سے ہزار برس بعد یہ دنیا رہی، اینکراج سمندروں کی تہہ میں نہ چلا گیا تو اگر کوئی سیاح ادھر آ نکلا تو وہ ہمارے مبہوت اور حنوط شائبے دیکھ کر کیسی حیرت میں مبتلا ہو جائے گا کہ یہ کون تھے، کب یہاں آئے اور کہاں کے رہنے والے تھے.. ایک عمر رسیدہ شخص ہے جس کی آنکھوں میں شفق کی سرخی تصویر ہے اور ایک پرندہ ہے جو اُس کے پہلو سے لگا بیٹھا ہے.. اُس کی سیاہ سامری آنکھیں اُس شخص کو ابھی تک اشتیاق سے تکتی جاتی ہیں جیسے وہ اُس کے عشق میں مبتلا ہے پر اظہار نہیں کرتا..

○●○●○

"سفید بیلوگا وہیل سمندروں میں سے ظاہر، پھر روپوش"

الاسکا کے آسمان کبھی ایسے تو نہ تھے..

بے رنگ، بجھے ہوئے، کچھ سرمئی سے لیکن گھلے ہوئے بادلوں میں ڈھکے ہوئے اور بادل بھی ایسے جن کی کوئی بناوٹ، کوئی سجاوٹ نہ تھی جیسے ہمارے ہاں کے ساون کے بادلوں کی ہوتی ہے، مست سیاہ ہاتھیوں کی مانند اُمڈتے چلے آتے ہیں، گھٹا گھنگھور گھنگھور ہوتی ہے اور مور مچائے شور.. اور اُن بے رنگ بجھے ہوئے بادلوں میں سے ٹپ ٹپ بوندیں اُترتی تھیں.. ہمیں بھگوتی تھیں کہ ہم جیپ سے باہر آ کر ہمارے سامنے جو سرمئی پانی ایک وسیع جھیل کی مانند پھیلتے تھے، اُس پر اپنی آنکھیں سفر میں کرتے تھے وہ کچھ دیکھنے کے لیے.. جو دکھائی نہیں دے رہا تھا.. ہاں اُن پانیوں میں کہیں کہیں سفید بہت گوری سفید چٹانوں کے ابھار کبھی سطح میں سے ابھرتے تھے اور فوراً ہی اُن میں ڈوب جاتے تھے.. ایسے لگتا تھا جیسے سمندروں میں سفید رنگ کے اونٹ یوں ڈوبے ہوئے ہیں کہ صرف اُن کے کوہان ظاہر ہوتے ہیں اور پھر روپوش ہو جاتے ہیں..

وہ چھوٹے چھوٹے برفانی تودے بھی ہو سکتے تھے جیسے جھیل سرال میں تھے، وہ تودے کبھی ابھرتے نظر آتے تھے اور اگلے پل ڈوب جاتے تھے۔

اور یہ سفید اونٹوں کے کوہان، اُبھرتے ڈوبتے برفانی تودے.. میرے ڈیجیٹل کیمرے کی زد میں نہ آتے تھے اور میں اپنے اشائی پینٹکس کے کیمرے کو یاد کرتا تھا جو نیپال جاتے ہوئے پی آئی اے کے کسی پورٹر نے غائب کر دیا تھا کہ اُس کیمرے کا جب آپ بٹن دباتے تھے تو وہ ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں اُس ایک لمحے کو قید کر لیتا تھا لیکن ہر ڈیجیٹل کیمرے میں ایک اپاہج پن ہے.. وہ اُس لمحے کو فوری طور پر منجمد کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ آپ بٹن دباتے ہیں تو فوراً اُسی سیکنڈ میں تصویر نہیں اُترتی، دو تین سیکنڈ کا وقفہ آتا ہے تب اُترتی ہے.. اور یوں وہ مسکراہٹ جو آپ قید کرنا چاہتے ہیں، شرماہٹ جسے آپ محفوظ کر لینا چاہتے ہیں.. بٹن دباتے ہی تصویر نہیں ہوتی، مسکراہٹ مرجھا جاتی ہے، شرماہٹ کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں جب تصویر اُترتی ہے.. یوں وہ سفید کوہان بھی، برفانی تودے ابھرتے ڈوبتے میرے کیمرے کی زد میں نہ آتے تھے۔ میں اُنہیں ظاہر ہوتے دیکھ کر کیمرے کا بٹن دباتا، کچھ میکانکی چرخ چوں ہوتی اور جتنی دیر میں تصویر کھنچتی وہ روپوش ہو چکے ہوتے اور وہاں محض ایک سپاٹ سمندر ہوتا..

اور میں کیوں ان ابھرتے ڈوبتے کوہانوں کو اپنے کیمرے میں محفوظ کر لینا چاہتا تھا، وہ نہ تو سفید اونٹوں کے

کوہان تھے، نہ برفانی تودے تھے اور نہ ہی سفید رنگ کی چٹانیں، وہ الاسکا کے سرمئی سمندروں میں ابھرتی ڈوبتی درجنوں بیلوگا نسل کی سفید وہیل مچھلیاں تھیں، اگرچہ وہیل مچھلی نہیں ہوتی لیکن صرف وہیل کہہ دینے سے وہ ذہن کے سمندر میں نہیں تیرتی جب تک کہ اُس کے ساتھ مچھلی کا اضافہ نہ کیا جائے۔

سیورڈ... عجیب سا نام ہے.. نام لیتے ہوئے ایک پلید جانور تھوتھنی آگے کر کے اپنی بالشت بھر کی دُم ہلانے لگتا ہے لیکن اسی سیورڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ.. الاسکا کا آغاز ہے۔

ویسے تو الاسکا کی ہر بستی ہر قصبے نے یہی دعویٰ کر رکھا ہے کہ الاسکا ہمیں است ہمیں است.. سیورڈ کے پاس.. اور مجھے اقرار کر لینے دیجیے کہ میں ہمیشہ اس کا نام یاد رکھنے کی خاطر پہلے سؤر کو ذہن میں لاتا ہوں اور اس کے ساتھ ایک "ڈی" کا اضافہ کر دیتا ہوں.. تو اس سیورڈ کے پاس اپنے دعوے کے ثبوت میں واضح شہادتیں موجود ہیں یعنی نیشنل جیوگرافک کی اگر الاسکا کے بارے میں کوئی ڈاکومنٹری ہوگی تو وہ قطبی ریچھوں کے کے بعد سیورڈ کے سمندروں اور جزیروں کی ہوگی.. اس کی ریزریکشن آبنائے سے وہ کشتیاں اور موٹر بوٹس رواں ہوتی ہیں جو آپ کو کھلے سمندروں میں لے جاتی ہیں جہاں آپ کے پہلوئیں سے گزرتے گلیشیئر یکدم مسمار ہونے لگتے ہیں.. آپ کے آس پاس صرف وہیل مچھلیاں ہی نہیں بلکہ متعدد اقسام کے اود بلاؤ، سیل، ڈولفن اور مونچھوں والے آبی جانور ہمہ وقت کودتے رہتے ہیں... قریب سے گزرتے جزیروں پر برفانی بکریاں طالبان کی مانند داڑھیاں بڑھائے چہل قدمی کرتی ہیں، ساحلوں پر ریچھ ٹہلتے نظر آتے ہیں اور پھر وہ نہایت حیرت کا آئینہ پنچھی، پفن نام کا.. جو کسی جاپانی مصور کا خوش رنگ اور دیدہ زیب تصور لگتا ہے، اُڑان سے پہلے ایک منٹ میں تین سو مرتبہ اپنے پَر پھڑ پھڑانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ صرف ہوا میں بلکہ سمندر میں بھی نہایت سہولت سے تیرتا پھرتا ہے۔ اس پفن پرندے کو آپ اپنی کشتی کے پہلو میں سے ابھرتی بلند چٹانوں پر براجمان.. نخرے کرتے دیکھ سکتے ہیں.. اور سیاحوں کو یہ جھانسا بھی دیا جاتا ہے کہ کیا پتہ کوئی ایک پفن پرندہ کشتی کی آہنی ریلنگ پر آ بیٹھے اور اپنی خوشنما چونچ کھول کر آپ سے مخاطب ہو کر کہے.. ہیلو سٹرینجر.. کہاں سے آئے ہو.. یعنی نواں آیاں ایں سوہنیاں..

اینکر اتیج سے سیورڈ جانے والی شاہراہ عجیب سامری سحر مناظر میں سے گزرتی ہے.. بادلوں سے ڈھکے آسمان تلے جو سمندر تھا اُس کے کناروں پر گزرتی جاتی تھی.. ہماری جیپ کی ونڈ شیلڈ پر اُس آسمان میں سے ٹپکتی بوندیں آنسوؤں کی مانند گرتی جاتی تھیں..

وادیٔ یوکان اور الاسکا کے طول وعرض میں، شاہراہوں کے کنارے جہاں کہیں بھی کوئی قابل دید مقام ہو، کوئی برف پوش پہاڑ، جانوروں سے بھرا جنگل، کوئی دریا، کوئی عجوبہ ہو وہاں آپ کی کار یا ویگن کے رُکنے کے لیے کا ایک سنگریزوں بھری پارکنگ لاٹ ہوتی ہے اور ایک بورڈ آویزاں ہوتا ہے جس پر نہایت تفصیل سے اُس مقام کی اہمیت درج ہوتی ہے..

تو اینکر اتیج سے نکلنے کے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد جب کہ ہم سرمئی سمندروں کے پہلو میں سفر کرتے تھے ہمیں ایک ایسا ہی بورڈ نظر آیا اور ہماری چاندی رنگ جیپ بارش میں بھیگتی رُک گئی..

"بیلوگا وہیل کو محفوظ کرنے کے لیے مدد کیجیے"

قانونی طور پر نک ان لیٹ میں بیلوگا وہیل کو شکار کرنا یا اُنہیں چھیڑ چھاڑ کر کے تنگ کرنا ایک جرم ہے.. اگر آپ کسی بھی شخص کو اس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو براہ کرم فوری طور پر فون نمبر فلاں پر اطلاع کیجیے اور آپ ڈھائی ہزار ڈالر کے انعام کے حقدار ٹھہریں گے۔ بیلوگا وہیل دنیا بھر میں ایک عجوبہ ہیں کہ یہ تو نہ نیلی ہوتی ہیں اور نہ ہی سیاہ.. بلکہ سفید ہوتی ہیں.. اگر آپ چاہتے ہیں کہ آج سے سو برس بعد بھی یہ ان سمندروں میں یونہی ابھرتی ڈوبتی رہیں تو ان کی حفاظت کیجیے.. انہیں تنگ نہ کریں.. شکریہ۔ ہاں آپ ان کی تصویریں اتار سکتے ہیں۔

اور مجھے یہاں اپنے سندھ سائیں میں ڈبکیاں لگانے والی اندھی ڈولفن یاد آ گئی جنہیں میں نے اس شیر دریا پر رواں ایک پرانی کشتی کے عرشے پر سے ایک سویر دیکھا تھا۔ اُن کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ تھا کہ ان کے چاہنے والے نہ تھے.. ہاں اُنہیں زندہ پکڑ کر ان سے فعل کرنے والے تھے۔

اور اُس لمحے جب میں بیلوگا وہیل مچھلیوں کے ابھرنے کو اپنے کیمرے میں قید کرنے کی ناکام سعی کرتا تھا، اپنی نابینا ڈولفنوں کو یاد کرتا تھا، جیپ میں افیونی ہو چکی اونگھتی کونج نے مجھے پکارا "اگر تم یونہی ہر مقام پر یونہی ٹھہرے رہے تو ہم پہنچ چکے سیورڈ..... سیورڈ نزدیک ہے پر اتنا بھی نہیں.. 204 کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور بہتر ہے کہ شام سے پہلے پہنچ جائیں۔"

اگرچہ اُس نے کہا تھا کہ تم یونہی رکتے رہے تو پہنچ چکے سیورڈ.. لیکن ہم رُکتے رہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ میں رُکتا رہا... راستے میں ایک جھیل حائل ہوتی گئی اور اس کا نام پورٹیج لیک تھا جو اسی نام کے گلیشیئر کی کوکھ میں سے برآمد ہو کر وسعت اختیار کر لیتی تھی.. کسی کھرے اور شفاف دن میں اُس کے پانی یقیناً نیلگوں ہوں گے، پر وہ بے رنگ تھے آسمان کو ڈھکتے بالوں کی طرح.. ونڈ سکرین پر بے مُہار ہوتے بوندیں سمیٹتے وائپر ہانپنے لگے تھے..

برڈ اور گرڈ وڈ نامی گڑیا گھروندے قصبوں میں سے گزرتے بالآخر اُس آبنائے نے جو ٹرن اگین آرم کہلاتی ہے اور اینکر اتیج سے ہمارے ساتھ ہو لی تھی، ہمیں اپنے پانیوں میں ڈوبتی ابھرتی سفید بیلوگا وہیلوں کا بیلے رقص دکھایا تھا.. تو بالآخر اُس آبنائے کے پانیوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا.. اب ہم کبھی تو کسی ہموار گھاس بھرے میدان میں بچھی شاہراہ کی سیدھی لکیر پر ناک کی سیدھ میں چلے جاتے اور کبھی گھنیرے جنگلوں کے گھنے پن میں داخل ہو کر اُن کا ایک حصہ بن جاتے.. اور کبھی ونڈ سکرین پر سکوت میں بلند ہوتے ایسے پہاڑ عکس ہونے لگتے جن پر لگتا تھا کہ کائی جمی ہوئی ہے.. وہ ایسے تالاب ہیں جن کی سطح سبزے سے ڈھکی ہوئی ہے..

ان پہاڑوں کے دامن میں ایک ایسا ہرا کچور میدان پھیلتا تھا جس کی گھنی گھاس میں پوشیدہ کچھ ناشناسا پرندے ہولے ہولے گوکتے تھے جیسے ہمیں بلاتے ہوں، ہم سے ٹھہرنے کو کہتے ہوں.. عین ممکن ہے کہ وہ ہماری آمد سے پیشتر ایک چپ میں تھے اور جونہی انہیں خبر ہوئی کہ شاہراہ پر جو چاندی رنگ کی جیپ چلی جاتی ہے اُس کے اندر ایک ایسا شخص سفر میں ہے جو فریدالدین عطار کے پرندوں سے اُلفت رکھتا ہے اور اُنہی سے دانش حاصل کرتا ہے تو وہ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے گوکنے لگے ہوں.. اور کیا پتہ وہ بھی عطار کے پرندے ہوں اور سچ کی تلاش میں بھٹکتے یہاں الاسکا تک پہنچ گئے ہوں..

مجھے شائبہ سا ہوا کہ اُس گھنی گھاس کے اندر ایک راج ہنس تیرتا ہے جس کی سفیدی اُس کی ہریاول کے گھونگھٹ میں سے ظاہر ہو کر اپنا روپ دکھلاتی تھی اور پھر اوجھل ہو جاتی تھی.. مجھے شائبہ سا ہوا.. لیکن ایک راج ہنس بھلا گھاس میں کیسے تیر سکتا ہے.. شائبہ ہی ہوگا..

پھر اُسی ونڈ سکرین پر جس میں کائی زدہ پہاڑی عکس ہوتے تھے.. بلند پہاڑوں پر پچھلی شب کی برفباری کی سفیدی جھلملانے لگی..

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اَن دیکھے خطوں کے تصور کی جو تصویر آپ اپنے ذہن پر پینٹ کرتے ہیں وہ اُس کے قابلِ دید مقامات کے سیاحتی پوسٹرز، دستاویزی فلموں، اُس کے موسموں اور اُس خطے کے نام سے تشکیل پاتی ہے.. الاسکا کی تصوراتی تصویر میں یہاں آنے سے پیشتر قطبی ریچھوں اور برفزار ویرانوں کے سوا اور کچھ نہ تھا.. اُس تصویر میں مجال ہے کوئی ہریاول ہو، جل چکے سوختہ جنگلوں کے تاحدِ نظر ٹانڈے ہوں.. کوئی ٹیلر روڈ ہو، آبنائے الاسکا پر غروب کے بعد جو شفق رنگ دکھلاتی تھی اُس کا کوئی رنگ ہو یا کسی گھاس بھرے میدان میں ایک راج ہنس کسی شرمیلی نار کی مانند کبھی مُکھ دکھلاتا ہو اور کبھی روپوش ہو جاتا ہو.. مجھے کبھی کبھار ایک برفانی ریچھ کی شدت سے کمی محسوس ہوتی لیکن اس کے علاوہ جو الاسکا میں دیکھ رہا تھا، اس میں مجھے اسیر کرنے والے ایسے مناظر اور روشنیاں تھیں جنہوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھوں کے راستے دل پر ثبت ہو جانا تھا۔ چنانچہ.. جب ذرا نظر جھکائی تصویرِ یار دیکھ لی..

○●○●○

دسیورڈ کی بھیگتی دل کشی میں.. ایک جزاک اللہ''

شام کا نیلا پن ذرہ ذرہ گھنا ہونے لگا، بوندیں ابھی تک ٹپ ٹپ گرتی تھیں جب ہم ایک شب دیجور ہوتے جنگل کی سیاہی کے پہلو میں سے نکلتے ایک ایسی کوہستانی بستی میں داخل ہوئے جو اُس جنگل کے دامن میں پھیلتی سمندر تک چلی جاتی تھی.. وہ آبنائے الاسکا کے کناروں پر اپنے مختصر پن میں سمٹی ہوئی تھی لیکن اُس کے ساحلوں پر جو بے انت بادبانی کشتیاں، موٹر بوٹس، شاہانہ بجرے اور کروز شپ لنگر انداز تھے اُن کا رقبہ اُس بستی سے بھی بڑا تھا.. یعنی زمین سے کہیں بڑھ کر سمندر آباد تھا.. میں نے کسی بھی سمندر میں اتنی گہما گہمی سوائے مانٹی کارلو کے اور کہیں نہیں دیکھی تھی.. لیکن یہاں مانٹی کارلو کے شفاف، چمکیلے اور گرم موسموں میں نیلاہٹ سے چھلکتے سمندر نہ تھے... یہ الاسکا تھا.. اور یہاں ایک بے رنگ آسمان سے بوندیں مسلسل ٹپکتی جاتی تھیں..

سیورڈ کا قصبہ.. جو الاسکا کا ایک اور دل کہلاتا تھا، یہاں بھی رنگ رنگ کے ڈھلوان چھتوں کے چوبی گڑیا گھر قطار اندر قطار تھے اور جو ایک آدھ بازار تھا اُس کی عمارتیں بھی تقریباً سنگل پسلی کی تھیں یعنی صرف یک منزلہ تھیں تاکہ جو حیرت پس منظر میں ہے وہ ان کے وجود سے روپوش نہ ہو جائے..

لوگ بھی کم کم تھے.. شاید بارش کی وجہ سے..

کوئی رونق میلہ نہ تھا..

اُس بے رونق بازار کے گیلے ہو چکے فٹ پاتھ پر ''بریزٹی ایس سوویئر شاپ'' اور ''اسکیمو کافی'' کے برابر میں ایک شخص تنکوں کے ہیٹ اور ایک برفانی جیکٹ میں ملبوس سر جھکائے ایک بیساکھی کے سہارے ٹھک ٹھک کرتا ہولے ہولے چلتا جا رہا تھا اور احتیاط کرتا تھا کہ کہیں اُس کی بیساکھی گیلے فٹ پاتھ پر پھسل نہ جائے..

ابھی ہمیں اس اجنبی قصبے میں شب بسری کا کوئی ٹھکانہ تلاش کرنا تھا.. اور ہمیشہ تو نہیں اکثر یہ میرا سیاحتی تجربہ ہے کہ جب سرِ شام آپ کسی ایسے گمنام اور دُور افتادہ قصبے میں داخل ہوتے ہیں جس کے نام سے بھی آپ واقف نہیں ہوتے اور نہ ہی کبھی آپ نے اُسے کسی نقشے پر دیکھا ہوتا ہے اور آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ رات تو دربدر ہونے میں گزرے گی.. کوئی چھت نصیب نہ ہوگی تو نصیب کی حسینہ آپ کے پہلو سے آلگتی ہے اور مسکرانے لگتی ہے.. جیسے اُندلس میں ثوریا کی شب میں ہوا تھا، ایک ایسا یوتھ ہوسٹل جو خالی پڑا تھا اور میں اور ٹونی اُس کے غسل خانے کے درجنوں شاور کھول کر نہاتے اور ٹُل کرتے تھے.. یا جھیل لوگانو کے کناروں پر بارش میں بھیگتے ہوئے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے تہہ خانے میں پناہ مل جاتی

ہے تو یہاں بھی سیورڈ میں ہمارے بھاگ جاگے..... کچھ در بدر ہوئے.. کہیں بھی پناہ نصیب نہ ہوئی.. کوئی چھت دستیاب نہ تھی جب ہم سیاحتی کتابچوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے ”مرفی ز..لونگ شور لاج“ کے احاطے میں داخل ہوئے اور اس لاج کے اشتہار میں درج تھا کہ ہمارے ہاں ہر کمرے کی کھڑکی سے ایک ملین ڈالر کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے اور ہمیں اُس ڈھلتی شام میں صرف ایک چھت درکار تھی بھلے اُس کی کھڑکی میں سے دو چار ڈالر کا نظارہ بھی دیکھنے کو نہ ملے.. ہم نہایت قناعت پسند اور صابر اور شاکر مسافر تھے، لالچی نہ تھے..

”مرفی ز..لونگ شور لاج“ کے عقب میں وہی شب دیجور شجروں کے جھنگھٹے امڈتے تھے.. ایسے کہ وہ پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے اتر کر اس لاج کو اپنی لپیٹ میں لے کر اسے بھی اپنے جنگلی وجود کا ایک حصہ بنالیں گے۔ ہر کمرے کے باہر تازہ پھولوں کی ٹوکریاں جھولتی تھیں، دروازے نیلگوں، کھڑکیاں برف سفید اور ستھرائی نفیس ترین..

ہمارے چاندی رنگ کی جیپ کی پشت پر جو نمبر پلیٹ تھی اُس پر 80467 ......البرٹا.....درج تھا۔ اس لاج کی پارکنگ لاٹ میں رُک گئی ہم دونوں کے دل دھڑکتے تھے.. کیا جانئے ہمیں یہاں جگہ ملتی ہے یا نہیں..

”تم ریسپشن آفس کے اندر جا کر پتہ کرو کہ کوئی جگہ مل سکتی ہے یا نہیں.. میرا کیا ہے میں تو ساحل کے ساتھ لنگر انداز کسی بادبانی کشتی کے مستول پر براجمان ہو کر رات گزار لوں گی.. تمہارا کیا ہوگا..“

”وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔“ میں نے نہایت اعتماد سے کہا۔

”کونسا خدا؟“

ظاہر ہے کہ گونج کا کوئی مذہب نہ تھا اور اگر مذہب ہوتا تو اُس کا خدا بھی ایک گونج ہوتا.. ویسے تو ہر مذہب کے پیروکار یہی دعویٰ گہرے تیقن سے کرتے ہیں کہ یہ پرندے بھی ہمارے ہم مذہب ہیں.. حق ہُو کرتے ہیں.. رام رام سیتا رام کے گیت گاتے ہیں، مہاتما بدھ کے کاندھوں پر بیٹھ کر تُو ہی تُو کا ورد کرتے ہیں... حضرت سلمان کے تابع ہیں.. کنفیوشس کے گرد چہکتے اُس کے اقوال دوہراتے ہیں.. لیکن پرندوں سے ذاتی طور پر کبھی کسی نے پوچھا کہ آپ کس مذہب پر دل و جان سے یقین رکھتے ہیں.. کسی نے نہیں پوچھا..

اور پھر گونج اگرچہ ایک لامذہب پکھیرو تھی میرے ذاتی خدا کی قدرے قائل ہو گئی جب ہم ”مرفی ز لونگ شور لاج“ کے کیسے کوزی، ستھرے اور دمکتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے..

”جزاک اللہ“ وہ ایسی قائل ہوئی۔

اب ہم بے آسرا نہ تھے.. چھت میسر آ گئی تھی تو اُس بھوک کا خیال آیا جو ابھی تک بے گھری کے خوف سے کہیں دبکی ہوئی تھی۔ وہ احتجاج کرنے لگی تھی کہ بیلوگا وہیل بہت ہو چکیں، گھاس میں محوِ خرام راج ہنس اور سیورڈ کے ساحل بہت ہو چکے.. اب میری جانب توجہ کرو..

سیورڈ کی چند ذیلی گلیاں جو ابھرتی ہوئی گھنے جنگلوں میں گم ہوتی تھیں اور وہ بازار جو اترتے ہوئے سمندر میں اُتر تے تھے اُس شب ویران تھے۔

ہم نے ایک اطالوی ریستوران کی ویرانی میں کھانا کھایا اور جیپ کا رُخ ساحل کی جانب موڑ دیا۔

بارش ابھی تک نہ تھمی تھی۔

برستی جاتی تھی.. ونڈ سکرین پر اُس کی دھاریں بیوہ کے آنسوؤں کی مانند گرتی جاتی تھیں۔

آبنائے الاسکا کا تاریکی میں گم سمندر جس میں سالمن اور وہیل مچھلیاں روپوش تھیں.. اور جس میں ڈولفن ابھرتی ڈوبتی تھیں، ہماری جیپ کی ونگ سکرین کے پار اندھیروں میں ملفوف تھا..

”گونج.. ہماری جیپ کی ونڈ سکرین کے پار کیا ہے..“

”میں ہوں..“

”تم ہو؟..“

”ہاں.. کہ میں بھی اندھیروں کے تلاطم میں کبھی ابھرتی اور کبھی ڈوبتی ہوں.. نہیں جانتی کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں..“

”تم یقیناً اتنی فراست پسند اور دانا ہو کہ عطار کے پرندوں میں سے ایک ہو۔“

”تھینک یُو..“ اُس نے صرف اتنا کہا۔

○●○●○

''دور دور تک رم جھم..اب جاگو موہن پیارے''

مجھے خواب کم ہی آتے ہیں لیکن اُس شب سیورڈ میں آئے اور عجیب آئے..ایک نیم خوابیدگی کی کیفیت میں میرے کانوں میں، کن مِن، کن مِن بوندیں گرتی چلی جاتی تھیں..لیکن میں اُس مسلسل بارش میں نہ بھیگتا تھا اور نہ سرد ہوتا تھا کہ مرفی لاج میں جو کمفرٹر تھے ایسے تھے جیسے اُن میں پالی ایسٹر یا روئی نہیں بھری ہوئی بلکہ ننھے منے سینکڑوں زندہ پرندے بھرے ہوئے ہیں..اور اُن کے پوٹلی بدن دھک دھک کرتے ہیں، اُن میں سے ہلکی گرمائش نکلتی ہے اور آپ اُس کی آسائش میں مست ہو جاتے ہیں..میں اُن دھڑکتے پوٹلی بدنوں کی حِدّت میں آسودہ عجیب خواب دیکھتا ہوں..

یہ برف سفید بیلوگا وہی مچھلیاں ہیں جو میرے خوابوں کی دُھند میں ڈوبتی ابھرتی ہیں اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور وہ ایک خاص ردھم میں ڈوبتی ابھرتی ہیں جیسے وہ الاسکا کے سمندروں کی سٹیج پر رقص کرنے والی بیلے رینائیں ہیں، وہ لہروں کے شور اور ساحل پر بجھنے والے پانی کی سرسراہٹ کی موسیقی پر رقص کرتی ہیں اور میری شدید خواہش ہے کہ میں اُن میں سے کسی ایک کی شکل دیکھوں کیونکہ صرف اُن کے سفید دھڑ سطحِ آب پر اُبھرتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں..وہ مجھے اپنا چہرہ دکھانے سے گریز کرتی ہیں اور پھر ایک وہیل ایسی ابھرتی ہے جس کا چہرہ شناسا ہے..میں نے اُسے پچاس برس قبل ماسکو کے بالشوئی تھیئٹر کی سٹیج پر بیلے رقص کرتے دیکھا تھا..وہ گالینا اولانووا تھی، بیلے رقص کی پہلی اور آخری دیوی جس کے پاؤں سفید کبوتریوں کی مانند پھڑ پھڑاتے سٹیج پر پڑتے ہی نہ تھے ہوا میں ہی حرکت کرتے تھے اور جہاں کہیں اُس کا پاؤں پڑتا تھا وہاں اُس کے لمس سے نزاکت کا ایک دِیا روشن ہو جاتا تھا..پھر ایک اور وہیل سمندر میں سے ابھرتی ہے اور اپنا چہرہ عیاں کر دیتی ہے اور حیرت ہے وہ بھی اولانووا کا چہرہ ہے اور پھر اُن سمندروں پر اولانووا کے سینکڑوں چہروں کا راج ہے اور وہ رقص میں ہیں۔ پھر وہ سرمئی سمندر رنگ بدلتے ہیں، ہری کچور گھاس کے رنگ میں نچڑنے لگتے ہیں اور اُس گھاس میں بھی سینکڑوں سفید راج ہنس تیرتے چلے جاتے ہیں..یہ یقیناً مشہور زمانہ بیلے رقص ''سوان لیک'' ہی ہو سکتا تھا یعنی ''راج ہنسوں کی جھیل'' کیونکہ میں نے بالشوئی کے سٹیج پر اولانووا کو ''سوان لیک'' پرفارم کرتے ہی دیکھا تھا۔ یہ عجیب سے خواب سیورڈ کی پہلی شب میں آتے رہے..

شب بھر رہا چرچا ترا..

اور پھر میری رگوں اور شریانوں کی حساسیت میں جو ہزاروں کلاک ٹک ٹک کرتے تیرتے پھرتے تھے یکدم اُن سب کے الارم بجنے لگے، دوہائی دینے لگے کہ تمہاری نیند کب کی پوری ہو چکی، اب جاگو موہن پیارے..اور موہن پیارا

اپنے پرندوں کی حِدّت بھری پوٹلی کمفرٹر میں پوشیدہ صرف اپنی ناک باہر کر کے ایک سانس بھرتا ہے تو پھیپھڑوں میں اترنے والی ہوا نمکین ہے اور اُس میں سمندروں کی نمی کی گیلی گھاس ہے اور مچھلیوں کی بُو ہے..کہ یہ سیورڈ ہے..نمکین ہوا، مچھلیاں اور سمندر..

اگر آپ ایک خواب آور نیند کے خمار میں سے ہوش میں آ جاویں، واش روم سے فارغ ہو کر کمرے میں مہیا کردہ سہولت سے استفادہ کرتے ہوئے حسب منشا دو ٹوسٹ، ٹوسٹر میں سینک کر اُن پر منجمد مکھن کی ایک تہہ لگا کر اُس پر سنہری مالٹوں کے مارملیڈ کا ایک لیپ بچھا کر انہیں دانتوں تلے لے آویں تو کیا یہ ایک سہانی عیاشی نہ ہو گی اور اس سونے پر تب سہاگہ ہوتا ہے جب آپ کافی میکر کی مدد سے سلگتی ہوئی کافی کا ایک مگ بنا کر اُس کی پہلی چسکی لیتے ہیں جو آپ کے لب جلا ڈالتی ہے اور اُن کی جلن آپ کو وصل کی کچھ شبوں تک لے جاتی ہے..ایک پنجابی لوک گیت اس کیفیت کی ترجمانی ایک بے دھڑک انداز میں کرتا ہے کہ..تم نے کس یار کا اتنا گرم اور سُلگا ہوا دودھ پیا ہے کہ تمہارے سرخ ہونٹ جل گئے ہیں..

چونکہ ''مرفی زِلونگ شور لاج'' کا یہ کمرہ ایک نو سموکنگ روم تھا اس لیے ناشتے کے بعد مجھے نکوٹین کے زہر کی شدید حاجت ہوئی تو میں نے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھولا..آہستگی سے تاکہ واش روم کے مَیٹ پر پڑے سیمنٹے افیونی کوج کی نیند میں کچھ خلل واقع نہ ہو..اور باہر آ گیا..کمرے کی ڈھلواں چھت کا چھجہ ایسا تھا کہ ذرا دیوار سے لگ کر اُس کے نیچے کھڑے ہو کر بھیگے بغیر اطمینان سے ایک سگریٹ پیا جا سکتا تھا کہ بارش مسلسل برستی چلی جا رہی تھی..پُرشور اور دھواں دار نہیں یونہی ایک ایک بوند..ٹپ ٹپ..مسلسل..اور آسمان گدلے اور ابر آلود..ایسے ابر نہیں جن سے درخواست کی جا سکے کہ اے ابرِ کرم اے ابرِ کرم آج اتنا برس کہ وہ جا نہ سکیں۔ اس الاسکا کے ابرِ کرم میں اتنا پانی تھا کہ اُس نے برستے ہی جانا تھا، اگلی سویر بھی وہ جا نہ سکتے تھے..دو چار روز بعد اس کے برسنے کے موقوف ہونے پر گھر جاتے تو کیا والد صاحب ''اُنہیں'' زدوکوب نہ کرتے کہ کہاں گزاری ہیں یہ راتیں..کس کے ساتھ گزاری ہیں یہ راتیں..چن کتھاں گذاری آ رات وے...

سیورڈ کا سارا وجود بھیگ رہا تھا..بارش ہوتی جاتی تھی..ہر شے..گڑیا گھر اور فٹ پاتھ اور پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا گیلا ہو رہا تھا..

دور دور تک رم جھم..

دور دور تک سمندر پر گرتی بوندیں..

سمندر کے پس منظر میں سیاہ دکھائی دیتے پہاڑ جن کی چوٹیوں پر موسم کی آخری برفیں ٹھہری ہوئی تھیں، منتظر تھیں کہ آسمانوں سے کوئی کمک آئے کہ ستمبر کا آخر ہے، برف گرنے لگے اور وہ پھر سے سراسر سفید پیراہنوں میں ڈھک جائیں اور واقعی ''مرفی زلونگ شور لاج'' کے بروشر کا یہ دعویٰ سو فیصد درست تھا کہ یہاں سے جو منظر نظر آتا تھا اُس کی مالیت کم از کم ایک ملین ڈالر تھی..میں اس گیلے بھیگتے کچھ اداس سے منظر کے سحر میں گم دیر تک یہ بھولا رہا کہ آخر میں کمرے کی عافیت میں سے نکل کر باہر کیوں آیا تھا..ایک سگریٹ کے لیے..ایک سگریٹ کی طلب بھی کیسی بے اختیار ہوتی ہے..جیسے سکاٹ لینڈ کا ایک بادشاہ پکارتا ہے کہ ایک گھوڑا..ایک گھوڑا..میری پوری سلطنت کے عوض ایک گھوڑا...کچھ ایسی ہی بے اختیاری ایک

تمباکو نوش کے بدن سے ایک ہُوک کی مانند اٹھتی ہے کہ..ایک سگریٹ..ایک سگریٹ..پورے الاسکا کے عوض ایک سگریٹ..

میں وہ ایک سگریٹ سلگاتا ہوں، ایک گہرا کش کھینچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ نہیں پورے الاسکا کے عوض یہ ایک سگریٹ تو بہت مہنگا ہے..سیورڈ کی اُس ملگجی سویر میں جب آبنائے الاسکا میں لنگر انداز کشتیوں کے بادبان بھیگتے تھے اور اُس کے پانیوں میں چھید کرتی بوندیں اتنی گہرائی تک چلی جاتی تھیں کہ سالمن مچھلیوں کو بھی بے آرام کرتی تھیں اور میں سگریٹ کے کش لگاتا نکوٹین کے سحر میں مبتلا تھا، گونج نمودار ہو جاتی ہے، میری تنہائی میں مخل ہو جاتی ہے اور وہ ایک مُندی ہوئی آنکھوں والی بیزار اور اونگھتی ہوئی گونج نہیں ہے بلکہ اُس کا سراپا دلکش اور دلربا ہے اور وہ جمائیاں لینے سے بھی گریز کر رہی ہے..

''تم اپنی عمر کا خیال کیوں نہیں رکھتے۔'' وہ مجھے ڈانٹتے ہوئے برس پڑی ''کیا تمہیں احساس نہیں ہے کہ تم اپنے لاہور میں نہیں، الاسکا میں ہو..کمرے کی حدت آمیز آسودگی میں سے صرف اپنے کُرتے شلوار میں..اور تمہارا ازار بند بھی لٹک رہا ہے..یوں بے دریغ باہر آ گئے ہو، مرنا ہے؟''

یہ گونج کوئی ماں تھی جو مجھے یوں ڈانٹ رہی تھی..یا ایک عشقِ خاص تھی جو یوں میرا دھیان رکھتی تھی..

''ہاں..مرنا ہے۔'' میں اُس کی تشویش سے متاثر ہو کر اسے چھیڑتا ہوں ''یہیں مر جانے کو جی چاہتا ہے۔''

''تم ایک ناقابلِ علاج رومینٹک ہو۔تم سے الجھنا فضول ہے۔'' وہ بیزار سی ہوئی اور پھر نہایت تحکمانہ لہجے میں بولی ''اندر آ جاؤ۔''

''اندر آ کر مروں؟''

دُکھ اور شکایت کی گیلی ریت میں سے اُس کے آنسوؤں کے پانی پھوٹنے لگے..اُس کی چونچ پر ڈھلتا ایک آنسو اُس کا تیکھا پن نہ سہار سکا، اُس کے سفید پَروں پر گرا اور وہاں سے بھی پھسلا اور اُس کے پنجوں پر گر کر اُنہیں بھی بھگو دیا..

''آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو تم یوں بے وجہ اشک بار ہو گئی ہو۔'' میں اُس کے دُکھ کا جواز نہ جان سکا۔

''آخر تم مشرقی لوگ موت کے عشق میں کیوں مبتلا ہو..سوگوار ہونے کے بہانے تلاش کرتے ہو..اپنے آپ کو اذیت دے کر حظ محسوس کرتے ہو..میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے ہاں ایسے لوگ ہیں جن کا عقیدہ ہی غم اور موت ہے..وہ سینہ کوبی کر کے راحت محسوس کرتے ہیں، خود اپنے بدن پر چھریوں کے وار کر کے لہولہان کر لیتے ہیں..کیا موت سے یہ اُلفت، ہمہ وقت اُس کے چہرے کو سامنے رکھنا ایک مقدس لطف ہے یا کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے..اور یہ حقیقت تمہاری رفاقت کے دوران مجھ پر منکشف ہوئی کہ تم جان بوجھ کر موت کو ہم سفر رکھتے ہو اور وہ زندگی جو بانہیں پھیلائے تمہاری منتظر ہوتی ہے اُس سے آنکھیں چُراتے ہو اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تمہاری اکثر تحریروں میں موت کے تاریک سائے ساتھ ساتھ چلتے ہیں..میں نے تشویش میں مبتلا ہو کر تم سے کہا کہ باہر مرنا ہے اور تم پھولے نہیں سمائے کہ ہاں ہاں یہیں مر جانے کو جی چاہتا ہے اور اندر آ کر مروں۔ٹھیک ہے اگر یہی تمہاری تمنا ہے تو اندر آ کر مر جاؤ۔''

یہ گونج انکشافات کا ایک حیرت انگیز آسمان تھی۔

میں اندر آ گیا ''دیکھو گونج مجھ سے خفا مت ہو..تم درست کہتی ہو کہ مشرق کے مزاج میں ہی ایک سوگواری اور موت کو گلے لگانے کی چاہت ہے..یہ ہماری ازلی محرومیاں ہیں، ذلتیں اور رسوائیاں ہیں یا موسم ہیں کہ موت ہمارے لیے کشش رکھتی ہے اور سنو میں تو محض اپنی ثقافتی اور تمدنی روایت کی پیروی کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں تو جگر زخمی ہے دل گھبرا رہا ہے، محبت کا جنازہ جا رہا ہے قسم کے گانے نہایت دردناک اشتیاق سے سنے جاتے ہیں..فلموں کے انجام بھی صرف المیاتی اور موتی قبول کیے جاتے ہیں کہ ہیرو اور ہیروئن کی کشتی ایک گرداب میں پھنسی گھومتی جاتی ہے اور ہیرو نہایت رقت آمیز لہجے میں گا رہا ہے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے..یہاں تک کہ کامیاب رومانوی ناولوں کا آغاز بھی کچھ یوں ہوتا ہے کہ شبرینا برآمدے میں سے ریکٹ گھماتی ہوئی نکلی اور جانے کیوں اداس ہو گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے..تو پلیز مجھے موردِ الزام نہ ٹھہراؤ..''

''سوری..'' گونج مسکرانے لگی تھی ''میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئی تھی، میرے اندر بہت دنوں سے یہ لاوا پک رہا تھا، دراصل اس مسافت کے دوران تم بار بار اپنی ڈھلتی عمر کا تذکرہ کرتے تھے، موت کی باتیں مسلسل یوں کرتے تھے کہ میں زچ ہو گئی..کہ مجھے یقین ہے کہ میں آخری بار اس منظر کو دیکھ رہا ہوں..جو دیکھنا ہے اُسے دیکھنے کے لیے میرے پاس وقت کم رہ گیا ہے وغیرہ وغیرہ..ویسے تم اندر آ چکے ہو لیکن پلیز..مت مرو۔''

''نہ مروں تو کیا کروں؟''

''ہم سیورڈ میں ہیں تو کیا ہم نے آج کا دن یونہی مرفی لاج میں اونگھتے ہوئے گزار دینا ہے..تو آج کیا کرنا ہے، کہاں جانا ہے، دوپہر کا کھانا کہاں کھانا ہے..شام تک کیا کرنا ہے..''

اب میں نے نہایت سنجیدگی سے یہ منصوبہ بندی شروع کر دی کہ آج کے دن ہم نے سیورڈ میں کرنا کیا ہے۔

لیکن ان منصوبوں کا انکشاف کرنے سے پیشتر بارے اس مُندہ الاسکن قصبے کے بارے کچھ بیاں ہو جائے..

یہ مختصر قصبہ صدر ابراہیم لنکن کے سیکرٹری آف سٹیٹ ولیم ہنری سیورڈ کے نام پر الاسکا کے نقشوں میں ابھرا..یہ سیورڈ صاحب وہی حضرت ہیں جنہوں نے نہایت شاطرانہ پن سے رُوسیوں کو شطرنج کے اس کھیل میں مات دی جس کے تحت 1867ء میں امریکیوں نے نہایت سستے داموں الاسکا اُن سے خرید لیا اور اس کے باوجود اُن زمانوں میں پورے امریکہ میں ہاہا کار مچ گئی کہ اس نادان سیکرٹری آف سٹیٹ سیورڈ نے کیا ہی گھاٹے کا سودا کر لیا کہ لاکھوں ڈالر محض ایک بے آباد ویرانہ، برفوں کے انبار اور چند قطبی ریچھ حاصل کرنے کی خاطر خرچ کر دیئے..اُدھر روسی حضرات مارے خوشی کے الٹک بیٹھک والا کوسک رقص کرتے تھے اور واڈکا کے مٹکے چڑھاتے تھے کہ امریکیوں کو بے وقوف بنا لیا، نہ وہ آگاہ تھے اور نہ ہی امریکی کہ الاسکا میں آئندہ زمانوں میں گیس کے وسیع ذخائر دریافت ہو جائیں گے، پٹرول ابل پڑے گا اور اُس کے دریاؤں اور جھیلوں کے پانیوں کی بھی قیمت پڑے گی..

ویسے سیورڈ کا روسی تشخص اب بھی قائم ہے..یعنی اس قصبے کو حسن بخشتی جو آبنائے ہے وہ آج بھی اُس روسی کے نام سے جانی جاتی ہے جس نے اسے دریافت کیا تھا یعنی..الیگزانڈر بارانوف۔

اس قصبے کی بنیاد بھی اُنہی دنوں رکھی گئی جن دنوں اینکر اینج وجود میں آ رہا تھا، 1903ء تک یہ ایک اسکیمو بستی تھی جہاں کے باشندے گوری اقوام کی آمد سے ہراساں ہو کر یہاں سے ہجرت کر کے شمال کے برفزاروں کی جانب منتقل ہو گئے.. اس قصبے پر بھی سونے کی تلاش کے اثرات نمایاں ہیں، عہد حاضر میں یہ برف پر پھسلنے والی کتا گاڑیوں کی وجہ سے الاسکا بھر میں ممتاز ہوا.. اور اس کے کوچۂ و بازار کے نام خصوصی سرمایہ دارانہ امریکی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں.. یعنی کروڑ پتی لوگوں کی گلی.. شراب کشید کرنے کا کوچہ اور پُر مسرت ہو جانے والی گلی..

تو آج کے دن ہم دونوں سیورڈ میں کیا کر سکتے تھے..

ہم ایک کینو ایک ہلکی پھلکی کشتی کرائے پر حاصل کر کے آبنائے الاسکا کے پانیوں میں اُتر کر چپو چلاتے کسی ساحل پر اوندھے پڑے اود بلاؤ دیکھ سکتے تھے.. شاید کوئی ایک آدھ مفن پرندہ بھی دیکھنے کو مل جائے..

یا پھر برفانی کتوں والی ایک گاڑی حاصل کر کے برف کے بغیر جو ڈھلوانیں تھیں وہاں سیر کر سکتے تھے، آس پاس کے جنگلوں میں گھڑ سواری کر سکتے تھے، کوہ نوردی کر سکتے تھے، سالمن مچھلیاں شکار کر سکتے تھے، اس کے سوا بھی بہت کچھ کر سکتے تھے.. ٹونج نے سیورڈ میں تفریحی طور پر مصروف ہونے کے تمام تر امکانات کا جائزہ لیا.. یہ تو پہلے سے طے شدہ تھا اور ہم سیورڈ آئے ہی اس لیے تھے کہ اس کی بندرگاہ سے وہ مشہور زمانہ کروز شپ رواں ہوتے ہیں جو آپ کو اُس الاسکا تک لے جاتے ہیں جو سیاحتی پوسٹرز میں اور نیشنل جیوگرافک کی دستاویزی فلموں میں دکھائی دیتا ہے.. یہ کروز شپ اُن گلیشیئرز کے سائے سائے حرکت کرتے ہیں جن کے انبار ٹوٹ ٹوٹ کر سمندر میں گرتے چلے جاتے ہیں.. ڈیہل مچھلیاں، ڈولفن، اود بلاؤ اور چٹانوں پر بسرام کرتے مفن پرندے اور کبھی کبھار کوئی ریچھ ٹہلتا ہوا اور ممکن ہے کوئی الاسکن عقاب گلف آف الاسکا پر اُڑان کرتا ہوا.. تو ہماری ترجیحِ اول یہ تھی کہ اس کروز شپ کے لیے ٹکٹوں کی ایڈوانس بکنگ حاصل کی جائے اور پھر.. پھر کیا کیا جائے؟

کیا ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر سیورڈ پر ہجوم کرتے جو گھنے جنگل تھے اُن میں اتر جائیں اور اُن دو جھیلوں تک پہنچ جائیں جن کے نیلگوں پانی اُن کے اندر کہیں روپوش تھے.. اس امکان کو میں نے ویٹو کر دیا.. مجھ پر آج تک یہ راز افشا نہیں ہوا کہ دو چار لوگ مجھ ایسے بھدے بدن کو ڈنڈہ ڈولی کر کے اگر گھوڑے پر بٹھا ہی دیں تو جب وہ گھوڑا اُخر خُر کرتا چلنے لگتا ہے تو وہ کونسے کمال کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اس کی کاٹھی پر قائم رکھتے ہیں اور کیونکر رکھتے ہیں، لڑھک کر گر نہیں جاتے۔

میں نے تو پہلی بار "یاک سرائے" کے سفر کے دوران وادی سونج کی ندیوں اور ڈھلوانوں کو ایک گھوڑے کی پشت پر بیٹھے عبور کیا تھا.. یا پھر کاغان کی جھیل دودی پت سے دواریاں جھیل اور رتی گلی کی چوٹی عبور کر کے باٹا کنڈی تک کا سفر کیا تھا.. اور آخری بار منی مرگ سے آگے درّہ کامری کی بلندی پار کر کے آزاد کشمیر کے آخری قصبے تاؤبٹ میں اُترا تھا.. اور یہ مسلسل اذیت اور لڑھک جانے کے خوف سے لرزیدہ سفر تھے اور یہ سفر میں نے کیسے کیے.. کتنی بار میں گھوڑے سے گرا.. اور کھائی کی جانب یا دریا کے نشیب کی جانب نہیں گرا.. جھاڑیوں اور خودرو گھاس پر جا گرا.. یہ تو میرا رب جانتا ہے یا وہ گھوڑے جانتے ہیں، چنانچہ گھڑ سواری تعلیمی طور پر میری کتابوں میں ایک آپشن نہ تھی... میں گلف آف الاسکا میں کشتی رانی کا خطرہ

مول نہ لے سکتا تھا کہ مجھ میں پیراکی کی صلاحیت صرف اتنی تھی کہ اگر کوئی مجھے گہرے پانیوں میں دھکا دے دے تو میں ہاتھ پاؤں چلا کر اُن میں سے باہر تو آ سکتا تھا، باقاعدہ تیر نہ سکتا تھا.. اگر کشتی اُوندھی ہو جاتی تو میں الاسکا کے سمندروں میں پیراکی کے جوہر نہ دکھا سکتا تھا.. اُدھر ڈوب کر اُدھر نہ نکل سکتا تھا.. اور نہ ہی میں مچھلی کے شکار میں کچھ دلچسپی رکھتا تھا کہ اس حوالے سے میرا کل تجربہ کھمنڈی کے ایک جوہڑ تک محدود تھا اور وہاں بھی پہروں منتظر ہونے کے بعد میری کُنڈی کو کوئی مچھلی نہیں کوئی کچھوا منہ مارتا..

تب ٹونج نے میری مدد فرمائی اور ان الجھنوں کا ایک قابل عمل حل پیش کر دیا "میری مانو تو یہاں سے صرف دو چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایگزٹ نام کا ایک گلیشیئر پھیلا ہوا ہے، وہاں چلتے ہیں۔"

"چلتے ہیں۔" میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا کہ شکر ہے جان بچ گئی۔

بارش، سیورڈ کی سہیلی تھی، اُس کی جان نہ چھوڑتی تھی۔

ٹونج کا تو کچھ نہ بگڑتا تھا، وہ ہر دو چار لمحوں کے بعد اپنے بھیگے ہوئے پر پھیلا کر اُنہیں جھٹکتی اور اُن پر گری ہوئی بوندیں ایک باریک پھوار کی صورت اختیار کر کے میرے چہرے کو گیلا کر دیتیں... البتہ میرا بہت کچھ بگڑ جاتا.. اس بارش کی زد میں آتے میرے وہ بال جو کبھی اتنے گھنے اور گنجلک تھے کہ انگریز نائی اپنی مؤدب اور طرح دار قینچیوں سے بھی اُنہیں کاٹنے میں ناکام ہو جاتے اور پھر ایک برقی رولر میرے سر پر پھیر کر اُن بالوں کو ذرا جلا کر اس قابل کرتے کہ اُنہیں آسانی سے کاٹا جا سکتا تو بالوں کا وہ گھنا جنگل اب چھدرا ہو چکا تھا، بال اب خال خال ہو چکے تھے اور اُن میں میری چُندیا روزِ روشن کی مانند عیاں نظر آنے لگی تھی اور ایسے چھدرے اور خال خال بال اگر بارش میں بھیگ جائیں تو آپ کی شکل گلف آف الاسکا میں پائے جانے والے بھیگے ہوئے مونچھوں والے اود بلاؤں سے ملنے لگتی ہے..

سمندر سے منہ موڑے بارش میں بھیگتے ایک خوش نظر چوک کے کناروں پر نہایت رنگین اور پیارے پیارے چوبی گھر تھے جو دراصل اُن متعدد سیاحتی اداروں کے دفاتر تھے جو سیاحوں کے لیے گلف آف الاسکا کی سمندر نوردی کے بندوبست کرتے تھے.. ہر ادارے کا اپنا مخصوص ٹور تھا اور اس کا کرایہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا یعنی چھ گھنٹوں کی بحری سیاحت جس کے دوران آپ امید کرتے تھے کہ آپ مسمار ہوتے گلیشیئر کو بہ چشم خود ملاحظہ فرمائیں گے اور وہی ڈیہل مچھلیاں اور ڈولفن آپ کے سٹیمر کے ساتھ ساتھ تیریں گے اور وہی مفن پرندے آپ کو من موہنے گیت سنائیں گے، یہ آپ امید کرتے تھے اور کرایہ تقریباً ڈیڑھ سو ڈالر کے قریب تھا.. یعنی اگر آپ اس سمندری مسافت کے دوران درجن بھر ڈیہل مچھلیاں اور دس بیس مفن پرندے دیکھ لیتے ہیں تو فی ڈیہل مچھلی اور فی مفن پرندہ تقریباً دس ڈالر میں پڑتا تھا...

اگلے روز کے لیے ہم نے "کنائے فیورڈ ٹورز" کے کروز شپ "کوسٹل ریکورز" میں ایک نشست مخصوص کروا دی.. ایک نشست کہ ٹونج نے تو کروز شپ کے پہلو بہ پہلو اُڑان کرنی تھی.. یہاں سے فارغ ہو کر ہم ایگزٹ گلیشیئر کی یاترا کے لیے چل دیے..

○●○●○
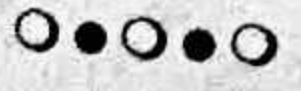
''ایگزٹ گلیشیئر تک.. ہُو ہُو.. اللہ ہُو''

ابھی دوپہر بھی نہ اتری تھی، ویسے آثار سے کچھ عیاں نہ ہوتا تھا کہ دن کا کونسا پہر ہے کہ بارش تھمنے میں نہ آتی تھی.. ہم سیورڈ سے نکلے اور اس قصبے سے نکلنا بھی کیا نکلنا تھا، ایک سگریٹ جلایا، دو کش لگائے اور آپ سیورڈ سے باہر.. تین ہزار جس کی کُل آبادی ہو وہ قصبہ آخر کتنا بڑا ہو سکتا ہے.. ہم اُس شاہراہ تک آ گئے جس پر ہم اینکر ایج سے سفر کرتے ہوئے آئے تھے اور وہاں سے بائیں جانب ایک گہرے سبز رنگ کے مینہ سے لت پت ہوتے جنگل کے اندر چلے گئے..

اور یہاں دن کو بھی شب کی سیاہی کا سماں تھا.. شجریوں امڈتے آتے تھے جیسے ہماری جیپ کو دفن کرنے کے درپے ہوں..

بائیں ہاتھ پر ان سیاہ جنگلوں کے خوف کے اندر کچھ روشنیاں جھلملاتی تھیں.. درختوں کی رکاوٹیں عبور کرتی ہم تک پہنچتی تھیں، یہ کسی ''وِلڈرنیس لاج'' کے آثار تھے.. نہ صرف یُوکان میں بلکہ الاسکا کے جنگلوں کے اندرون میں، دور افتادہ جھیلوں کے کنارے اور ویرانوں میں ایسے نہایت نہایت دیدہ زیب سراسر شہتیروں سے تعمیر کردہ چوبی لاج پائے جاتے ہیں جو خاصے پُرتعیش اور نہایت مہنگے ہوتے ہیں، ان میں زیادہ تر متمول بوڑھوں اور ریٹائر شدہ خواتین و حضرات کا قیام ہوتا ہے جو مجال ہے کبھی اُس لاج سے باہر قدم بھی رکھتے ہوں، پیسے پورے کرنے کی خاطر وہیں پڑے رہتے ہیں، سہولتوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں، آتش دان میں جلتی آگ کے سامنے بیٹھ کر سکاچ سُڑکتے ہیں اور اگر جوڑے ہوں تو راتوں کو الگ الگ بستروں پر سو جاتے ہیں اور اگر کبھی الاسکا کے ویران برف زاروں اور جنگلوں کو دیکھنے کی خواہش نے بہت ہی زور مارا تو کمرے کی کھڑکی کے پردے ہٹا کر ایک نظر دیکھا اور پھر سے آتش دان کے سامنے وہسکی کا گلاس تھامے آ بیٹھے اور دوستوں اور عزیزوں کو الاسکا کے تصویری پوسٹ کارڈ لکھنے شروع کر دیئے کہ.. تم تصور نہیں کر سکتے کہ الاسکا کتنی حیرت انگیز جگہ ہے.. کاش تم بھی یہاں ہوتے..

''کیا تمہیں کبھی آرزو ہوئی کہ تم بھی کسی ایسے لاج میں قیام کرو؟''

''نہیں..''

''کیوں نہیں.. جنگلوں میں پوشیدہ ایک سہولتوں سے لبریز قیام گاہ میں ٹھہرنے کو کس کا جی نہ چاہے گا..''

''تم مکر کر رہی ہو.. جب مجھ سے یہ سوال کرتی ہو.. تم ان طویل مسافتوں کے دوران خوب جان چکی ہو کہ میں کھڑکی کے اندر نہیں کھڑکی کے باہر کی دنیا میں سانس لینے کا آرزومند شخص ہوں.. نہیں جان سکی..''

''صحیح..'' اُس نے صرف اتنا کہا..

اور گفتگو کے اگلے پل ایک منظر کھلا..

وہ گھنے جنگل پسپا ہوتے پیچھے ہٹتے گئے اور جیپ اگرچہ ایک ابر آلود لیکن کھلے آسمان تلے آ گئی.. دھوپ کی چند شاخیں بادلوں میں چھید کرتی ہمارے آس پاس چھونے لگیں اور وہاں سڑک کے دائیں جانب ایک پڑاؤ تھا، ایک پارکنگ ایریا بارش میں بھیگتا تھا جس کے سنگریزوں پر جیپ کے ٹائر تھم گئے اور اُن سنگریزوں کی گیلاہٹ جیپ کے اندر تک چلی آئی.. ہم باہر آ گئے.. ایک بڑے معلوماتی بورڈ پر اُس منظر کا جو ہمارے سامنے تھا، تا حد نظر کھلتا جاتا تھا نقشہ نقش تھا، ایگزٹ گلیشیئر جس کی جانب ہم جا رہے تھے اُس کا سب سے دل پذیر اور دل نواز منظر اس مقام پر آپ کے قدموں میں بچھا دور دور تک چلا جاتا تھا.. وہاں سرمئی سنگریزوں سے بھرا ایک وسیع میدان تھا جس میں وہ چھوٹی چھوٹی ندیاں سرکتی تھرکتی بہتی چلی آتی تھیں جو ایگزٹ گلیشیئر کی کوکھ میں سے پھوٹ رہی تھیں.. دھوپ کی جو چند شاخیں سرمئی بادلوں میں چھید کرتی اُترتی تھیں، وہ ان ندیوں کے بہاؤ کو سیماب صفت کرتی اُنہیں تڑپاتی تھیں اور پھر اُن دو پہاڑوں کے درمیان میں ایگزٹ گلیشیئر کا برفانی وجود نظر آ رہا تھا جس کی سفیدی پر نیلاہٹ غالب آ رہی تھی اور گلیشیئر کی اس منجمد آبشار کے پہلو میں جو جنگل تھے، وہ ستمبر کے کرشموں کے آئینہ دار سراسر پیلاہٹ میں ڈھلے ہوئے تھے۔

ایک نہایت واہیات اگرچہ سُریلا گانا میرے خیال میں آیا کہ.. جب بہتی ندیا شور کرے میرا دل ملنے کو زور کرے..

تو ان بہتی ندیوں کو دیکھ کر میرا دل بھی زور کرنے لگا کہ آج اگر میں صرف دس برس پہلے کے زمانے میں ہوتا، میں یُوں ایک سہولت بھرے شریفانہ سفر میں نہ ہوتا جس میں میں ایک فربہ دریائی گھوڑے کی مانند سہولتوں کے پانیوں میں سُستی سے پڑا نہ ہوتا.. کبھی کبھار کروٹ بدل کر ذرا پھنکار کر پھر آسودہ نہ ہو جاتا تو میں اگر صرف دس برس پہلے کے زمانوں میں ہوتا تو یہیں سے اپنے سفر کا رُخ بدل کر شاہراہ سے نیچے اتر کر.. سنگریزوں کے اس میدان میں چلتا، ندیاں پھلانگتا، کبھی جو گرز اتار کر اُن کے سرد پانیوں میں ننگے پاؤں اُتر کر پار اترتا.. پیدل سامنے دکھائی دیتے ایگزٹ گلیشیئر کی منجمد نیلی آبشار تک جا پہنچتا۔

''تمہیں کون روکتا ہے..'' میں اپنے خیال خواب میں تھا کہ گونج کی آواز آئی ''تم عمر کا رونا رونے سے باز نہیں آتے.. سمجھ لو کہ تم تنہا ہو، اس سنگریزوں بھرے میدان میں اتر کر ندیاں ناپتے پھرو.. پہنچ جاؤ ایگزٹ گلیشیئر کے دامن میں.. جہاں میں تمہاری منتظر ہوں گی..''

''تم میری محرم راز ہو چکی ہو۔ میرے دل کی تختی پر جو آرزو نقش ہوئی ہے اُسے پڑھ لینے پر قادر ہو تو کیا تم نے یہ نہیں پڑھا کہ اگر میری عمر دس برس کم ہوتی تو.. ویسے میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا.. کیا پتہ تم وہاں میری منتظر نہ ہو.. میں ایگزٹ گلیشیئر کے دامن میں پہنچوں تو تم وہاں نہ ہو.. موقع غنیمت جانو اور مجھے اس دیارِ برف میں تنہا چھوڑ کر اُڑان کر جاؤ اور میں تمہیں ڈھونڈتا پھروں.. تمہارا کیا اعتبار.. نہ، میں یہ خطرہ تو مول لینے سے رہا..''

''میں نے کبھی نہ کبھی تو اڑ جانا ہے مستنصر..'' یہ کیا کہ اُس کے لہجے میں ایک عمیق اداسی جڑیں پھیلاتی تھی ''ایک گونج آخر کب تک زمین کے ساتھ لگ کر حیات کر سکتی ہے اور وہ بھی ایک ناجنس کے ساتھ..''

یہاں سے ایگزٹ گلیشیئر تک کا راستہ مختصر تھا..

شاہراہ کا اختتام ایک ایسی پارکنگ لاٹ پر ہوا جس پر ہجوم کرتے تمام شجروں کے پتے زرد آنسوؤں کی مانند ٹپ ٹپ ہماری جیپ کی ونڈ سکرین پر گرتے تھے.. پارکنگ ایریا کے فرش پر پہلے سے گرچکے پتے جب کبھی ہوا کی زد میں آتے تو ایک ناتواں

زرد رنگت کے اژدھے کی مانند کروٹیں بدلتے سرکتے.. مردہ ہو چکے خزاں کے ہاتھوں ستمبر کے ان دنوں میں مرچکے زرد پتے اُس پارکنگ ایریا کے گیلے فٹ پاتھ پر بہت دیر ساکت پڑے رہتے اور پھر ہوا کا ایک جھونکا اُنہیں زندہ کر دیتا اور وہ پہلو بدلنے لگتے۔

جیپ پارک کر کے ہم اُس خزاں آلود افسردگی میں اُترے اور پھر ایگزٹ گلیشیئر تک پہنچنے والے نشانوں پر عمل کرتے ہوئے ایک اور جنگل میں اُتر گئے.. ابھی ہم بے خوف اور بے خطر تھے اور ابھی ہم وہاں سیاحوں کو خبردار کرنے والے ایک بورڈ کی عبارت پڑھ کر دہشت میں آ گئے.. اور اس بورڈ پر کچھ اس نوعیت کی خبرداریاں تھیں کہ.. براہ کرم اس راستے پر پھونک پھونک کر قدم رکھیں کہ گاہے بگاہے ریچھ ادھر آ نکلتے ہیں اور وہ آپ کو ایذا پہنچا سکتے ہیں.. آپ سے درخواست ہے کہ یا تو آپ اپنے ٹخنوں کے ساتھ گھنٹیاں باندھ لیں تاکہ اُن کی چھنک سے ریچھ ہراساں ہو کر آپ سے دور رہیں یا پھر بلند آواز میں کوئی بھی گیت گاتے چلیں تاکہ وہ خبردار ہو کر آپ پر حملہ آور نہ ہوں.. اور اگر ایک ریچھ یکدم آپ کے سامنے آ جاتا ہے تو براہ مہربانی حرکت مت کریں، خاموش اور ساکت کھڑے رہیں.. ورنہ وہ اشتعال میں آ سکتا ہے. یہ ہدایت اُسی نوعیت کی تھی کہ اگر ایک دانت نکوستا کتا بھونکتا آپ کی جانب چلا آتا ہے تو آپ فوراً بیٹھ جائیں، بگٹٹ بھاگ نہ کھڑے ہوں.. بھلا اگر ایک ریچھ اپنا بھاری وجود لڑھکاتا آپ پر اُمڈتا آ رہا ہو تو کیا آپ وہیں ساکت کھڑے رہ سکتے ہیں۔ ایک دلدوز چیخ مار کر ڈڑکی نہیں لگائیں گے، یہ کوئی صائب مشورہ نہ تھا..

ویسے اس بورڈ پر درج ہدایات کے حوالے سے مجھے ایک عجیب آرزو نے گرفت میں لے لیا کہ اگر ریچھوں سے دور رہنے کی خاطر کونج کے پاؤں میں گھنٹیاں باندھ دی جائیں تو وہ کیسے چھن چھن کرتی پھرے گی، پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے.. اور یہ گوری کونج بے شک ٹھم ٹھم کر چلے تو پھر بھی ریچھوں کو تو خبر ہو جائے گی کہ کوئی ٹھم ٹھم کر چلتا ہے..

گھنٹیوں کے سوا دوسرا آپشن بلند آواز میں گیت گانے کا تھا. ظاہر ہے ریچھ میاں بے شک انگریزی کے کچھ لفظوں سے شناسا ہوں لیکن اردو یا پنجابی میں تو بالکل کورے ہوں گے تو کون سے ایسے گیت گائے جائیں جو حسب حال ہوں.. اور اُن میں سرفہرست تو کالا شاہ کالا ساڈھا کالا ہے دِلدار.. بہرطور ہے یعنی کالے کلوٹے ریچھ کو محبوب ٹھہرا دیا جائے تاکہ وہ پُرمسرت ہو کر آپ کو کچھ نہ کہے.. البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ کہیں وہ ریچھ بھی آپ پر ریجھ نہ جائے اور یہ کہہ کر کہ آ جا سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے.. آپ کے سینے سے لگ جائے اور آپ ٹھاہ ہو جائیں.. بہرطور آپ آواز دے کہاں ہے.. گانے سے گریز کریں گے کہ وہ آواز دے کہ میں یہاں ہوں اور وہیں ٹھہرے رہو میں تمہاری جانب لڑھکتا چلا آ رہا ہوں.. کونسا گیت گایا جائے ریچھ کو دور رکھنے کے لیے، ان ممکنات کا دامن بہت وسیع ہے بقیہ آپ کے تصور کی طبع آزمائی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں..

ویسے اس جنگل میں چلتے ہوئے میرے پاؤں ذرا شتابی سے اٹھتے تھے.. کہیں کوئی پتہ چرمراتا تھا تو میرا دل رُک جاتا تھا کہ.. ریچھ.. جنگل کا اختتام ہوا تو سنگریزوں کا وہ میدان نظر آنے لگا جس کے دائیں جانب ایگزٹ گلیشیئر کی برفیں اُمڈتی آتی یکدم رُک گئی تھیں.. گلیشیئر کی قربت میں ہوئے تو وہی برفوں کے اندر سے جنم لینے والی سائیں سائیں کرتی سرد صدائیں سنائی دینے لگیں جو آپ کے وجود سے لپٹ کر آپ کو ٹھنڈا ٹھار کر دیتی ہیں اور ایک منجمد خوف آپ میں بھر دیتی ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عورتوں کے بارے میں میرا تجربہ خاصا محدود ہے لیکن گلیشیئرز کے بارے میں میرا تجربہ خاصا وسیع ہے.. میں نے دنیا کے عظیم ترین گلیشیئرز کی برف چھانی ہے اور اُن میں سے جنم لینے والی اکثر ہولناک سرد صداؤں کو سنا

ہے.. بیافو، ہسپر، بالتورو، چنی بوئی، درکوت اور درجنوں دیگر گلیشیئرز.. ''سنولیک'' کے سفر کے دوران جو سب سے زیادہ موت کی قربت والا لمحہ تھا اُس میں مجھے ایک ریتلی اور سنگریزوں بھری ڈھلوان پر صرف تین چار قدم رکھ کر پار جانا تھا اور جب میں نے اُس پر پہلا قدم رکھا اور سنگریزے میرے بوٹوں تلے سے کھسکنے لگے تو کم از کم ایک کلومیٹر کی گہرائی میں برفانی دراڑوں میں سے اسی نوعیت کی سائیں سائیں کرتی سرد صدا میرے بدن کو بلاتی تھی۔ میں اُس لمحے کو کبھی نہیں بھلا سکتا.. اگر میں اگلا قدم اٹھانے میں ایک پل کی تاخیر کر دیتا تو میں لڑھکتا ہوا برف کے اُن عمیق اندھیروں میں جا گرتا۔

ایگزٹ گلیشیئر کے دہانے پر ہم پہنچے تو وہاں صرف ایک جوڑا پہلے سے موجود تھا. لڑکی نے جو کہ نہایت واجبی سی تھی تیز سرخ رنگ کی ایک جیکٹ پہن رکھی تھی اور بار بار اپنے ساتھی سے لپٹ کر سردی سے کانپتی ''ہُو ہُو'' کرتی تھی اور وہ نادان شخص ایسا تھا کہ جانے کیوں اُسے پرے پرے کرتا تھا.. اس اجتناب کا جواز یہی ہو سکتا تھا کہ وہ دونوں بھی سیورڈ کے کسی لاج میں قیام کرتے ہوں گے اور وہاں بھی یہ لڑکی راتوں کو اٹھ اٹھ کر ''ہُو ہُو'' کرتی ہو گی اور اُس کا ساتھی اس ''ہُو ہُو'' سے عاجز آ چکا ہو گا بلکہ اتنا ناتواں ہو چکا ہو گا کہ مزید ''ہُو ہُو'' برداشت کرنے کی اُس میں سکت نہ رہی تھی۔

''ٹھرکی..'' کونج تھی..

یہ عجیب مصیبت میں نے گلے لگائی تھی، وہ میرے خاموش خیالوں میں نقب لگا کر سب کچھ جان جاتی تھی..

''کوئی ٹھرکی شرکی نہیں۔'' میں نے احتجاج کیا ''وہ لڑکی واقعی ''ہُو ہُو'' کر رہی ہے.. یا نہیں کر رہی؟''

''کر رہی ہے۔ شاید تم چاہتے ہو کہ وہ اُس کے ساتھ نہیں تمہارے ساتھ ''ہُو ہُو'' کرے..''

ہم گلیشیئر کے اندر ایک برفانی کھوہ میں داخل ہوئے جہاں تاریکی تھی اور میں جھکتا ہوا اُس میں داخل ہوا اور اس برفانی لپیٹ میں آ کر ٹھٹھرنے لگا اور بے اختیار ''ہُو ہُو'' کرنے لگا..

''ٹھرکی..'' کونج مجھے عاجز کر دینے پر تُلی ہوئی تھی ''اب خود بھی ''ہُو ہُو'' کرنے لگے ہو..''

''اللہ ہُو..'' میں نے فوراً پاکیزگی کا لبادہ اوڑھ لیا..

''کیا تم ہمارے اس عظیم الشان گلیشیئر سے متاثر نہیں ہوئے؟''

''یہ گلیشیئر تمہارا کیسے ہو گیا۔ تم تو فلوریڈا کے آسمانوں پر اڑان کرنے والی ہو اور یہ الاسکا میں ہے۔''

''اور تم بھول رہے ہو کہ یہ دونوں امریکہ میں ہیں۔''

''صحیح..'' میں نے مان لیا ''ویسے ہمارے پاکستان میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ برف ہے یعنی پولر ریجن کے علاوہ. تو اُن گلیشیئرز کے مقابلے میں تو یہ ایک بچہ بلکہ بہت ہی بچہ گلیشیئر ہے.. اور اس حجم کے تو سینکڑوں گلیشیئر ہمارے شمال میں اوندھے جام بے نام پڑے ہیں اور کوئی انہیں پوچھتا نہیں..''

''یہ.. یہ ایک بچہ گلیشیئر ہے..'' کونج نے سخت خفگی سے کہا ''مجھے کچھ پروا نہیں.. یہ ایک امریکی اور الاسکن گلیشیئر ہے اور یوں تیسری دنیا میں واقع کسی بھی، بے شک دنیا کے طویل ترین گلیشیئر پر سبقت رکھتا ہے کہ یہ امریکی ہے۔''

''صحیح..'' میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ ''اب اس بچہ گلیشیئر کی برفانی کھوہ میں سے نکل چلیں ورنہ میں پھر ''ہُو ہُو'' کرنے لگوں گا اور تم اپنی نادانی میں اسے ایک جنسی استعارہ سمجھ لو گی۔''

○●○●○

''شب میں ڈوبتے سمندروں میں، ایک ڈولفن ابھری اور ڈوب گئی''

مجھے مغربی خوراک بہت مرغوب ہے.. اطالوی سپاگیٹی سوّیاں، ہسپانوی پائلیا.. فرانسیسی کھانے، جرمنی کی ہیمبرگر سٹیکس، سویڈن کی کچی مچھلی، ہنگری کا گولاش، رُوس کا بیف سٹراگنوف.. یہاں تک کہ انگلستان کا روسٹ بیف اور یارک شائر پڈنگ اور بے روح فش اینڈ چپس بھی میرے ذائقے کی کونپلوں کو ترساتے ہیں.. میں رات کے کھانے میں بھی تھوڑی سی تلی ہوئی مچھلی، روسٹ شدہ مرغ کی ایک ٹانگ اور اُبلی ہوئی سبزیاں پسند کرتا ہوں.. لیکن کوئی حد ہوتی ہے..

امریکہ اور خاص طور پر کینیڈا میں آپ اچھے برے.. اعلیٰ اور ادنیٰ ریستورانوں میں اتنے تسلسل کے ساتھ پیزا، پاستا، سپاگیٹی، برگر، روسٹ چکن، بیف سٹیکس اور آلوؤں کے بُھرتے کھاتے چلے جاتے ہیں کہ کچھ دنوں بعد ایک خاص کڑواہٹ اور بدمزگی حلق میں محسوس ہونے لگتی ہے اور آپ کا تالو بغاوت کر دیتا ہے، زبان ترسنے لگتی ہے کہ مجھے کچھ چٹخارہ درکار ہے.. ہری مرچیں جو آگ لگا دیں، کچھ تیز مصالحے، کچھ تُرشی اور کچھ جلن درکار ہیں تاکہ اس کڑواہٹ کا ازالہ ہو سکے..

میں کم از کم اس معاملے میں گونج کا شکر گزار ہوا کہ وہ جان گئی کہ میں کیسی خوراک کو ترستا ہوں اور وہ مجھے سیورڈ کے اکلوتے چینی ریستوران ''دی پیکنگ چائنیز ریستوران'' جو جیفرسن سٹریٹ کے کونے پر چوتھے ایونیو کے سنگم پر واقع تھا، میں لے گئی جو ایک خستہ حال لیکن دلکش چوبی عمارت میں میزبانی کرتا تھا اور جس کی تمام کھڑکیاں مینہ میں بھیگتے گھنے اشجار پر کھلتی تھیں..

اور یہاں کچھ ہجوم نہ تھا..

چونکہ صرف ہم دونوں تھے اس لیے انتظامیہ ہمارے گرد ہجوم کرتی ہماری بلائیں لینے لگی کہ صد شکر کوئی تو آیا..

اور میں الاسکا میں پہلی بار شکم آسودہ ہوا.. کنگ پرانز۔ مچھلی کے ادرک بھرے ذائقے، بیف کے قتلے، پائن ایپل چکن اور پھر چاول.. چینی چاول اور اُن کے ہمراہ تیز سرخ مرچیں، سویا ساس اور سرکے میں بھگوئی ہوئی سبز مرچیں۔ میں تو نہال ہو گیا اور میں نے اُس کھانے کو یوں کھایا جیسے یہ میرا لاسٹ سپّر ہو اور اس کے بعد مجھے مصلوب ہو جانا ہو..

اُس چینی ریستوران میں بیٹھے بیٹھے اُس کی بھیگتے جنگلوں پر کھلتی کھڑکیوں میں سے شام اندر آ گئی اور وہ جو آخری کنگ پران تھا اُس کی گلابی رنگت کو سرمئی کر دیا..

ہم اُس چینی ریستوران سے نکلے تو قدرے خمار میں نکلے..

بلکہ ہم نہیں، صرف میں جو تیز ذائقوں والی خوراک شکم میں اُتار کر مست ہوا جاتا تھا جب کہ گونج حسب معمول سلاد کا دانہ دُنکا چگتی رہی تھی.. اور چند لمحوں بعد ہم پھر سیورڈ کے ساحل پر گلف آف الاسکا کے کروٹیں بدلتے سمندروں کے کنارے اپنی جیپ میں بیٹھے اُن کے مدھم سحر شور سے مسحور اُنہیں تکتے جاتے تھے.. مینہ رُکنے کا نام نہ لیتا تھا، چھم چھم برستا جاتا تھا..

میں نے دیکھا کہ اس آبنائے کے کناروں پر جو ایک بلندی اُٹھتی ہے اُس میں ایک راستہ ہے جو بارش کی دُھند میں گم دکھائی دیتا ہے جو جانے کہاں جاتا تھا..

''آؤ اس اجنبی کوہستانی راستے پر چلتے ہیں۔'' گونج بولی۔

''جانے یہ کہاں جاتا ہے..''

''جائیں گے تو جان لیں گے کہ یہ کہاں جاتا ہے.. شاید کہیں سمندر میں اتر جاتا ہے۔''

تو ہم اُس بھیگی ہوئی شام میں.. ایک ایسے الاسکن قصبے میں جہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا تھا اُس راستے پر ہو لیے.. اُسے اختیار کر گئے.. بے وجہ اور بغیر کسی جواز کے اُس راستے پر اپنی جیپ ڈال دی.. اور وہ ایک از حد تنگ اور مختصر اور خطرناک راستہ تھا.. نیچے گہرائی میں گلف آف الاسکا کے پانی تاریک ہوتے تھے.. حماقت کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ آخر یہ حماقت کیوں کی..

ہم دم روکے اُس شام کی سیاہی میں ڈر سے سیاہ ہوتے رہے.. اور جب خدا خدا کر کے ہم اُس پُر پیچ اور ہولناک کوہستانی راستے کے اختتام پر پہنچے تو وہاں سوائے ایک جھونپڑے اور ایک فارم ہاؤس کے اور کچھ نہ تھا.. اور اس کے آگے سمندر تھا..

البتہ ایک ذرا سی تسلی ہوئی کہ جب مڑ کے دیکھا تو سیورڈ کا قصبہ گھنی ہریاول اور سمندروں کی گود میں پوشیدہ ایک ہمکتا ہوا بچہ تھا..

اور اس لمحے میں نے ایک بار پھر اپنے آپ سے سوال کیا کہ تم کہاں ہو؟

دنیا کے آخری سرے پر اٹکے ہوئے الاسکا میں.. اور پھر کسی سیورڈ نامی قصبے میں.. اور تم ایک کوہستانی راستے کی خطرناکیوں کے مسافر ہو کر کہاں پہنچ گئے ہو.. بس ایک شام ہے الاسکا میں.. اور تم ہو.. اور گونج ہے..

اس شام میں سرمئی سمندروں کے اندر جانے کیسی کیسی آبی مخلوق اس لمحے کروٹیں بدلتی ہے۔ کیا اُن میں سے کسی ایک وہیل مچھلی، کسی سالمن کو یا ڈولفن کو یہ شائبہ بھی ہے کہ وہاں ایک چاندی رنگ کی جیپ رُکی ہوئی ہے جس میں ایک ادھیڑ عمر پاکستانی بجھتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمارے سمندر کو تکتا ہوگا.. اس شام میں.. اور اُسے یقین نہ آتا ہوگا کہ وہ یہاں ہے.. الاسکا میں..

اور اُس وہیل مچھلی، کسی سالمن یا ڈولفن کو بھی یہ یقین نہ آتا تھا کہ ایک پاکستانی بھی یہاں تک پہنچ سکتا ہے..

اُس سرمئی شام میں گلف آف الاسکا کے سمندر میں سے ایک وہیل تو نہیں، ایک سالمن یا ڈولفن اچھلی اور ڈوب گئی..

○●○●○

بہر طور جانا تھا کیونکہ کروز کے ٹکٹ نا قابل واپسی تھے..

اس متوقع برفانی قربتوں اور سمندروں کے ہیجان خیز سفر کے لیے میں نے کونج کے مشورے کے مطابق اینکر ایج کے "پورگفلس سٹور" سے نیلے رنگ کی ایک ایسی ہوابند جیکٹ خریدی تھی جس میں زپوں کی اتنی بہتات تھی کہ انہیں چڑھاتے اتارتے سانس پھول جاتا تھا اور پھر بھی کوئی ایک زپ کھلی رہ جاتی تھی۔ اگر موسم بھیگنے لگے تو اسے اُلٹا کر بھی پہنا جا سکتا تھا اور پھر وہ ایک تیز زرد رنگ کی برساتی ہو جاتی تھی..

کونج کو تو ایسی جیکٹ کی کچھ حاجت نہ تھی۔ پر میں نے یونہی تصور کیا.. یعنی ایک "تُرکی" ہونے کی حیثیت سے کہ اگر کونج بھی ایک ایسی متعدد زِپوں والی جیکٹ زیب تن کرلے تو کیسی لگے گی.. کچھ بے وقوف سی لگے گی اور یقیناً اُس کی کوئی نہ کوئی زِپ کھلی رہ جائے گی۔

○●○●○

"کونج کی کوئی نہ کوئی زِپ کھلی رہ جائے گی"

بارش جو سیوَرڈ کی پکی سہیلی بن چکی تھی اب ہم سے بھی چُہلیں کرنے لگی کہ دیکھو یہ کوہستانی قصبہ جس کی گود میں ہزاروں بادبانی کشتیاں ڈولتی ہیں، سٹیمر اور کروز شپ لنگر انداز ہوتے ہیں تو اگر اُس کے اوپر ایک ستھرا شفاف آسمان ہوتا اُس میں سے دھوپ اُترتی تو اس کے منظر میں کوئی دُھندلا بھید یا کوئی سحر پوشیدہ نہ ہوتا، یہ ایک واضح اور صاف تصویر کی مانند عیاں ہوتا۔ اس میں کوئی کشش نہ ہوتی تو یہ میں ہوں جس کے بادلوں نے آسمان کو ڈھک لیا ہے اور خاص سُریلے انداز میں ٹپ ٹپ میری بوندیں گرتی ہیں، نواح کے پہاڑوں کو دُھند نے لپیٹ میں لے لیا ہے تو یہ میں ہوں جس نے اس منظر کو خوابناک کر دیا ہے تو تم بھی میرے دوست بن جاؤ۔

ہم نے تو اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے، چونکہ اُس کے پاؤں پانی کے تھے اس لیے اُس کے پاؤں نہ پڑے کہ بی بی بارش.. جیسے زندگی ایک بار آتی ہے ایسے ہم بھی الاسکا میں صرف ایک بار آئے ہیں، دوبارہ آنا نہ ہوگا تو کچھ کرم کرو.. اے ابرِ کرم آج اتنا نہ برس.. ہم بھی تو سیوَرڈ کے کوچہ و بازار کو ذرا دھوپ میں دیکھیں.. اس کے گڑیا گھروں کی رنگین چھتیں کیسے شوخ اور چھیل چھبیلی دکھائی دیتی ہیں اور اُن میں قیام پذیر لوگ جو کھڑکیاں بند کیے آتش دانوں کے سامنے ہتھیلیاں پھیلائے آگ سینکتے ہیں وہ مطلع صاف ہونے پر اپنی کھڑکیاں کھول کر باہر جھانکیں تو ہم اُن کے چہرے دیکھیں کہ جو لوگ اس الاسکن بستی میں گھر بنائے بیٹھے ہیں وہ کیسے ہوتے ہیں اور شاید وہ بھی اپنی بستی میں گھومنے والے ہم اجنبیوں کو دیکھیں کہ یہ کدھر آ نکلے ہیں۔ اے ابرِ کرم کچھ تو توقف کر.. کہ آج ہم نے گلف آف الاسکا میں اُترنا ہے، آج تک جو کچھ نیشنل جیوگرافک کی دستاویزی فلموں میں دیکھتے آئے ہیں اُسے براہِ راست اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے اور ہم نے اس شوق کی خاطر سینکڑوں ڈالر جلا ڈالے ہیں.. اے سہیلی بارش ہم نے آج الاسکا کے گلیشیئرز کو ٹوٹتے پھوٹتے پانیوں میں غرق ہوتے دیکھنا ہے اور اُن کی برفوں میں سے جنم لینے والے سنوف کو اپنے چہروں پر محسوس کرنا ہے.. اور وہیل مچھلیاں، مفن پرندے، ریچھ اور ڈولفن وغیرہ.. پر بارش کمینی نکلی، اُس پر ہماری منت سماجت کا چنداں اثر نہ ہوا، برستی رہی۔

ویسے "مرفی زلونگ شور لاج" کا وہ کوزی، ہر لحہ بدن کو راحت دینے والا، اُسے اپنی سہولتوں سے تھپک تھپک کر سلا دینے کی صلاحیت رکھنے والا کمرہ ایسا تھا کہ ناشتے کے بعد جب میں نے حسبِ عادت دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اُس دن کا پہلا سگریٹ سلگایا تو یہی جی چاہا کہ اس بھیگے ہوئے موسم میں الاسکا کے سمندروں میں سفر کیا کرنا.. یہیں پڑے بھیگے ہوئے موسم کا مزا لیتے ہیں.. اس کمرے میں ہی بند رہتے ہیں کہ ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں.. لیکن کونج نہ مانی.. ہمیں

”گلف آف الاسکا میں ایک رائیگاں سفر، نہ کوئی وہیل نہ کوئی مفن پرندہ“

سیاحتی ادارے کی شہتیروں سے تعمیر کردہ دفتر کے اندر بہت گہما گہمی تھی اور اُس کی سبز چھت پر بوندوں کی رم جھم سمفنی مترنم ہو رہی تھی.. وہاں کا عملہ اگرچہ مستعد تھا لیکن اُن کا رویّہ ہم جیسے پُر اشتیاق اس عظیم الاسکن ایڈونچر پر نکلنے کے چاؤ میں نئی نویلی جیکٹوں اور ٹوپیوں میں ملبوس درجنوں سیاحوں کے ساتھ نہایت میکانکی اور منظم تھا بلکہ کسی حد تک سرد تھا.. جونہی میں نے کاؤنٹر پر اپنا ٹکٹ پیش کیا تو گہری نیلی آنکھوں والی ایک فربہ خاتون نے اُس پر نظر ڈالے بغیر کہا ”سوری.. دے ٹور ہیز بن کینسلڈ..“ اور جونہی میرا منہ اس سوال کے لیے ذرا کھلا کہ کیوں؟ تو اُس نے فرفردہ بیان دوہرا دیا جو وہ اس سے پیشتر درجنوں سیاحوں کے سامنے دوہرا چکی تھی ”گلف آف الاسکا میں غیر متوقع طور پر ایک معمولی درجے کا طوفان آ گیا ہے.. اس کے پانی تلاطم میں ہیں جن میں سٹیمر کو لے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے.. ہم اپنے عزیز گاہکوں کی زندگی عزیز رکھتے ہیں.. آپ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں۔“

ہم پر یہ اطلاع واقعی بجلی بن کر گری..

اس اطلاع میں ہماری آرزوؤں کا انہدام تھا..

آپ مصر میں ہیں اور اہرام نہیں دیکھ سکتے.. نیاگرا آبشار میں مارلن منرو کا بھیگتا بدن دیکھنے کی خاطر طویل مسافتیں طے کر کے آئے ہیں اور نیاگرا تھم چکی ہے.. لاکھ صعوبتوں سے امریکی ویزا حاصل کر کے گرینڈ کینین تک پہنچتے ہیں اور آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ وہ تو کب کی مسمار ہو چکی.. بن ٹھن کر اپنی پہلی ڈیٹ سے ملاقات کرنے کے لیے ایک فٹ پاتھ پر منتظر ہیں تو اُس کا فون آ جاتا ہے کہ اباجی نے میرے کمرے کو تالا لگا دیا ہے، میں نہیں آ سکتی..

”آپ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں..“ اُس نیلی آنکھوں والی موٹی نے ذرا سے توقف کے بعد پھر سے سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔ ”البتہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ آپ ٹکٹ کی نصف قیمت پر چھ گھنٹوں کی بجائے تین گھنٹوں کے ایک ایسے سمندری سفر پر جا سکتے ہیں جس کے دوران ہم گلیشیئرز کے علاقے میں تو نہیں جا سکیں گے کہ وہاں سمندر تلاطم ہے بلکہ ذرا ہٹ کے آپ کو ایک قدرے پرسکون سمندر کی سیر پر لے جا سکتے ہیں.. لیکن ہم یہ گارنٹی نہیں دے سکتے کہ آپ اس سفر کے دوران نزدیک سے آبی حیات کو ڈوبتے ابھرتے دیکھ سکیں گے کہ ایسے تلاطم کے دوران جانور پانی کی گہرائی میں چلے جاتے ہیں.. آگے آپ کی مرضی..“

بیشتر سیاحوں کے دل ڈوب گئے، ایسے ڈوبے کہ انہوں نے ٹکٹ کی رقم وصول کی اور یقیناً کچھ ناروا کلمات بڑبڑاتے نامراد دفتر سے نکل گئے.. لیکن چند ایک سیاح اس پیشکش کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے..

”تمہارے ہاں وہ کیا محاورہ ہے کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی تو چلتے ہیں۔ ویسے اس پیکج میں سالمن مچھلی کا لنچ بھی شامل ہے۔“

”چلتے ہیں۔“ میں بھی چلنا چاہتا تھا۔ بے شک سمندر تلاطم میں تھے لیکن اُن سمندروں میں اتر کر دیکھتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو بات کر کے دیکھتے ہیں۔

سیورڈ کی بندرگاہ کے درمیان میں ایک چوبی راستہ جو پانیوں پر تعمیر شدہ تھا، دور تک چلا جاتا تھا اور اُس کے دونوں جانب سینکڑوں کشتیاں، سٹیمر اور ذاتی بجرے بارش میں بھیگتے ڈولتے تھے..

اور ہم اس چوبی راستے پر بھیگتے چلتے اُس سٹیمر یا کروز شپ تک پہنچے اور جب سیڑھیاں طے کر کے اُس کے عرشے پر پہنچے تو وہاں ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے ایک چرب زبان پروفیشنل گائیڈ ایک جعلی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا منتظر تھا اور مسخرہ ہوا جاتا تھا۔

”ہے لیڈی.. کیا تم نے اپنے دوست مرد کو غور سے دیکھا ہے۔ یقین کرو گلف آف الاسکا میں جو اود بلاؤ ابھریں گے وہ اس کی شکل کے ہوں گے... ہیلو ہینڈسم.. کیا تم مچھلیوں میں دلچسپی رکھتے ہو.. وہی جو ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی ہیں جنہیں تم پکڑنا چاہتے تھے، پر وہ پھسل گئیں.. سَر اپنے آپ کو ایک صدمے کے لیے تیار کر لیجیے.. یہ سٹیمر ڈوب بھی سکتا ہے۔“

جیسے ہمارے ہاں بسوں میں لکھا ہوتا ہے کہ اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو، ہو سکتا ہے یہ تمہارا آخری سفر ہو۔

نہ صرف میں بلکہ اکثر سیاح قطعی طور پر محظوظ نہ ہوئے کہ وہ ہر روز یہی فقرے ادا کرتا سیاحوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا اپنا رزق کماتا تھا۔

سٹیمر کے اندر داخل ہوئے تو گویا یکدم خاموشی کی ایک چُپ میں چلے گئے۔ نہ بارش کی بوندوں کی بوچھاڑ کا شور اور نہ ہی سمندر کی لہروں کی کوئی آواز.. سمندروں پر ڈولتا ایک تابوت تھا جہاں باہر کی دنیا کی کوئی آواز نہ پہنچتی تھی۔

نشستوں کے برابر میں شیشے کی وسیع کھڑکیاں تھیں اور اُن میں ایک بے شور گونگا سمندر دکھائی دے رہا تھا۔

ایک خفیف سا دھچکا لگا اور ہمارا کروز سٹیمر سیورڈ کے ساحل سے جُدا ہو کر گلف آف الاسکا کے سمندروں کی جانب رواں ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد ہم کھلے سمندروں میں تھے۔

اور اس گدلے آسمان تلے، بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان تلے.. اُس آسمان اور سمندر کے درمیان میں بے انت آبی پرندے یلغار کرتے غل مچاتے اڑان کرتے تھے پر اُن کا شور سٹیمر کی کھڑکیوں پر دستک دیتا ہار جاتا تھا اور ہم جو اُس کے اندر ایک مقفل حالت میں ایک سناٹے میں تھے اُن کا شور و غل سننے سے قاصر تھے۔ کچھ سیاح مایوسی کے عالم میں کھڑکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے ایک اونگھ میں چلے گئے اور مجھ ایسے کوئی دو چار اُن کے شیشوں سے ناکیں جوڑے گلف آف الاسکا کے پانیوں کو تکتے رہے کہ شاید ان میں سے کچھ ظاہر ہو جائے۔

اور گونج بے پرواہ تھی۔

ایک سنجیدہ پوتھی بنائے میرے برابر میں لاتعلقی سے بیٹھی تھی۔

''میں ذرا باہر ہو آؤں۔'' میں کچھ ہی دیر میں اکتا گیا۔

''باہر کہاں؟''

''عرشے پر۔''

''عرشے پر..'' اُس نے چونچ چڑھائی۔ ''تمہارا دماغ خراب ہے۔ ایک تو بارش کی بوچھاڑیں اور پھر سمندر کی لہروں کے تھپیڑے.. اور ہوا۔ تم خود ہی تو کہتے ہو کہ اب عناصر میں اعتدال کہاں تو یونہی ڈگمگا کر سمندر میں لڑھک جاؤ گے۔ بیٹھے رہو آرام سے..''

''ہم یہاں آرام کرنے تو نہیں آئے.. گلف آف الاسکا کے سمندروں کو محسوس کرنے آئے ہیں.. میں جا رہا ہوں۔''

''تو جاؤ..'' گونج نے درشتگی سے کہا۔ ''میں دیکھتی ہوں تم عرشے پر کتنی دیر ٹھہر سکتے ہو۔''

میں اپنے کو ثابت قدم رکھتا سٹیمر کے اندرون کے خاموش کنج میں سے نکل کر عرشے پر آیا تو کان بہرے ہو گئے، آنکھیں نمکین پانیوں کی بوچھاڑ سے بھر گئیں.. شرلاتے بھرتی ہوائیں تو میرے گالوں پر طمانچے مارنے لگیں اور کوئی شور تھا، کوئی قیامت تھی، غدر مچا ہوا تھا.. کانوں میں دنیا بھر کے سمندروں کی چنگھاڑ کا شور اُتر تا تھا، سمندر واقعی تلاطم میں تھا اور اُس میں سے جنم لینے والی لہروں کے غضب کی جھاگ سٹیمر پر انڈیلی جا رہی تھی اور وہ یکلخت ایک آبشار کی صورت عرشے پر گرنے لگتیں اور ظاہر ہے اگر کوئی احمق وہاں کھڑا ہو تو اُسے بھی شرابور کر دیتیں جو کہ کھڑا تھا اور شرابور ہوا۔ رہی سہی کسر بارش بدبخت پوری کر رہی تھی اور شاید سمندر کے پانیوں کے ساتھ مقابلے پر اتر آئی تھی.. بارش کی بوندیں نہ تھیں، آبی چھرے تھے جو میرے چہرے پر برستے اُس داغتے تھے..

اور پہلی بار الاسکا کی روائتی سردی نے میری آؤ بھگت کی.. اینکر اتج سے خریدی ہوئی زرد جیکٹ بھی میرے کچھ کام نہ آئی اور میں ناخنوں کی پوروں تک یخ ہو کر ٹھٹھرنے لگا.. مجھے نہایت آسانی سے نمونیا وغیرہ ہو سکتا تھا اور اسے میں نے خود طلب کیا تھا جیسے ایک بار محرم کے دن شدید سردیوں کے دوران آ گئے اور حسب روائت ایک عقیدت مند ٹھنڈے ٹھار شربت کی سبیل لگائے بیٹھے تھے تو ایک میراثی نے قریب آ کر کہا ''لائیے جی نمونیا کا ایک گلاس تو پلائیے۔''

چاہتا تو میں فوری طور پر پسپا ہونا چاہتا تھا لیکن یہ پسپائی میری مردانگی کو ضعف پہنچاتی تھی اگرچہ وہ پہلے سے ہی خاصی ضعف شدہ تھی.. اور گونج نے مجھ پر طنز کا جو وار کیا تھا کہ میں دیکھتی ہوں تم عرشے پر کتنی دیر ٹھہر سکتے ہو تو میں بے شک سردی سے منجمد ہو کر برف کا ایک پتلا بن جاتا، مر جاتا، میں نے گونج کو غلط ثابت کرنا تھا..

چنانچہ میرے دانت کٹکٹاتے رہے.. میرے بدن کے ہر پور میں سردی منجمد ہوتی رہی، میں گلف آف الاسکا میں سے اٹھنے والی لہروں کی آبشاروں میں نچڑتا رہا، عرشے پر بمشکل اپنے آپ کو قائم رکھتا ڈولتا رہا لیکن میں نے اپنے چہرے پر ایک ایسی بے پرواہ مسکراہٹ سجائے رکھی جیسے میں لطف اور انبساط کے ایک جہان میں ہوں، دنیا کے سحر ترین سمندروں کے منظر سے لطف اندوز ہوتا مزے کر رہا ہوں..

میں ذرا لڑکھڑاتا پانیوں کی بوچھاڑوں میں دکھائی تو کچھ نہ دیتا تھا لیکن میں عرشے کی ریلنگ تھامتا سٹیمر کی اُس کھڑکی تک جا پہنچا جس کے شیشے کے پیچھے گونج براجمان تھی.. میں نے اُس کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر شیشے کے ساتھ

ناک لگا کر کچھ مزاحیہ سی شکلیں بنائیں، ہاتھ ہلائے، ہُو ہُو کیا پر اُس کے چہرے پر کوئی پہچان نہ اُتری.. وہ جان بوجھ کر مجھ سے غفلت برت رہی تھی لیکن اُس لمحے نے مجھے ایک یادگار نقش سے ہمکنار کیا.. کھڑکی کے وسیع شیشے پر پانی کی دھاریں اترتی تھیں اور اُس کے عقب میں گونج کا چہرہ بھی ایک آبی شکل ہوا جاتا تھا.. جیسے وہ بوندوں اور دھاروں سے تخلیق کی گئی ہو، کبھی اُس کی سیاہ سحر آنکھیں اُن دھاروں میں تیرنے لگتیں اور کبھی وہ بوندیں اُس کے سفید پروں پر موتیوں کی مانند برسنے لگتیں.. جیسے وہ ایک پرندہ نہ ہو ایک آبی مخلوق ہو..

جب وہ کسی طور متوجہ نہ ہوئی تو میں نے اپنا چہرہ سمندر کے روبرو کر دیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے سٹیمر کے پہلو بہ پہلو کوئی درجن بھر متجسس ڈولفن مچھلیاں ہیں جو زیر آب تیرتی چلی آ رہی ہیں اور اُن میں سے کبھی دو چار ابھرتی ہیں اور پھر ڈبکی لگا جاتی ہیں.. یہ ڈولفن بھی دریائے سندھ کے پانیوں میں سے نمودار ہونے والی اندھی ڈولفن مچھلیوں کی بہنیں تھیں، بیروت کی خانہ جنگی سے جب میں ایک ترک جہاز ''اکڈنیز'' کا مسافر ہو کر فرار ہو رہا تھا تو شاید یہی ڈولفن تھیں جو اچھلتی کودتی، سیٹیاں بجاتی ہمیں الوداع کہہ رہی تھیں۔

تو یہ سفر رائیگاں نہ گیا.. کم از کم الاسکا میں ان انسان دوست ڈولفن مچھلیوں سے تو ملاقات ہو گئی تھی..

کہا جاتا ہے کہ جب بارش اترتی ہے تو ایسے میں ''کنائے فیورڈ پارک'' پر.. کہ جس میں ہم سفر کرتے تھے، ایک دُھندی ٹمٹماتے سمندروں پر اترتی ہے اور ہر شے کو ایک ایسی خاموشی میں لے جاتی ہے جس میں بہت آہستگی سے پانیوں میں اود بلاؤ جنہیں پانیوں کے کتے بھی کہا جاتا ہے اور موٹے ست سیل جنہیں سگ بحری یا سمندروں کے کتے بھی کہا جاتا ہے.. ابھرتے ہیں اور حیرت سے آس پاس دیکھتے ہیں.. یہ کنائے فیورڈ پارک چھ لاکھ ایکڑ کے زمینی اور آبی علاقوں پر پھیلا ہوا ہے جہاں موبی ڈک کے سائز کی وہیل مچھلیاں عام پائی جاتی ہیں، کناروں پر ریچھ اژدہام کرتے ہیں اور چٹانوں پر وہی خوشنما عجوبہ پرندے مفن ہزاروں کی تعداد میں بسیرا کرتے ہیں.. یہ مفن کسی حد تک کبوتر سے ہوتے ہیں لیکن اُن کی چونچ کے آگے زرد رنگ کی ایک جھالر لٹک رہی ہوتی ہے جو انہیں شاید دنیا کا سب سے پیارا اور دلنشین پرندہ بناتی ہے اور گردن کے نیچے ایک تھیلا سا لٹک رہا ہوتا ہے جس میں مفن کم از کم درجن بھر چھوٹے سائز کی مچھلیاں نگل کر سٹور کر لیتا ہے اور کئی روز کے لیے خوراک سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص تھا جان برو.. مصنف تھا آوارہ گرد تھا جانے کیا تھا تو اُس نے کہا تھا کہ الاسکا میں سارے پیمانے غلط ہو جاتے ہیں.. آنکھ ایک فاصلے کو اپنے اندر اتار کر اطلاع کرتی ہے کہ یہ دو میل سے زیادہ نہ ہوگا اور وہ دراصل دس میل ہوتا ہے.. اور یہ گلیشیئر ایک سو فٹ بلند ہوگا اور وہ دو سو فٹ اونچا ہوتا ہے۔

مجھے بار بار موازنہ کرنا پڑتا ہے، ضبط کرتا ہوں لیکن رہا نہیں جاتا.. تو یہ جان برو جو کوئی بھی تھا اگر کبھی پاکستان کے شمال میں آ نکلتا تو اُس کی جان نکل جاتی کہ وہاں آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے تو دراصل کچھ بھی نہیں دیکھتی کہ منظر تو اُس کی بینائی کی سرحدوں سے پار شروع ہوتا ہے اور کوئی گلیشیئر صرف سو دو سو فٹ بلند.. یہ بلندی تو نہ ہوئی پستی ہوئی..

موازنہ بے معنی ہے کہ الاسکا کے گلیشیئر چونکہ امریکہ میں ہیں بقول گونج.. اس لیے عظیم ہیں اور چونکہ ہمارے گلیشیئر پاکستان کے شمال میں ہیں صرف اس لیے کم کمین اور حقیر.. تیسری دنیا والوں کو اپنی پسماندگی کی سزائیں بھگتنی پڑتی

ہے کہ اُن کے سوہنے بھی کوجے ہو جاتے ہیں.. ہمارے یوسف بھی بدشکل ہو جاتے ہیں، اور اُن کے بری بری شکلوں والے بھی گلفام ہو جاتے ہیں۔

جب مجھ میں عرشے پر مزید ثابت قدم رہنے کی کچھ سکت نہ رہی، میں سردی سے نیلو نیلو ہو گیا، ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں.. کی کیفیت ہو گئی تو میں دروازہ بمشکل کھول کر سٹیمر کے اندر چلا گیا اور وہاں وہی ایک بدھ راہب خانے کی خاموشی تھی جس نے میرا استقبال کیا۔ اپنی نشست پر لوٹنے سے پیشتر میں نے واش روم کا رخ کیا اور وہاں جو آئینہ آویزاں تھا اُس میں بھی ایک بھیگا ہوا اودبلاؤ نظر آیا۔ اس اودبلاؤ کے خال خال بال گلف آف الاسکا کے نمکین پانیوں اور بارش کی بوچھاڑوں کی تاب نہ لا کر اُس کی چندیا سے چپک چکے تھے اور آئینے میں جیسے بندیا چمکے گی ایسے چُندیا چمک رہی تھی..

گونج افیونی کو میں نے سونے دیا.. یہ نہیں کہ رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا اور مجھے یار نے یا میں نے یار کو سونے نہ دیا.. ہمارے ایسے نصیب کہاں..

اور جب ہمیں ایک عرصہ بیت گیا اُن بپھرتے سمندروں میں سفر کرتے ہوئے تو وہ لنچ کہ جس کا وعدہ تھا ہمیں مہیا کیا گیا۔ یعنی ہر سیاح کی خدمت میں ایک پیکٹ پیش کر دیا گیا، اُسے چیرا تو ایک قطرۂ خوں نہ نکلا۔ اُس میں سے ایک آدھ آلو، کچھ نامعلوم سی ابلی ہوئی سبزیاں اور کچھ سرخ رنگ کے ریزہ نما قتلے نکلے جن کے بارے میں اطلاع کی گئی کہ یہ سالمن مچھلی ہے۔

ہم اس تلاطم کے شور میں بہتے ہوئے ایک ایسی خلیج کے اندر گئے جس کے دونوں جانب کائی زدہ چٹانوں کی دیواریں کھڑی تھیں اور یہاں پانی پرسکون اور ٹھہرے ہوئے تھے.. اور ہم اس آس میں تھے کہ شاید ان چٹانوں میں ہمیں کوئی ایک آدھ مفن پرندہ ہی دیکھنے کے لیے مل جائے اور ہم کل کلاں ڈینگیں مار سکیں کہ ہاں ہم الاسکا گئے تو.. صرف ایک آدھ مفن پرندہ ہی دیکھنے کو مل جائے اور پھر ہم انہیں اپنے خوابوں میں بے شمار کر لیں گے.. لیکن یہ معصوم سی آرزو بھی پوری نہ ہوئی.. ویسے تو گونج مجھے پہلے سے خبردار کر چکی تھی کہ ان سیاحتی اداروں کے فریب میں مت آنا.. ان کے پمفلٹوں پر یقین نہ کرنا.. الاسکا میں تحیر کے کرشمے اپنی جگہ لیکن اسی مہینے میں تمام مفن پرندے یہاں کے متوقع سرد موسموں سے بچاؤ کی خاطر ہجرت کر جاتے ہیں..

ہم پورے تین گھنٹے گلف آف الاسکا کے پانیوں کو خواہشوں کی چھلنی میں چھانتے رہے پر مجال ہے ہمیں کچھ حاصل حصول ہوا ہو.. کوئی چھوٹا سا اودبلاؤ بھی اگر چھلنی کی سطح پر حیران بیٹھا نظر آ جاتا تو ہمارے ڈالر پورے ہو جاتے..

ہمارا سٹیمر ایک ناکام شکاری کی مانند شرمندہ سا سیوارڈ کی بندرگاہ میں داخل ہونے لگا..

شباب ختم ہوا، اک عذاب ختم ہوا..

''ہم کہاں ہیں..'' گونج بیدار ہو گئی۔

''نہ ہم کہیں گئے اور نہ کہیں ہم آئے.. پہنچی وہیں پہ خاک.. ہم سیوارڈ میں ہیں..''

○●○●○

''آج کی رات مایوسی کو اپنے اندر تحلیل مت ہونے دو''

''تم کچھ تو کھاؤ.. کیا ایک انجان سا سُوپ تمہارے لیے کافی ہوگا''

مجھے گونج زچ کر دیتی تھی، میں اکثر چڑ جاتا تھا کہ وہ میری خوراک پر نظر رکھتی تھی اور ڈانتی رہتی تھی کہ تم نے دوپہر کو صرف ایک سینڈوچ کھایا تھا تو اب میں کہہ رہی ہوں کہ تم ایک سٹیک کھاؤ گے تو کیوں نہیں کھاتے.. صرف سُوپ نہیں پیو گے.. بھئی میرا نہیں جی چاہ رہا کچھ بھی کھانے کو تو مجھے کیوں مجبور کرتی ہو.. میں اکثر صرف اُس کی رنجش کے ڈر سے کچھ نہ کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی کھا لیتا تھا..

''ہاں.. یہ سُوپ کافی ہے.. مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تم غم کرتے ہو..'' وہ ہمدرد ہو گئی۔ ''اگر آج سمندر میں تلاطم کے باعث ہم وہ کچھ نہیں دیکھ سکے جو نیشنل جیوگرافک کی دستاویزی فلموں میں یا الاسکا کے سیاحتی کتابچوں میں ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم مایوسی میں کھانا پینا ہی ترک کر دو.. تم سُوپ کے بعد کچھ نہ کچھ کھاؤ گے..''

''کرسٹوز پارلر'' اطالوی ریستوران کا وسیع ہال بھائیں بھائیں کرتا ویرانی کے عالم میں تھا.. بار کاؤنٹر پر دو چار لوگ بیٹھے چلبلے ہونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے اور تین چار میزوں پر بیٹھے کچھ سیاح اپنی خوراک سے لطف اندوز ہونے میں ناکام ہوتے دکھائی دے رہے تھے.. مجھے یقین ہے انہیں بھی آج کوئی ایک وہیل مچھلی یا مفن پرندہ نظر نہ آیا تھا..

''اداسی اور مایوسی کو اپنے بدن کے اندر تحلیل نہ ہونے دینا، یہ تمہیں دیمک کی مانند چاٹ جائے گی، زندگی صرف گلف آف الاسکا میں نمودار ہونے والے آبی جانوروں اور مفن پرندوں سے ہی عبارت تو نہیں... تمہیں تو یہ قدرت حاصل ہے کہ تم اپنے تصور کے سمندروں میں سے جو جی چاہے نمودار کر سکتے ہو.. دو چار نہیں لاکھوں مفن پرندے تخلیق کر سکتے ہو جو گلف آف الاسکا کے گرد چٹانوں میں پھڑ پھڑاتے مفن پرندوں سے کہیں زیادہ رنگین اور خوشنما ہو سکتے ہیں تو آج کے سفر کی رائیگانی کو اپنے دل پر مت لگاؤ.. سیوارڈ میں یہ ہماری آخری شب ہے.. کل سویرے ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے تو آج کی شب اداسی اور مایوسی کو اپنے بدن کے اندر تحلیل نہ ہونے دینا۔''

''نہیں، مجھے کچھ ایسا قلق تو نہیں، اگر میں نے اس سمندری مسافت کے دوران درجن بھر دوست ڈولفن مچھلیاں دیکھ لیں اور.. تمہیں دیکھ لیا تو مجھے کوئی ایسا پچھتاوا نہیں۔''

''مجھے؟'' گونج نے اپنی گھنیری آنکھیں جھپ جھپ جھپکائیں ''مجھے تو تم ہمہ وقت دیکھتے ہو۔''

''لیکن جیسا آج دیکھا، کبھی نہ دیکھا.. جب میں عرشے پر ڈولتا بارشوں اور سمندروں کی بوچھاڑوں کی زد میں تھا تو مجھے تمہارا چہرہ سٹیمر کی گول کھڑکی کے عقب میں خوابیدہ اور اُس میں یوں فریم شدہ نظر آرہا تھا کہ اُس پر نمکین پانی کی دھاریں ہولے ہولے بہتی تھیں اور مجھے ایک لحظہ کے لیے محسوس ہوا کہ تم بھی ایک آبی جانور ہو، پانی کی مخلوق ہو، تمہاری سوئی سوئی آنکھیں بارش کی بوندوں میں راستہ تلاش کرتی بھٹکتی پھرتی تھیں..''

''ایک دائمی رومینٹک..'' گونج کی سیاہ سحر آنکھوں میں وہ سرخ ڈورے تیرتے تھے جو کسی بھی صنفِ نازک کی آنکھوں میں تب ہی تیرتے ہیں جب وہ اپنے سراپے کی توصیف سے خوش ہو کر لجانے لگتی ہے..

بے شک یہ کہنا آسان ہے کہ اداسی اور مایوسی کو اپنے بدن میں تحلیل نہ ہونے دینا، یہ دیمک کی مانند تمہیں چاٹ جائیں گی لیکن جب یہ تم پر اُتر آئیں تو ان کے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی جاسکتی کہ خبردار تم نے اس کے پار نہیں جانا.. وہ جو اصل الاسکا تھا وہ میرے ہاتھوں سے ایک سالمن مچھلی کی مانند پھسل گیا تھا.. زندگی بے شک آبنائے الاسکا میں نمودار ہونے والے آبی جانوروں سے عبارت نہ تھی.. جیسے چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا.. اور اس کے باوجود زندگی عبارت تھی، خوشی سے تعلق تھا.. اگر آپ ''پاک سرائے'' کی کوہ نوردی کے بعد اور آپ گھر سے صرف ایک جھیل کرومبر کو تلاش کرنے کے لیے نکلے ہوں اور وہ وہاں نہ ہو.. بالتورو کے گلیشیئر پر جان جوکھوں میں ڈالتے چلے آپ کنکورڈیا پہنچیں اور وہاں شاہ گوری نہ ہو تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اداسی اور مایوسی کو آپ اپنے بدن میں تحلیل ہونے سے روک سکیں۔

گونج کی سوئی خوراک پر اٹکی ہوئی تھی ''تم نے سٹیمر پر نہ ہی سالمن مچھلی کے لنچ کو رغبت سے کھایا تھا اور تم نے اپنا سُوپ بھی ختم نہیں کیا تو.. بھوکے مرجاؤ گے۔''

''اب خود ہی مرنے کی باتیں کرتی ہو۔''

''تم کیسے منتقم مزاج شخص ہو.. یاد رکھتے ہو، بھولتے نہیں۔ ایک ناممکن شخص ہو، چلو یہاں سے چلتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''اپنے مرفی لاج کی آسائش میں کہ بارش ابھی تک گرتی جاتی ہے۔ میں تمہارے لیے وہاں ایک پنیر آملیٹ تیار کروں گی اور سلگتی ہوئی کافی کے ساتھ تمہیں زبردستی کھلاؤں گی۔''

''نہیں.. وہاں نہیں.. کہیں اور چلیں۔''

''کہاں؟''

''کہیں بھی..''

○●○●○

''ایگزٹ گلیشیئر کی رات میں.. کروٹیں بدلتے زرد اژدھے''

وہی راستے، وہی منزلیں ہیں..

تب ایک ابر آلود آسمان تلے ایک دوپہر تھی اور اب زمین اور آسمان تاریکی کے وصل میں گُم تھے... گئی رات تھی..

جیپ کی ہیڈ لائٹس کی زد میں روشن ہوتا وہی جانا پہچانا راستہ تھا جو ایگزٹ گلیشیئر کی جانب جاتا تھا.. آس پاس اتنی اتھاہ تاریکی تھی کہ اُن ہیڈ لائٹس کی روشنیوں کو بھی بجھاتی لگتی تھی.. مُہیب جنگل ہم پر یلغار کرتے اُمڈتے آتے تھے۔

جہاں دن کو بھی شب کی سیاہی کا سماں ہوتا تھا وہاں شب کی سیاہی میں کیسا سماں ہوگا.. گھپ اندھیرے کی نابینائی کا سماں ہوگا..

بارش ایک زبردستی کی سہیلی.. ساتھ نہ چھوڑتی تھی..

ہم بالآخر اُس پارکنگ لاٹ میں گئی رات شب کے اندھیاروں میں داخل ہوئے جہاں زرد پتوں کے ڈھیر ذرا سی ہوا کے چلنے سے ذرا سمٹتے، ایک زرد اژدھے کی مانند کروٹیں بدلتے سرسراتے تھے.. اور جہاں سے ایگزٹ گلیشیئر تک کی پیدل مسافت کا آغاز ہوتا تھا..

جیپ رک گئی..

اور اُس کی چھت پر برستی بوندوں کی آواز بلند ہوگئی.. آس پاس الاسکا کی رات کے سناٹے میں جو چپ تھی اُس میں بوندوں کا شور تھا..

اگر اس رات میں بارش ہماری سہیلی ہمارے ساتھ مسلسل نہ چلی آتی تو یقیناً ہم جیپ سے اُتر کر اُس راستے کو اختیار کرتے ایگزٹ گلیشیئر کا رُخ کرتے جہاں ریچھوں کی آمد کا احتمال تھا.. لیکن بارش باہر نکلنے نہ دیتی تھی.. ہمیں جیپ کے اندر قید رکھتی تھی۔

ہیڈ لائٹس آف ہوئیں تو ہم جیسے تاریک سمندروں کی تہوں میں ڈوب کر نابینا ہوگئے..

اور یوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے..

گونج اپنی گزشتہ حیات کی اڑانوں میں خواب ہوئی اور میں اپنی مٹی کی مہک کے لیے ترستا، بے گھر اور پردیسی ہوگیا.. وطن سے دوری اور اتنی دوری کہ جیسے میں زمین کے مدار سے نکل کر خلاؤں میں بھٹکتا پھرتا ہوں.. اگر مجھ میں بھی گونج کی مانند طاقتِ پرواز ہوتی تو اتنی تو نہ ہوتی کہ میں ایک ہی اڑان میں گھر پہنچ جاتا اور اس کے باوجود کوشش

کرتا بے شک راستے میں پڑتے سمندروں میں گر کر ڈوب جاتا، صحراؤں کی ریت مجھے جلا ڈالتی، کہیں دم توڑ دیتا۔ جیسے عطار کے ہزاروں پرندوں نے سچ کی تلاش کے سفر کے دوران راستے میں دم دے دیا تھا..

"چلیں؟"

میں چونک گیا..

میرے سوا اور کون ہے..

بلکہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں..

اور میں کبھی لاجواب نہیں ہوا سوائے اُس شخص سے کہ جس نے پوچھا ہو کہ تُو کون ہے..

ایگزٹ گلیشیر کی پارکنگ لاٹ کے فرش پر بکھرے زرد پتے بارش کی تیز بوندوں کی بوچھاڑ میں ہوا کے چلنے سے بھی کروٹیں نہ بدلتے تھے، وہ فرش کے ساتھ چپک گئے تھے..

"واپس چلیں؟" پھر آواز آئی.. اور اُسی لمحے کُونج تاریکی کے پردے میں سے مدھم سی ظاہر ہوئی۔ وہ اپنی اڑانوں سے لوٹ آئی تھی۔

"ابھی کچھ دیر ٹھہرتے ہیں..."

"نہیں چلتے ہیں.. مجھے ایسی گھپ تنہائی سے ڈر لگ رہا ہے.. جانے ہمارے پاس جو تمبر کے کرشمے گھنے جنگل ہیں اُن میں کیسے کیسے شکاری ہماری گھات میں ہیں۔"

"میں تو صرف ایک شکاری سے آگاہ ہوں جو میری گھات میں ہے.. اور اُسے مجھے شکار کرنے کے لیے الاسکا کی اس سیاہ شب کی اوٹ میں سے آنے کی کچھ حاجت نہیں.. وہ کسی رات سوتے ہوئے، کسی سویر شیو کرتے ہوئے، کسی بھری دوپہر میں، ٹریفک کے ہجوم میں، دوستوں کی محفل میں بھی آ سکتا ہے.. اُس نے بہر طور آنا ہے کہ ہر نفس نے اُس کی آمد کا ذائقہ چکھنا ہے.."

کُونج نے کچھ پل خاموشی اختیار کی اور پھر خفا ہو کر نہیں محبت کی قربت میں ہو کر بولی "تم نہ صرف ایک ازلی رومینٹک ہو بلکہ اُس سے کہیں بڑھ کر ایک ازلی قنوطی بھی ہو.. پھر وہی فنا کے قصے چھیڑتے ہو.. بے شک یہ سیورڈ میں ہماری آخری رات ہے لیکن کل شب تک ہم پھر ٹوک میں ہوں گے اور بے شک وہ الاسکا میں ہماری آخری رات ہوگی لیکن یہ ہماری مسافت کا اختتام نہ ہوگا.. ہم اگلی سویر امریکہ کی سرحد عبور کر کے پھر سے کینیڈا میں داخل ہو جائیں گے، ٹیلر روڈ اور پوکر کریک کے راستے نہیں بلکہ وہاں سے ذرا اوپر بیور کریک کی سرحدی چوکی سے.. اور تم مجھ پر اعتماد کرو کہ تب ہم ایسے ہی جنگلوں میں سفر کریں گے جو ابھی تک نادیدہ ہیں اور ایسی جھیلوں تک پہنچیں گے جن کے پانیوں کو آج تک کسی نے نہیں چھوا.. یاد ہے تم نے ٹسلن کے موٹل میں ایک رات بسر کرنے کی کتنی آرزو کی تھی تو ہم وہاں ٹھہریں گے اور پھر پانچ روز کے سفر کے بعد وینکوور میں سے گزر کر "آسمان کو اچھتی شاہراہ" کے مسافر ہو کر وِسلر کے کوہستانی قصبے میں شب بسر کرنے کے بعد بالآخر وکٹوریا کے کینیڈا بھر میں بیٹیف کے بعد سب سے دل نشین ساحلی قصبے میں وارد ہوں گے اور وہاں مستنصر.."

"اور وہاں..."

"اور وہاں ایک آبی پرندہ میرا انتظار ہوگا۔"

"تم یہ کیسے جانتی ہو؟"

"میں اُس کی کوک اور چیخ و پکار سن سکتی ہوں کہ وہ وکٹوریا کے آسمانوں پر ایک مدت سے میری آمد کا منتظر ہے۔"

"اور تم.. اُس کے ساتھ چلی جاؤ گی؟"

"ہاں.. میرا تمہارا کچھ جوڑ نہیں.. پرندے کسی انسان کے ساتھ تو عمر بھر نہیں رہ سکتے، وہ کبھی نہ کبھی اپنے کسی ہم جنس کے ساتھ اڑان کر جاتے ہیں.. مجھے وکٹوریا پہنچ کر اڑ جانا ہے۔"

کیسی بے دید کُونج تھی، اتنی طویل سفری رفاقتوں کا بھی کچھ لحاظ نہ کرتی تھی اور اُس کے لہجے میں کچھ پشیمانی نہ تھی، کیسی بے وفا کُونج تھی.. میں تو اکثر کہا کرتا ہوں کہ اس زندگی میں مجھ سے صرف میری رائٹنگ ٹیبل، سفید کاغذوں اور میرے قلم نے مجھ سے وفا کی، باقی سب ساتھ چھوڑ گئے تو یہ ایک مرتبہ پھر درست ثابت ہو رہا تھا..

جیپ کی چھت پر برستی بوندوں کا شور یکدم تھم گیا.. ہر سُو سناٹا چھا گیا.. میں نے جیپ کے دروازے کو دھکیلا اور باہر آ گیا... سرد ہوا کے بوسے میرے رخساروں پر ثبت ہونے لگے.. اور اُن میں جو گیلاہٹ تھی وہ میرے ہونٹوں پر اترنے لگی.. میرے بدن کے چنار میں زوال کی جو آگ بھڑک رہی تھی اُسے اس ہوا کے نم آلود ہونٹوں نے ٹھنڈا کر دیا اور میں آزادی اور سرخوشی کی ایک ایسی خمار آلود کیفیت سے دوچار ہوا کہ مجھے اپنے وطن سے دوری کا غم بھول گیا.. میں اپنی مٹی کی مہک کو بھلا بیٹھا کہ یہ تو ذہنی اور نفسیاتی زنجیریں ہیں جو ایک انسان کو کسی ایک خطے اور وطن سے باندھے رکھتی ہیں ورنہ ہر ملک، ملک ما است کہ ملک خدائے ما است.. تو یہ ملک الاسکا بھی میرا ملک تھا.. میں اپنے ہی وطن میں تھا..

بے شک فنا کا شکاری میری گھات میں تھا لیکن وہ کب کی بوڑھی ہو کر سنہری بالوں والی مرچکی گلوکارہ ڈورس ڈے میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھی کہ.. کِے سرا.. سرا.. جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا، ہم مستقبل کو نہیں دیکھ سکتے، جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا..

تو جو ہونا ہے اُس سے پیشتر اُس کا غم کیا کرنا.. ہونی نے ہونا ہے تو پھر زندگی سے الگ کیا ہونا.. جو ہونا ہے ہو جائے گا..

○●○●○

"گھاس میں تیرتے راج ہنس"

ابھی تک بادلوں میں رُوپوش آسمان کے نیچے اور شکر ہے کہ اُس میں سے بوندیں نہ اُترتی تھیں رواں شاہراہ کے کناروں پر ایک ایسا جوہڑ تھا جس میں اُسی نسل کی بُوٹی اُگی ہوئی تھی جیسی کسی زمانے میں گکھڑ منڈی کے بڑے جوہڑ کی گدلی سطح کو اپنے انباروں سے ڈھانپتی تھی اور اُس خودرو، تیزی سے پھیلنے والی بُوٹی کی کوکھ میں سے جب اُس جوہڑ پر سردیوں کے موسموں میں برف کی ایک پتلی تہہ جم جاتی تھی تو کاسنی رنگ کے کمیوں کے پھول ظاہر ہوتے تھے..لیکن یہ والا جوہڑ گکھڑ منڈی میں نہ تھا بلکہ سیورڈ سے نکلنے کے بعد تقریباً چالیس کلومیٹر کی مسافت کے بعد یکدم ہمارے بائیں جانب پھیلنے لگا تھا..پس منظر میں زرد جنگل تھے اور اُن سے بلند برف کے آثار جگمگاتے تھے..

اُن برف آثار پہاڑوں کے عکس اُس جوہڑ کے پانیوں پر سفید ہوتے تھے..

اور اُس جوہڑ کی سطح پر دو راج ہنس تیر نہیں رہے تھے، ساکت اور بے جان لگتے تھے جیسے وہ آرائشی مجسّے ہوں جنہیں پانیوں پر نصب کر دیا گیا ہو..جی ہاں یہ وہی مقام تھا گزر رہے تھے ہم جہاں سے..وہی جگہ تھی..جب یہ راج ہنس مجھے گھاس میں تیرتے دکھائی دیے تھے..شاید وہی راج ہنس تھے یا شاید اُن کی جگہ دو اور آ گئے تھے

جوہڑ کے پانیوں پر برف آثار چوٹیوں کی سفیدی تصویر ہوتی تھی اور لگتا تھا کہ وہ راج ہنس برف پر براجمان ہیں..

ہم رُک گئے تھے..

سیورڈ کی نمکین ہوا میں سینکڑوں غُل مچاتے آبی پرندوں کا شور گھلتا تھا..اس کی بندرگاہ میں قطار اندر قطار بادبانی کشتیاں اور سٹیمر سمندر میں ڈولتے تھے..وہی سمندر جس کی جھولی میں ہمارے لیے کوئی ایک وہیل مچھلی، کوئی ایک بے وقوف سا اود بلاؤ بھی نہ تھا اور نہ ہی اس کے کناروں پر اُمڈتی چٹانوں پر ہمارے لیے کوئی ایک مفن پرندہ تھا..

ہم بہت دل گرفتہ اور بجھے دل سے سیورڈ سے نکلے اور پھر ہمیں شاہراہ کے کناروں پر ایک جوہڑ میں معلق وہ سفید شہزادے راج ہنس نظر آ گئے..

اور جب ہر درخت سرسبز نظر آتا ہے اور ہر بطخ ایک راج ہنس..تو جیسی تو تھی ہی ایک راج ہنس تو وہ جانے مجھے کیا دکھائی دی..

اور یہ جو شاہراہ کے کنارن کے جوہڑ کی سطح پر ساکت تھے یہ بھی تھے ہی راج ہنس تو جانے وہ مجھے کیا دکھائی دیے..

یہ طے ہو چکا تھا کہ ہم آج شب اُس ویران آسیب زدے قصبے ٹوک میں گزاریں گے اور وہاں تک کا فاصلہ کچھ زیادہ مسافت کا نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے شاہراہ سے الگ ہو کر الاسکا کے ایک اور خوش نظر سمندری قصبے وٹیئر میں کچھ وقت گزارنے کا قصد کیا..والڈیز اور ہومر کے علاوہ یہ وٹیئر ایسا ساحلی قصبہ تھا جس کی خوش فریبی کی بہت دھوم تھی..

وٹیئر تک پہنچنے کے لیے ہمیں پہاڑوں کی تہہ میں کھوج کرتی ایک طویل سُرنگ میں سے گزر کر پار جانا تھا اور ہم گاڑیوں، ٹریلروں اور کاروانوں کی ایک طویل قطار میں ایک مدت تک ساکت رہے..سُرنگ کے پار جانے کا خاصا مہنگا جرمانہ ادا کر چکے اور انتظار کرتے رہے جب ہمیں اطلاع کی گئی کہ کوئی نہایت وسیع اور بھاری بھرکم بارہ سنگھا جانے کیسے اس سرنگ کے اندر جا کر ڈھیر ہو گیا ہے اور جب تک اُس مقدس بارہ سنگھے کی لاش بصد ادب و احترام وہاں سے ہٹا نہیں لے جاتی تب تک ٹریفک رواں نہ ہو گی اور کیا پتہ یہ شام تک رواں نہ ہو تو ہم وٹیئر یاترا کو ترک کر کے اپنے ادا کردہ بیش قیمت ڈالر گنوا کر جیپ موڑ کر پھر سے مرکزی شاہراہ میں چلے آئے..

اور جب میں اُن منظروں کو جن میں برف کی سفید جھالریں چوٹیوں سے اُترتی تھیں اور وہ راج ہنس اُن کی برفیلی سفیدی میں معلق تھے، اپنے کیمرے میں قید کر کے جیپ کی جانب لوٹا تو میں نے گونج کو نظر بھر کے دیکھا..

اور وہ بھی مجھے ایک راج ہنس دکھائی دی..

"کیا تکتے جا رہے ہو؟" اُس نے ایک طویل اور بوسیدہ جمائی لی "اگر تم نے جی بھر کے اُن راج ہنسوں کو دیکھ لیا ہے تو ہم چلیں..ہمیں ٹوک پہنچنا ہے۔"

"کیا ہم ٹوک کی آسیب زدگی سے آنکھیں چرا کر کسی اور قصبے میں رات نہیں کر سکتے؟"

"تمہارے مشرقی اوہام تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اگر تم الاسکا کی گائیڈ بک کو ذرا غور سے پڑھو تو وہاں جنگلوں میں پوشیدہ ایک عجیب قیام گاہ کی نشاندہی کی گئی ہے..اور اُس کا نام "کلفٹ آن دے راک" یعنی "چٹان میں شگاف" ہے اور یہ قیام گاہ جس ٹوک سے تم ڈرتے ہو، وہاں سے باہر تقریباً دو میل کے فاصلے پر الگ تھلگ ہے..کیا تم آج کی شب ایک چٹان کے شگاف میں بسر کرنا نہیں پسند کرو گے.."

○●○●○

''اگر میں نوح ہوتا تو میری کشتی اس الاسکن پہاڑ پر جا ٹھہرتی،،

اب پھر سمندر رفیق تھا، اُسی طور نیلا لا اور بے رنگ اور یہ کیا ہے کہ یہاں بھی ایک مقام پر ''بلوگا وہیل پوائنٹ'' لکھا تھا یعنی یہ بلوگا وہیل ادھر کثرت سے پائی جاتی تھیں جو ہر دوسرے قدم پر ملتی تھیں..

''نہیں۔'' کونج بولی..

''نہیں کیا؟''

''یہ کوئی اور ''بلوگا وہیل پوائنٹ'' نہیں ہے وہی ہے جہاں سے گزر کر ہم سیوارڈ گئے تھے۔ہمیں واپس اینکر ایج کے قریب تک جانا ہوگا اور پھر وہاں سے ہم ایک ذیلی سڑک پر مڑ کر ٹوک کی مسافت اختیار کر لیں گے، اور یہ راستہ اُس سے جدا ہوگا جس راستے سے ہم ٹوک سے فیئر بینک آئے تھے..نقشہ چیک کرو..''

اور واقعی ہم اُلٹے قدموں اینکر ایج کے نواح میں پہنچے اور پھر ایک ایسی شاہراہ پر مڑ گئے جس پر صرف ہم ہی مُڑے.. بقیہ ٹریفک ناک کی سیدھ میں سیدھی چلی گئی۔یوں تو الاسکا ہائی وے پر بھی ٹریفک برائے نام ہوتی ہے لیکن اگر آپ اسے ترک کر کے کسی اور راستے کو اختیار کرتے ہیں تو یوں جانئے کہ آپ خلاء کے مسافر ہو گئے اور خلاء میں جتنی بھی ٹریفک ممکن ہے بس اتنی ہی ہوتی ہے..ایک مدت بیت جاتی ہے یہاں تک کہ آپ اس یقین کے اسیر ہو جاتے ہیں کہ دراصل ہماری جیپ کے علاوہ ابھی تک کوئی اور گاڑی، ٹریلر، ٹرک یا ویگن ایجاد نہیں ہوئی..ایجاد ہوئی ہوتی تو نظر نہ آ جاتی..اور جب کبھی ایک طویل مسافت کے بعد کوئی کار وغیرہ نظر آتی ہے تو آپ کا جی چاہتا ہے کہ اُسے روک کر اُس کے ڈرائیور کی بلائیں لیں، اُس کار کو خوب خوب دیکھیں کہ کیا پتہ دوبارہ کبھی یہ شے دیکھنے کو ملے یا نہ ملے..البتہ مکمل تنہائی میں سفر کرنے سے ایک اور کیفیت جنم بھی لیتی ہے کہ اگر ایک عرصے کے بعد کوئی کار یا جیپ نظر آ جائے تو آپ اس سے خفا ہو جاتے ہیں کہ تم کس سلسلے میں چلی آتی ہو..تنہائی کی اس وسیع سلطنت میں جو کہ ہماری ملکیت ہے تمہیں کیا حق ہے دخل اندازی کا..

خلاء میں سفر کرنے میں یہی خرابی ہے کہ انسان کسی اور کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہم مرکزی شاہراہ سے الگ ہوئے ہیں تو پھر اللہ ہی اللہ..کیا کمال کے لوگ ہیں کہ صرف ہماری جیپ کے لیے ان ویرانوں میں انہوں نے ایسی شاندار سڑک بچھادی ہے..

ٹوک جانے والی یہ ذیلی شاہراہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک وسیع خلاء تھی جس میں ہماری جیپ ایک

سپیس شٹل کی مانند چلی جاتی تھی لیکن اس خلاء میں منظروں کی اُن دیکھی کہکشائیں اور کائناتیں گردش میں تھیں..ایسے ستارے تھے جن کی روشنی ابھی تک زمین پر نہ پہنچی تھی لیکن ہم اُن کے روبرو انہیں دیکھ رہے تھے..میں اُن مناظر کی کہکشاؤں اور کائناتوں کے حسنِ حیرت انگیز اور اُن کے رنگوں کی دلکشی بیان میں لانے سے قاصر ہوں..میں الاسکا کی لینڈ سکیپ کو لفظوں میں بیان کرتے کرتے اب مکمل طور پر تہی دامن ہو چکا ہوں..اور اپنا دامن جھاڑتا ہوں..وہ کشکول جو عبارتوں اور توصیفی حروف سے لبریز تھا اب خالی ہو چکا تھا اُس میں اظہار کا کوئی ایک سکہ بھی نہیں کھنکتا جسے میں اپنے بیان کے بازار میں چلا دیتا..ہم اُس روز حیرتوں کی جن جہانوں کی یکتائی میں سے گزرے اور حیرتوں میں گم گزرے وہ سب میری ناداری کے باعث ان کہے اور ان دیکھے رہ جائیں گے...میں اُن کی ایک جھلک بھی آپ کو دکھانے سے قاصر ہوں..

الاسکا کے سفر کے دوران اگرچہ میری آنکھیں جا بجا ٹھہریں..اُن پر ٹیلر روڈ کے سحر ٹھہرے..ایسے دریا جو تحیر کے کرشموں کی بھڑکتی سرخ آگ میں بہتے تھے تصویر ہوئے..ماؤنٹ میکنلے کی برفیں سا گئیں ہوئیں لیکن اب جا کر یہ کھلا کہ مجھے اپنی آنکھیں اب تک بند رکھنی چاہیے تھیں تا کہ اُن پر الاسکا کی کوئی ایک تصویر نقش ہوتی تو یہ ہوتی..

اُس ویران خلاء میں ایک برف پوش پہاڑ تھا..

جیسے تُرکی کے قصبے ڈوگ بایزید سے نظر آنے والا نوح کا پہاڑ کوہِ آرارات ہو..

جیسے راکاپوشی کا ایک مدمقابل ہو اور اُس پر سبقت لے جاتا ہو..

جیسے حسن بن صباح کی جنت کا ایک برفانی گوشہ ہو..

وہ ایک برف پوش کوہِ طور تھا اور اگر الاسکا میں کبھی کسی پیغمبر کا ظہور ہوا تھا تو وہ یقیناً اس کی چوٹی پر آگ لینے کے لیے نہیں، برف لینے کے لیے گیا ہوگا..

وہ کبھی شاہراہ کے عین سامنے ایک جوگی کی مانند براجمان نظر آنے لگتا جو صدیوں سے گیان دھیان میں گم تھا اور اُس کے سر پر برف کی ایک دستار تھی اور کبھی وہ سرکتا ہوا بائیں جانب ہوتا ہولے ہولے اتنی دور پر چلا جاتا کہ ایک آؤٹ آف فوکس تصویر کی مانند مدھم مدھم نظر آنے لگتا کہ ہمارے اور اُس کے درمیان سینکڑوں کلومیٹر کی دوری کے فاصلے حائل ہونے لگتے اور ان طویل فاصلوں میں لاکھوں شجر سب کے سب زرد پیراہنوں میں رُوبہ خزاں تھے..اور سینکڑوں ندیاں اور دریا تھے جو اس کے دامن میں بہتے تھے اور وہ سب کے سب ہمیں دکھائی تو نہ دیتے تھے پر وہ وہاں تھے اور کہیں ان ندیوں کے آگے گھنے جنگلوں کی رکاوٹیں آتی تھیں تو وہ جھیلوں کی شکل اختیار کر لیتی تھیں جن کی پُرسکون سطح پر وہ خزاں آلود شجر یوں بچھتے تھے جیسے وہ اُن کے پانیوں میں سے جنم لے رہے ہوں..بے شک اس مسافت الاسکا کے دوران درجنوں نہیں سینکڑوں برف بلندیاں دلپذیر اور نظر نواز ہوئیں جن میں بلند ترین ماؤنٹ میکنلے تھی لیکن یہ سب پاکستان شمال کی برفیلی بلندیوں کے سامنے پانی بھرتی تھیں، اُن کی حقیر کنیزیں تھیں..وہ اُن کے سامنے پل بھر نہ ٹھہر سکتی تھیں..

زلفاں دے چھلّے نیں چھلّے

سارا جگ سوہنا اے..
میرے ماہی دے تھلّے نیں تھلّے..

یعنی زلفوں میں کیسے گھنگریالے سحر ہیں.. بے شک سارا جہان سوہنا ہے لیکن میرے محبوب کے سامنے ہیچ ہے، ہیچ ہے.
یوں الاسکا کی سب کی سب برف بہار سر بفلک بلندیاں میری محبوب شاہ گوری اور نانگا پربت تو کیا صرف ایک ہراموش یا لاٹوک کے سامنے ہیچ تھیں..

لیکن یہ جو ایک برف انبار پہاڑ سینکڑوں کلومیٹر کے ہموار ویرانوں میں سے بلند ہو رہا تھا یہ مجھے ڈگمگا رہا تھا.. وہ ایک بھکشو پہاڑ تھا جو کیسری لبادے کی بجائے ایک سفید لبادے میں ملبوس تھا، جیسے چولستان میں کچھ ایسے ریتلے ٹیلے ہوتے ہیں جو ہواؤں کی شدت سے سرکتے اپنے مقام بدلتے رہتے ہیں اور اُنہیں بھکشو ٹیلے کہا جاتا ہے تو یہ پہاڑ بھی ایسا تھا، کبھی سامنے آ کھڑا ہوتا یوں کہ جیسے ہماری جیپ اس کی ازلی برفوں کے اندر جاتی دفن ہو جائے گی اور کبھی وہ سرکتا سرکتا.. ہم سے روٹھا ہوا بہت دور نکل جاتا یہاں تک کہ فاصلے اُس کے برف چہرے کو مدھم کرنے لگتے.. یہ پہاڑ کم از کم راکاپوشی کے مقابل تو آ کھڑا ہوا تھا کہ بے شک چاندنی راتوں میں تجھ پر جمال کی سفید پریاں اُترتی ہیں لیکن تو ریاست نگر میں منجمد اور ساکت ہے.. بے شک جو کوئی تجھے ایک بار دیکھ لیتا ہے زندگی بھر کے لیے اجڑ جاتا ہے لیکن تُو جامد ہے اور میں حرکت میں ہوں.. تجھے قراقرم کی چٹانیں گھیرے میں لیے ہوئے ہیں جب کہ میں آزاد ہوں اور میرے آس پاس سینکڑوں کلومیٹر تک وہ جنگل ہیں جو ابھی دو ماہ پیشتر ہرے بھرے کچور شاداب تھے اور اب وہ سارے کے سارے خزاں کے سونے میں ڈھل چکے ہیں اور سینکڑوں ندیاں اور درجنوں دریا ہیں جو میرے دامن کو چُومتے بہتے ہیں جب کہ تیرے آس پاس تو قراقرم کی قید ہے۔ مانتا ہوں کہ اے راکاپوشی تُو بلندی میں مجھ پر سبقت رکھتی ہے لیکن میں پورے الاسکا پر راج کرتا ہوں.. ایک راجہ ہوں جب کہ تُو ان گنت شہزادیوں میں سے ایک ہے۔

دوپہر کے کھانے کے لیے ہم کسی گمنام چند گھروں پر مشتمل ایک قصبے کے شاید اکلوتے ریستوران میں رُکے تو اُس کی کھڑکیوں میں بھی وہ بھکشو پہاڑ ایک تصویر کی مانند آویزاں تھا..

ہم اس ریستوران کے اندرون میں آخری میز پر جا بیٹھے کہ ہم ہی تنہا گاہک تھے اور میں نے فوراً ہی اپنی نشست سے اٹھ کر کہا ''گونج.. کیا تم میرے ساتھ اپنی نشست بدل سکتی ہو؟''

''کیوں؟'' وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔

''یہاں سے مجھے وہ بھکشو پہاڑ نظر نہیں آ رہا۔''

''ازلی اور ناقابل علاج رومینٹک..'' اُس نے نہایت تأسف سے چونچ ہلائی ''صرف ایک برف پوش پہاڑ کو ہمہ وقت نظروں کے سامنے رکھنے کے لیے تم اتنا تردّد کرتے ہو.. ایک بار دیکھ لیا تو دیکھ لیا.. اپنے آپ کو اتنی مصیبت میں کیوں ڈالتے ہو اور مجھے بھی کہ.. نشستیں بدلنے کا تردّد کرتے ہو..''

''یہ کوئی عام سا پہاڑ نہیں ہے گونج.. کیا میں اس مسافت کے دوران کسی بھی برف پوش پہاڑ کو دیکھ کر اسے پہچان

میں مبتلا ہوا ہوں۔ اس کی شباہت نے کبھی مجھے کوہ فوجی یاما کی یاد دلائی اور کبھی اسے دیکھ کر مجھے ماؤنٹ کلی منجارو یاد آئی.. لیکن ان سب شباہتوں کے سوا یہ مجھے کوہ آرارات نظر آتا ہے..''

''تو پھر..'' وہ بےزاری سے بولی۔

''اگر میں نوح ہوتا تو میری کشتی آرارات پر نہیں اس الاسکن پہاڑ کی چوٹی کے دامن میں ٹھہرتی۔''

''استغفراللہ..''

میں بھونچکا رہ گیا.. میں تو ایسا مسلمان نہ تھا پر یہ گونج کیسے اتنی بنیاد پرست مسلمان ہو گئی ہے..

○●○●○

"ٹوک میں.. کُونج ایک گم شدہ بچّی کی مانند روتی دکھائی دیتی ہے"

وہ الاسکا کا سب سے امتیازی برف پوش جھلشو پہاڑ جو اس پورے تنہا سفر کے دوران ہمارا رفیق رہا.. کبھی دائیں جانب پیچھے سرکتا سینکڑوں کلومیٹر دور جا براجمان ہوتا اور کبھی بائیں جانب بہت نزدیک تو نہ آتا لیکن اتنی قربت ہو جاتی کہ ہم اُس کی ٹھنڈک میں ٹھٹھرنے لگتے اور کبھی کبھار شاہراہ کے سامنے آ کھڑا ہوتا جیسے ہمیں الاسکا سے جانے سے روکتا ہو کہ تم ہی کہو کیا کبھی کسی خطے پر، دنیا کے کسی حصے میں تمہیں ایسی وسیع تنہائی نصیب ہوگی جس کے اندر تمہاری جیپ سفر کرتی چلی جاتی ہے اور تم جو الاسکا کی بلندیوں کو چشم حقارت سے تکتے تھے، مجھے دیکھ کر راکاپوشی اور آرارات کو فراموش کر بیٹھے ہو ناں تو یہاں سے کدھر جانا ہے.. آؤ میرے پہلو میں کچھ جگہ ہے، جہاں تم ایک خیمہ نصب کر کے بقیہ زندگی میری رفاقت میں بسر کر سکتے ہو..

اُس سفر میں شام ہوئی تو وہ سب سے پہلے اُس پہاڑ کے آس پاس پھیلے جنگلوں میں اتر کر اُنہیں سیاہ کرنے لگی.. اُن میں بہتی ندیوں اور دریاؤں کے پانیوں میں گھلنے لگی اور پھر ہولے ہولے ایک کوہ پیما کی مانند اُس پہاڑ کے دامن میں سے اٹھتی بالآخر اُس کی برف پوش چوٹی پر پہنچ کر اُسے اپنی سیاہ آغوش میں لے لیا.. ایک مدت بعد میرے ایک کینیڈین دوست نے بتایا کہ وہ جھلشو پہاڑ دراصل ماؤنٹ مکینلے ہی تھی جسے تم نے مختلف فاصلوں اور قربتوں سے دیکھا تو کوئی اور پہاڑ سمجھ بیٹھے..

ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم ٹوک کے نواح کے جنگلوں کی ویران رات میں بھٹکتے اُس "چٹان میں شگاف" قیام گاہ کی تلاش میں خجل خوار ہوئے، ایک صاف ستھرے بستر اور غسل خانے کی آرزو میں بالآخر ہم نہایت بلند درختوں میں مکمل طور پر روپوش رہائش گاہ تک پہنچے جس کی قدیم چوبی عمارت میں کہیں کہیں کوئی لالٹین سی روشنی ہوتی تھی اور مجھے تو وہ کاؤنٹ ڈریکولا کے قلعے کی مانند کچھ آسیب زدہ سی لگی.. آخر ٹوک کے نواح میں تھی وہ کیسے کسی آسیب کے بغیر ہو سکتی تھی اور اس کے باوجود ہم فوری طور پر اس میں سو جانا چاہتے تھے.. اور جب اُس کا مالک ہماری جیپ کی ہیڈ لائٹس کو دیکھ کر کسی کونے کھدرے میں سے برآمد ہوا تو وہ بھی کاؤنٹ ڈریکولا کا کوئی قریبی عزیز لگتا تھا.. وہ تاریکی میں سے برآمد ہو کر جیپ کی ہیڈ لائٹس میں آیا.. کرخت اور ناخوش چہرہ اور لہجے میں ایک حیوانی غراہٹ "کیا آپ نے

آج شب کے لیے میرے ہاں ایڈوانس بکنگ کروا رکھی ہے؟.. میرے پاس لوگ یونہی منہ اٹھا کر نہیں چلے آتے.. کوئی گنجائش نہیں ہے.. کہیں اور قسمت آزمائی کر لو۔"

ہم پھر سے اُنہی تاریک جنگلوں میں سفر کرتے واپس آئے اور ٹوک کی سیاہ رات میں چلے گئے، ہم اور کہاں جاتے، وہاں بھی جو ایک دو مناسب موٹل تھے، بھرے پڑے تھے.. بمشکل ایک ایسے موٹل میں کمرہ ملا جو مجھے مخدوش سا لگتا تھا اور اُس کے داخلے پر ایک کیبن میں اس کا رکھوالا ایک بوڑھا لالٹین کی روشنی میں کچھ لکھ رہا تھا اور جانے کتنی صدیوں سے وہیں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا..

اُس موٹل کا کمرہ ایک طے شدہ معیار کے مطابق تو تھا لیکن اُس کے اندر ایک بوسیدگی کی بُو تھی.. اُس کا برآمدے پر کھلنے والا دروازہ میں نے جلدی سے بند کر دیا کیونکہ میں محسوس کر سکتا تھا کہ ایک سیاہ آسیب کمرے کے اندر بہتا چلا آتا ہے جو بستر کی چادروں کو، واش روم کے سفید تولیوں کو.. یہاں تک کہ کُونج کے سفید پروں کو بھی سیاہ کرتا چلا جاتا ہے۔

تقریباً دو ہفتے پیشتر جب ہم ٹیلر روڈ کے راستے وادیٔ یوکان سے الاسکا میں داخل ہوئے تھے تو اس پہلی بستی کی ویرانی نے میرے اندر ایک خوف بھر دیا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں یہاں سے جلد از جلد نکل جاؤں.. اس کے اندر ایک ہراس ایک ہول تھا جو میرے بدن میں اترتا تھا اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسا آسیب زدہ قصبہ ہے جہاں تادیر ٹھہرنے سے.. اس کا ماحول آپ کی زندگی بھر کی محبتوں پر کوئی جادو ٹونا کر کے اُنہیں ایک عذاب ناک خواب میں بدل سکتا ہے.. اس کا کچھ اعتبار نہ کرو.. یہاں ایک شب بسر کرنا دیوانگی کی بلاؤں کو دعوت دینے کے مترادف ہے.. اگر تم نے اپنی محبتیں سنبھالنی ہیں تو یہاں سے نکل چلو.. شب مت بسر کرو..

اور مجھے مجبوراً الاسکا کی مسافت سے واپسی پر وہاں شب بسر کرنی پڑ گئی.. اور وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا..

زندگی بھر کی محبتیں کسی جادو ٹونے کی نذر ہو گئیں..

مجھے ٹوک کی اس شب میں ڈراؤنے خوابوں نے گھیر لیا.. اور وہ بلاؤں کی مانند میرا پیچھا نہ چھوڑتے تھے، کبھی میرے کانوں میں کُونج کے کُرلانے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں آنے لگتیں اور وہ ماتم کناں تھی کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ سفر کیوں اختیار کیا، میں اپنے فلوریڈا کو ترک کر کے تمہارے ساتھ کیوں چلی آئی.. اور کبھی وہ مجھے واش رُوم کے ٹب میں اپنی آنکھوں پر اپنے لامبے پَر پھیلائے ہچکیاں بھرتی ایک گمشدہ بچی کی مانند روتی دکھائی دینے لگتی اور میں اُسے ڈھارس دیتا ہوں، اُس کی منت سماجت کرتا ہوں پر وہ نہیں مانتی اور روتی چلی جاتی ہے.. اُس کے رونے سے میرا دل خون ہوتا ہے..

اور جب میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں تو وہاں کوئی نہیں ہے.. برابر کا بستر بے شکن خالی پڑا ہے اور مجھے یاد آتا ہے کہ وہ تو اُس لمحے جب میں کمرے کی چابی گھما کر اس کے اندر داخل ہوا تھا، حسب عادت مجھ سے رخصت ہو کر واپس ٹوک کے اُن جنگلوں میں چلی گئی تھی جن کے اندر وہ کمبخت "چٹان میں شگاف" تھا اور اُس نے وہیں اُن کی گھمبیری تاریکی میں خوابیدہ ہونا تھا..

وہ یہاں نہ تھی پر شب بھر اُس کے واہمے میرے بدن سے لپٹے سسکیاں بھرتے رہے۔

خدا خدا کر کے سویر ہوئی..

اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہ نہائی دھوئی جانے ٹوک کے جنگلوں میں روپوش کس جھیل میں نہائی دھوئی میرے آس پاس پھڑ پھڑا رہی ہے اور مجھے لعن طعن کر رہی ہے کہ میں کب سے آ چکی ہوں اور تم یوں گھوک سوئے ہوئے تھے جیسے بیدار ہو کر کہیں نہیں جانا.. آج ہم نے الاسکا کی سرحد عبور کر کے کینیڈا میں داخل ہونا ہے اور پھر ٹسلن جھیل کے کنارے اُس موٹل میں رات کرنی ہے جس کی تم نے آرزو کی تھی.. کیا تم نے اپنی نیند پوری کر لی..

''ہاں.. اور تم نے؟''

''تم کیا جانو کہ ٹوک کے نواح میں جو جنگل ہیں وہ کیسے خمار آلود ہیں.. اُن کی پوشیدگی میں کیسی گہری نیند آئی..''

میں نے اپنے ڈراؤنے خوابوں کا کچھ تذکرہ نہ کیا۔ اگر کرتا تو وہ میرے مشرقی توہمات کو مورد الزام ٹھہرا کر تأسف میں چونچ کٹکٹانے لگتی اس لیے میں چپ رہا..

''یہاں سے نکل چلیں..'' صرف اتنا کہا..

''لیکن کافی کے ایک گرم کپ اور ایک بیگل کے بعد اُس پر مکھن اور سٹرابری جیم لگا کر.... لیکن.. تم ٹھیک طرح سے سوئے نہیں.. تمہاری آنکھیں سُرخ ہیں۔'' وہ قدرے فکر مند ہوئی۔

''یہاں سے نکل چلیں۔'' میں نے کہا۔

○●○●○

''جھیل ٹسلن کی شب میں.. وِچ گُجری دی پینگ وے ماہیا''

موتیوں کا زیور ہر طرف کُھلا..
اور آگ بھڑکی، مینہ اگر دم بھر کُھلا..

''یہاں جھیل ٹسلن کے کناروں پر اِس ''یُوکون موٹل اینڈ ریستوران'' کے کسی کمرے شب بسر کرنا کیسا ہو گا جس کے اندر ایک قوس قزح سرایت کر رہی ہو..''

کتنے بے انت زمانے بیت گئے جب ہم یہاں سے گزرے تھے، جھیل ٹسلن کے کناروں پر کچھ دیر کے لیے رُکے تھے..

''طویل مختصر پانیوں کی جھیل'' جو ایک سو پچیس کلو میٹر تک چلی جاتی تھی اور چوڑائی میں صرف دو تین کلو میٹر کی تھی.. اور تب وہاں اُس جھیل کے پانیوں میں سے ایک ست رنگا جھولا ایک قوس قزح جنم لیتی تھی کہ بارش ابھی ابھی رُکی تھی اور دھوپ بادلوں کے اندر سے فرار ہو کر اس کے پانیوں تک آتی تھی اور وہ اس موٹل کے کمروں پر اُتر کر ان میں گم ہوتی جاتی تھی..

اور آج شب جو میں نے چاہا تھا وہ حسب آرزو مجھے ملنے کو تھا..
''یُوکون موٹل اینڈ ریستوران'' کے کمرہ نمبر 8 میں میرا سامان کُھلا پڑا تھا۔

ہم الاسکا کی سرحد ''بیور کریک'' کی امریکی کسٹم چوکی پار کر کے ایک مرتبہ پھر کینیڈا کی وادیٔ یُوکان میں داخل ہو گئے۔ میں اپنے پاسپورٹ کا اندراج کرانے کی خاطر جیپ سے اترا نہیں، اُسے کسٹم آفیسر کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیا اور وہ تا دیر اس کا معائنہ کرتا رہا.. کمپیوٹر پر جانے میری زندگی کے کن کن گوشوں کی پرکھ کرتا رہا.. شاید وہ تھوڑا سا کنفیوز ہو گیا تھا کہ یہ شخص، ایک پاکستانی، ایک مُسلم.. عین گیارہ ستمبر کو زمینی راستے سے الاسکا امریکہ میں داخل ہوا تھا تو اب کسی بھی دہشت گردی کے بغیر یوں چپ چاپ، پُر امن کینیڈا واپس جا رہا ہے اور بالآخر اُس نے میرے پاسپورٹ پر خروج کی ایک مُہر لگائی اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''مجھے امید ہے کہ آپ کا الاسکا کا قیام خوشگوار رہا ہو گا۔''

کسی بھی فیئری میڈو۔ سنو لیک یا ہرات یا ارض روم یا قرطبہ سے بچھڑتے ہوئے رنج ہوتا ہے.. اور الاسکا تو اس دنیا کے آخری سرے پر معلق سحر انگیز ویرانیوں کا ایک جادو نگر تھا جہاں کم ہی کسی کے قدم جاتے تھے تو کیا اُسے چھوڑتے

ہوئے بھی کچھ رنج ہوا... ہوا.. پر اُس رنج پر ٹوک کی رات کا ڈراؤنا پن یوں اثر انداز ہوا کہ میں بیور کریک تک دم سادھے بیٹھا رہا.. سر جھکائے ایک مفرور کی مانند چپکا بیٹھا رہا کہ کہیں میرے پیچھے پیچھے میرے تعاقب میں ٹوک کا آسیب نہ چلا آتا ہو... جونہی ہم بیور کریک کی سرحد پار کر کے کینیڈا میں آئے تو میرے منتشر شدہ اعصاب ایک اطمینان میں آئے۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا کہ شکر ہے اب ٹوک مجھے اپنی آسیب زدہ گرفت میں نہیں لے سکتا..

ٹوک نے الاسکا ایسے چودھویں کی رات کے چاند کو بھی گہنا دیا تھا..

اگرچہ ابھی کچھ اور مسافت طے کی جا سکتی تھی لیکن ہماری جیپ ''یوکون موٹل اینڈ ریسٹوران'' کی پارکنگ لاٹ کے اندر داخل ہو کر یکدم ٹھٹک کر رُک گئی..

''تھینک یو کونج۔''

''ابھی پُر مسرت ہونے کی کچھ ضرورت نہیں۔'' وہ بے زاری سے بولی۔ ''میں اندر جا کر چیک کرتی ہوں کہ تمہارے اس قوس قزح والے خواب موٹل میں کوئی کمرہ میسر ہے بھی یا نہیں..''

میں کونج کا مزید گرویدہ ہو گیا.. وہ کیسے میرے دل کی کسک، اس کی آرزو کو جان جاتی تھی کہ اس موٹل میں شب بسر کرنے کے لیے میں اپنی زندگی بھی مختصر کر سکتا ہوں.. دونوں کے ناموں کا آغاز ''ٹی'' سے ہوتا تھا.. ٹوک.. اور ٹسلن.. اگر ٹوک ایک آسیب تھا تو ٹسلن ایک جنت گم گشتہ تھی..

اور ٹسلن کی شب میں اگرچہ حسب معمول میں تنہا تھا.. ''یوکان ہوٹل اینڈ ریسٹوران'' کے کمرہ نمبر آٹھ کے اندر تنہا تھا.. کونج کب کی جھیل ٹسلن کے پانیوں کی جانب کوچ کر چکی تھی، اُس کے کنارے اُگے سرکنڈوں میں کہیں پَروں میں چونچ پوشیدہ کیے اونگھ رہی ہوگی یا اُن میں پہلے سے قیام کرتے کسی خوش شباہت پرندے کے ساتھ چونچیں لڑا رہی ہوگی..
اگرچہ اس موٹل اور جھیل کے پانیوں کے اوپر جو آسمان تھا وہ کھرا اور شفاف تھا اور نہ ہی آج بارش اتری تھی اور اس کے باوجود یقیناً ایک قوسِ قزح نے جھیل کے پانیوں میں سے کہیں جنم لیا تھا کہ وہ بارش کی بوندوں اور سورج کی شعاعوں کی محتاج نہ تھی.. ٹوک کی ڈراؤنی رات تقریباً کھلی آنکھوں میں کٹ گئی تھی اور ٹسلن کہ اُس رات میں بستر پر دراز ہوتے ہی نیند نے آلیا.. جیسے گھات لگائے بیٹھی تھی، پلک جھپکنے سے پیشتر مجھے شکار کیا اور نیند کی موت وادی میں لے گئی۔

بے شک میں نیند میں تھا لیکن میں قوسِ قزح کے سات رنگوں کے لشکارے اپنے خوابیدہ بدن میں سرایت کرتے محسوس کر سکتا تھا.. وہ میری آنکھوں میں جھولتی اترتی تھی.. اُس کمرہ نمبر آٹھ کی کھڑکی کے آگے پردے تنے ہوئے تھے لیکن وہ اُن میں سے بھی چھن چھن کر آتی تھی اور میرے ڈبل بیڈ کے خالی حصے کو اپنے رنگوں سے منور کرتی تھی.. اگر ایک گوری کا گورا پنڈا میرے برابر میں نیند میں ہوتا تو وہ کیسے اُس کے نشیب و فراز کو رنگین کرتی.. کہاں اُس کے رنگ پھسل کر نیچے گرتے اور کہاں وہ کسی اندھیارے میں گم ہو جاتے..

بے شک قدرت کے اس عجوبہ کرشمے کو قوسِ قزح اور رین بو کے نام دیے گئے لیکن جس طور اسے پنجابی میں منسوب کیا گیا اُس کی مثال نہیں.. پنجابی میں اسے ''گجری دی پینگ'' کہا جاتا ہے یعنی ایک گوجر دوشیزہ کا جھولا.. جو لوگ اس

خطے کے رہن سہن، ثقافت اور یہاں آباد قبیلوں سے شناسائی رکھتے ہیں وہ آگاہ ہیں کہ گوجر لوگ اگرچہ زمینوں کے مالک بھی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ بھینسیں پالتے ہیں اور اُن کا دودھ اور مکھن فروخت کر کے رزق کماتے ہیں.. گوجرانوالہ، گجرات اور گوجر خان انہی قبیلوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں.. تو ان قبیلوں کی لڑکیاں، گُجریاں بھی اسی دودھ مکھن کی خوراک پر کھلی فضاؤں اور چراگاہوں میں پلتی بڑھتی جوان ہوتی ہیں اور اُن کے صحت مند بدنوں میں ایک ایسا پُر جوش تناؤ ہوتا ہے کہ جب وہ ایک جھولے پر بیٹھ کر اپنے پورے بدن سے زور لگاتے ہوئے اُسے جھلاتی ہیں تو وہ جھولا ایک قوس کی شکل میں آسمان تک جاتا ہے.. اور یوں اُن کے حسن کا تموج اور اُس میں سے پھوٹنے والی روشنائی اُس جھولے میں مدغم ہو کر ایک قوس قزح کی شکل اختیار کر لیتی ہے..

اُچیاں لمیاں ٹاہلیاں تے وِچ گُجری دی پینگ وے ماہیا!

اونچے، لمبے اور بلند شیشم کے درخت اور اُن میں ایک گُجری کا جھولا.. اے محبوب!

شب بھر ٹسلن جھیل کے کنارے اُس موٹل کے کمرہ نمبر آٹھ میں جھولے پڑے رہے.. جھولا کس نے ڈالا سکھی ری.. اور اس جھولے میں جھولتی گُجری کچھ آشنا سی ہے.. وہ زرد پیراہن میں ہے جو بارش سے بھیگتا ہے اور اُسے یوں عیاں کرتا ہے جیسے سمندر سے نہا کر نکلنے والی ایک وینس.. یا پھر ایک کونج.. وہ کون تھی جو شب بھر اُس کمرے میں جھولا جھولتی ایک قوس قزح تخلیق کرتی نیند کی وادی میں اُتر کر مجھے اپنی چھب دکھلاتی رہی..

○●○●○

''معیز الدین جنکشن کی تلاش میں بھٹکتے آ ہو''

ہم وہ آ ہو تھے جو اُس منزل کے لیے بھٹکتے پھرتے تھے جو یُوکان کے عمیق اور سیاہ جنگلوں میں کہیں روپوش تھی اور جس کا نام معیز الدین جنکشن تھا۔

حسب سابق میری آنکھ کھلی تو کُونج نہائی دھوئی میرے آس پاس چھم چھم کرتی پھرتی تھی اور مجھے شک ہوا کہ وہ پچھلی شب جھیل ٹسلن کے کنارے اُگے سروٹوں کے اندر کسی خوش شباہت پرندے کے ساتھ صرف چونچیں ہی لڑاتی نہیں رہی.. جانے کیا کرتی رہی ہے کہ وہ نہائی دھوئی ہے..

اُس کے سفر کے پیمانے بھی انسانوں سے مختلف تھے۔

انسان تو دورانِ سفر رُکتے ہیں، کچھ کھاتے پیتے ہیں، ذرا آرام کرتے ہیں اور پھر سفر اختیار کر لیتے ہیں لیکن اُس کے سفری معیاروں میں نہ کہیں رُکنا تھا، نہ کہیں کھانا پینا اور نہ کہیں دم لینا تھا بس اڑتے ہی جانا تھا.. اُس نے ٹسلن جھیل کنارے شب بسر کرنے کی میری آرزو پوری کر دی تھی اور اب اُس کے ہاتھوں میں سفر کا ایک چابک تھا جو وہ مجھے رسید کرتی تھی کہ رُکنا نہیں، کھانا پینا نہیں، بس چلے چلو.. شام اُترنے والی ہے اور ہمارے نقشوں میں درج کوئی مقام معیز الدین جنکشن نام کا ہے جہاں ایک انسانی موجودگی ہے.. ایک شاندار موٹل اور ریستوران ہے.. ایک سُپر سٹور ہے.. جنگل میں منگل ہے تو چلے چلو جب تک منزل نہیں آ جاتی..

معیز الدین جنکشن؟

یہ کچھ پاکستانی سا نام لگتا تھا..

مجھے یہ نام سن کر ایک جھٹکا سا لگا تھا اور یہ جھٹکا میرے ماضی کے دھندلکوں میں سے برآمد ہو کر یکدم مجھے یُوکان میں آ لگا تھا..

وہ خاور زمان کے ہمراہ مسلم ماڈل ہائی سکول میں میرا کلاس فیلو تھا، ایک قریبی تو نہیں بہرحال روزمرہ کا اچھا دوست تھا۔ ''ادبی دنیا'' والے مولانا صلاح الدین احمد کا بیٹا تھا جن کی مونچھیں گروچو مارکس سے مشابہ تھیں یا پھر گروچو نے اپنی مونچھوں کا سٹائل مولانا سے ادھار لیا تھا اور وہ بھی شکل صورت میں اُن پر گیا تھا۔ اگرچہ قابلیت میں اُن پر نہ جا سکا تھا.. میرے بیشتر دوستوں کی مانند وہ بھی سول سروس کے پُرتکبر گنجلکوں میں کھو گیا.. جوانی میں ہی فارغ البال ہو گیا اور بے وجہ

قہقہے لگانے میں اُس کا کوئی ثانی نہ تھا اور خاور مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے ہمیشہ اُسے ڈانٹتا کہ معیز خدا کے لیے یوں ایک لگڑ بگڑ کی مانند قہقہے نہ لگایا کرو اور وہ جواب میں ایک اور قہقہہ بلند کر دیتا، اُسے کسی سوگ کی محفل میں بلانا خطرے سے خالی نہ تھا.. علاوہ ازیں ہم اُس کی مسلسل پائپ نوشی کی عادت سے عاجز آ چکے تھے.. اُس کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی الاسکا کے سمندروں میں ابھرنے والے اود بلاؤ ایسی مونچھیں تمباکو کے کثرت استعمال سے بھوری ہو چکی تھیں اور وہ پائپ سلگانے میں اتنا تردد کرتا کہ زمانے بیت جاتے، آخری بار جب اُس سے ملاقات ہوئی تو وہ کراچی میں کسی بڑے حکومتی ادارے کا سربراہ تھا اور تنہا تھا.. اُس کی آل اولاد باہر کے ملکوں میں آباد ہو چکی تھی اور وہ منتظر تھا کہ کب ریٹائرمنٹ کا پروانہ آئے اُس کی جان پاکستان سے چھوٹے اور وہ کسی تہذیب یافتہ ریاست میں چلا جائے کہ بیشتر بیوروکریٹس کا یہی وطیرہ ہے..

اب وہ مر چکا ہے..

تو کیا وہ قہقہے لگاتا معیز الدین احمد ادھر کہیں یُوکان میں آ آباد ہوا تھا اور اُس کے نام کا یہاں ایک جنکشن بھی تھا..

''نہیں..'' کُونج نے صحیح کی۔ ''میزاڈین جنکشن''

''نہیں.. معیز الدین جنکشن..'' میں اُس کی بھوری مونچھوں اور بے وجہ قہقہوں کی یاد میں مسکرانے لگا..

ہم یکدم اُس شام میں تو نہیں چلے گئے تھے جب ہم معیز الدین جنکشن کی چاہت میں سانس لیے بغیر سفر کرتے چلے جاتے تھے..

ہم مسلسل حیرتوں کے کرشموں کے ناقابل یقین منظروں میں سے گزرتے تھے جن کے بیان کے لیے ایک ''الف لیلیٰ'' درکار ہے..

ستمبر کے کرشموں کی زردی میں آئے ہوئے شجروں کی اوٹ میں سے جھانکتی نیلگوں شرمیلی جھیلیں..

کبھی شاہراہ کے عین سامنے سونے کی ایک دیوار حائل ہو جاتی.. ابر آلود آسمان کی کوکھ میں سے برآمد ہونے والی سورج کی آخری شعاعیں کسی پورے چٹانی سلسلے کو منور کرتیں اُسے سونے کی ایک ڈلی میں بدل دیتیں اور جونہی ہمارے چہرے اس خوف سے زرد ہوتے کہ ہماری جیپ اس سونے کی دیوار سے جا ٹکرائے گی تو شاہراہ ایک ہلکے سے خم کے ساتھ کسی ایسی جھیل کے کناروں پر رواں ہونے لگتی جس کے پانیوں پر گھنے جنگلوں کے عکس گرتے چلے جاتے تھے..

اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ جس مقام پر ہم رُکے اور میں نے کُونج کو واسطے دے کر روکا کہ کچھ تو میری عمر کا خیال کرو، مجھے ذرا اپنے آپ کو ہلکا کرنا ہے لیکن یہ محض ایک بہانہ تھا، رُکنے کا تو وہاں آس پاس سینکڑوں کوس تک کوئی ذی روح نہ تھا، اگرچہ درختوں اور گل بوٹوں میں بھی روح ہوتی ہے پر وہ بھی دم سادھے ہوئے تھے.. کہیں کوئی ایک سانس نہ تھا، اور وہاں بے انت پانیوں والی سراسر نیلو نیل ایک جھیل تھی جو پہاڑوں کے دامن میں تاحد نظر بچھی چلی جاتی تھی جیسے ازل سے منتظر ہو کہ کوئی تو آئے، میرے پانیوں میں اتر کر میری کنوارگی زائل کرے..

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام..

اس جھیل کے آفاق کی کارگہ شیشہ گری کا نازک تھا بہت کام کہ ذرا سانس لو تو اُس کے باریک شیشے پانی ترخ سکتے تھے..

قدرت کا یہ کیا کارخانہ ہے جس میں اگر انسان تنہا ہو جائے، آس پاس کوئی اور نفس موجود نہ ہو تو اُس کے اندر ایک آدم سانس لینے لگتا ہے..اور وہ آدم ظاہر ہے بے لباس ہے اُسے ابھی تک اپنا نازک مقام ڈھانپنے کے لیے انجیر کا پتہ مہیا نہیں کیا گیا تو اُس جھیل کی یکسر تنہائی میں مجھ میں اس اشتیاق نے جنم لیا کہ میں بھی اپنے آپ کو ان پیراہنوں کی قید سے آزاد کر کے اس کے پانیوں میں اتر جاؤں کہ آس پاس دور دور تک دیکھنے والا کوئی نہ تھا اور دیکھوں تو سہی کہ ایک بدن اگر آدم ہو تو وہ پانیوں میں اتر کر کیا محسوس کرتا ہے۔

میرے اندر اگرچہ سانس آدم کا تھا پر میرا بدن اُس کی مانند سُتا ہوا، چست اور متناسب نہ تھا..مٹی اور پانی کی آمیزش سے گندھا ہوا ابھی ابھی پروردگار کی پھونک سے زندہ نہ ہوا تھا.. یہ ایک بوسیدہ خزاں آلود بدن تھا جس کا ماس ڈھلک کر ہڈیاں چھوڑتا تھا تو ایسے زوال پذیر بدن اُس جھیل کے کنوارپن میں اُتارنا گویا اُسے آلودہ کرنا تھا تو میں نے وہ اشتیاق ترک کیا، بجھے دل سے واپس جیپ میں آ گیا..

حسب توقع گونج چونچ کھولے گہری نیند میں چھوٹے چھوٹے نابالغ خراٹے لے رہی تھی..اور کم از کم اُن نابالغ خراٹوں سے تو آفاق کی شیشہ گری کے نازک کام کو کچھ ضعف نہ پہنچ سکتا تھا..

اس شیشہ گری کے نازک کام سے ابھی دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر آئے ہیں تو جیپ کی ونڈ سکرین پر ایک زرد آگ سی بھڑکنے لگی، شاہراہ ایک اور خزاں رسیدہ کائنات میں ڈوبتی دکھائی دینے لگی..مجھے محسوس ہوا کہ یہ جیپ زرد پتوں کے ایک بن میں ڈوبنے والی ہے اور اگلے لمحے وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، ہم اُس خزاں آلود جنگل کی زرد آگ میں داخل ہو گئے..یہ نہ حسن بیمار کی زردی کا کوئی روپ تھا اور نہ اس میں خزاں رسیدگی کا کوئی مرگ سندیسہ تھا بلکہ یہ زردی تو اُس آگ سے مشابہ تھی جس میں رائیڈر ہیگرڈ کی "شی" ایک بوڑھی عائشہ جل کر پھر سے نوخیز ہو جاتی ہے۔ ابھی اس بن کی زردی ہمارے چہروں پر بسنت بہار ہو رہی تھی کہ بائیں ہاتھ پر ایک گھاس بھرے میدان کے برابر میں ایک ایسی جھیل کا آغاز ہو گیا جس کے کناروں پر ارغوانی سرکنڈوں کا ایک ایسا سلسلہ تھا جو اُس کے پانیوں پر جھکتا اپنے عکس سے اُسے مئے لالہ فام کرتا تھا..اور جھیل کے دوسرے کنارے پر بلند شجروں کی ایک گھنی کائنات تاریک ہوتی تھی..

اس میں کچھ کلام نہیں کہ یوکان اور الاسکا کا یہ سفر آسائش اور آسودگی میں بے مثل تھا..ہم نے کیسے کیسے آرام دہ اور پرتکلف موٹلوں اور ہوٹلوں میں اپنی راتیں بسر کیں..فیئر بینک کا سوفی ہوٹل' سیورڈ کا مرفی زلونگ شور ہوٹل اور پچھلی شب کا ٹسلن جھیل کنارے ٹھکانہ..لیکن یقین جانیے مجھے اُن میں وہ نیم تہذیب یافتہ، کلفت بھری خانہ بدوش راحت نصیب نہیں ہوئی جو بلندیوں پر اپنے نصب کردہ چھوٹے سے خیمے میں ہوا کرتی تھی..اگر میرے پاس ایک مختصر سا خیمہ ہوتا، ایک سلیپنگ بیگ اور کھانے کا کچھ سامان ہوتا تو میں اس جھیل سے رخصت ہونے والوں میں سے نہ تھا اور نہ ہی بچھڑ جانے والوں میں سے تھا..

دن ڈھل رہا تھا.. پر کچھ کچھ شب کی سیاہی کا سماں تھا..دھوپ نہ تھی..

ایک ملگجا سا منظر تھا..جھیل پار کے سیاہی مائل سبزے کے گھنے جنگل اُس کے پانیوں پر یوں عکس ہوتے تھے کہ دوسرے کنارے پر جو ارغوانی سرکنڈے تھے، اُن میں اُلجھ اُلجھ جاتے تھے..

"مستنصر.."

ایک عرصے کے بعد گونج نے مجھے میرے نام سے پکارا اور وہ اس کی ادائیگی ایسے انداز سے کرتی تھی کہ میں ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا کہ وہ مجھ پر ریجھ گئی ہے۔

"ہم دونوں ایک مختصر رفاقت کے سفر میں ہیں، چند روز میں اس کا اختتام ہو جائے گا اور ہم ایک دوسرے کے لیے ایک قصہ پارینہ ہو جائیں گے..لیکن میں نے اس سفر کے دوران تمہاری طبیعت اور خصلت کو بہت پرکھا ہے اور میرا مشاہدہ ہے کہ تم نسوانی حسن سے کم کم متاثر ہوتے ہو..اگرچہ کبھی کبھار میں تمہیں چھیڑنے کی خاطر "ٹھرکی" کہتی ہوں پر تم ہو نہیں..ہاں اگر تمہارے سامنے ایک ایسا منظر آ جاتا ہے تب تم حواس کھو بیٹھتے ہو..اگر ایک ایسی جھیل ہو تو اُس کے پانیوں کو چھونے کے لیے..اور تمہاری آنکھوں میں ایک ہوس ہے، دیوانگی ہے..تم اتنے بے قرار ہو جاتے ہو کہ مجھے تم پر ترس آنے لگتا ہے۔اب اتنی دیوانگی بھی کیا..چلو ہمارا سفر کھوٹا ہو رہا ہے..میزاڈین جنکشن ابھی کئی سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور ہمیں تاریکی چھانے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

اور پھر یکدم مجھے احساس ہوا کہ میں نے ٹسلن میں ایک ہلکے پھلکے ناشتے کے سوا سارا دن کچھ نہیں کھایا اور بھوک یوں مجھ پر حاوی ہوئی کہ اُس جھیل کے پانیوں کو بھی دھندلا دیا۔"گونج تم نے بتایا تھا ناں کہ ہم اس معیز الدین جنکشن پر پہنچیں گے تو وہاں ایک سپر سٹور ہوگا جہاں سے ہم کھانے پینے کی چیزیں خرید سکیں گے..ایک ریسٹوران ہے اور وہاں تم تو گھاس پھونس یعنی سلاد کھاؤ گی اور میں..کم از کم ایک روسٹ چکن فرنچ فرائز کے ایک ڈھیر کے ساتھ اور اُس پر ٹماٹو ساس کی پوری بوتل انڈیل کر اور ہاں پیپسی کولا کی ایک لٹر والی بوتل..اور پھر وہاں ایک موٹل ہوگا.."

"یہ سب کچھ ہوگا..اگر ہم اس منظر کو فوری طور پر ترک کر دیں تو.."

ہم پھر سے وہ آہو ہو گئے جو نیم تاریک جنگلوں اور ویران وسعتوں میں اُس منزل کی جستجو میں بھٹکتے تھے جس کا نام معیز الدین جنکشن تھا..

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ معیز الدین جنکشن کائنات کی آخری حد پر کوئی ایسا ستارہ ہے جس کی روشنی ابھی تک ہم تک نہیں پہنچی اور ہم اُس کی جانب خلاء کی تنہائیوں میں سفر کرتے چلے جاتے ہیں..

○●○●○

''اترتی شام کے ہول میں تین ریچھ اور مُعیز الدین جنکشن کا ویرانہ''

''گونج..'' جب تاریکی ذرا گہری اور ڈراؤنی ہونے لگی تو میں نے اُس کے ہول میں آ کر پوچھا ''کیا یہ مُعیز الدین جنکشن ہے بھی کہ نہیں..''

''نقشے کے مطابق اسے سیکنہ ماؤنٹین اور سوان لیک سے ذرا اِدھر ہونا تو چاہیے۔'' اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر دیں کہ شاہراہ تاریکی میں دھندلا رہی تھی..

ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں آس پاس امڈتے جنگل اور بھی ڈراؤنے لگنے لگے.. اور ان میں یقیناً بہت سے جنگلی جانور پوشیدہ تھے جنہوں نے اس یکدم روشنی کو پسند نہیں کیا ہوگا..

جنگل ذرا پرے پرے ہونے لگے..

اور اس کے ساتھ ہی تاریکی بھی جُھٹ پٹے میں بدلنے لگی.. کچھ کچھ دکھائی دینے لگا اور پھر مُعیز الدین جنکشن کے آثار ہمارے قریب آنے لگے..

اس سے پیشتر کہ ہم اُس کی مکمل ویرانی اور کھنڈر نما وحشت اور خوف کے ماحول میں سانس لیتے دائیں جانب سے ایک نہیں پورے تین درمیانی جسامت کے سیاہ ریچھ جھاڑیوں میں نمودار ہو کر لڑھکتے ہوئے شاہراہ پر آ گئے اور جیسے ریچھ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے لاڈ پیار کرتے ہیں ایسے چُہلیں کرنے لگے..

جیپ ظاہر ہے روک دی گئی تھی..

وہ ہماری قربت سے لاتعلق اپنے لاڈ پیار میں مشغول رہے..

''یہ آج کے سات ریچھ ہو گئے..'' گونج بھی میری طرح ایک پُر لطف ہیجان میں مبتلا ہو گئی تھی..

''آج کے.. یہ تین ہیں تو بقیہ چار کہاں تھے؟''

''تمہیں منظروں سے کچھ ہوش ہوتی تو تم دیکھتے.. ایک ریچھ بلکہ ریچھ کا بچہ بڑے اطمینان سے ہماری جیپ کے آگے سے گزر کر برابر کے جنگل میں اتر گیا تھا اور بقیہ تین.. جب تم اُس ارغوانی سرکنڈوں والی جھیل پر خیمہ نصب کر کے وہیں زندگی بسر کرنے کی بے سروپا باتیں کرتے تھے تب وہ شاہراہ کے برابر میں جو جنگل تھا اُس میں سے کبھی ظاہر ہوتے تھے اور کبھی روپوش ہوتے تھے اور ان میں سے ایک ہماری پارک شدہ جیپ کو سونگھ سانگھ کر چلا گیا تھا.. تو پورے سات.. ان کو ملا کر جو ونڈ سکرین کے پار مُعیز الدین جنکشن کے دہانے پر ریچھ مستیاں کر رہے ہیں۔''

اس دوران میں اپنا کینن ڈیجیٹل کیمرہ مسلسل آنکھ سے لگائے بیٹھا تھا لیکن اُس کی سکرین پر اُن کے سیاہ وجود بہت دُھندلے نظر آ رہے تھے۔ میں اُس کا بٹن دباتا چلا جاتا تھا کہ شاید کوئی ایک آدھ تصویر اس لمحے کو میرے لیے محفوظ کر لے کہ جب ہم آہو ایک تاریک ہوتی شام میں بھٹکتے کسی مُعیز الدین جنکشن پر بالآخر جا پہنچے تھے تو ہمارے راستے میں تین ایک دوسرے کے ساتھ لاڈیاں کرتے سیاہ ریچھ حائل ہو گئے تھے..

وہ یادگار لمحہ کم از کم ایک تصویر میں تو مسخر ہو گیا اگرچہ وہ کچھ واضح نہیں ہے، دُھندلی سی ہے اور اس لمحہ موجود میں میرے سامنے ہے.. ایک شاہراہ کا موڑ ہے.. بائیں ہاتھ پر گھنی جھاڑیوں کا ایک گنجلک ذخیرہ ہے جس کے کناروں پر تین مدھم سے ریچھ ہیں.. اُن میں سے ایک کی تھوتھنی نمایاں نظر آ رہی ہے اور اُس کے کان میرے اولین پوتے یاشار کی مانند ذرا کھڑے ہیں..

اُن کے بائیں جانب ایک جھونپڑا سا دکھائی دے رہا ہے اور بجلی کا ایک شہتیری کھمبا ہے جس کے ساتھ کچھ تاریں جھولتی ہیں..

اگر میں جیپ سے اتر کر کچھ آہٹ کیے بغیر دبے پاؤں ان ریچھوں کے ذرا نزدیک ہو جاؤں، بہت احتیاط کرتا تو شاید میں اُن کے کلوز اپ اتار سکوں..

گونج سیانی میرے دل کی تختی پر وہ عبارت بعد میں لکھی جاتی تھی جو وہ پہلے پڑھ لیتی تھی۔ اُس نے میرا ارادہ بھانپ کر میرے اُس ہاتھ پر اپنا پَر رکھ دیا جو دروازے کا ہینڈل گھمانے کو تھا ''نہیں.. وہ تم پر حملہ کر سکتے ہیں، چپکے سے بیٹھے رہو۔''

''میں زیادہ قریب نہیں جاؤں گا۔''

''بیٹھے رہو۔'' اُس نے ایک غصیلی دادی اماں کی مانند مجھے ڈانٹ دیا اور میں اُس کی ڈانٹ سے دبک گیا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں ریچھ آپس میں لاڈ پیار کرتے، جھاڑیوں میں سونگھتے شاید خوراک کے متلاشی اور پھر ناامید ہو کر لڑھکتے ہوئے اُنہی جھاڑیوں کی شام میں اوجھل ہو گئے۔

ہم نے اُن کے رخصت ہوتے ہی دو چار گام کا سفر طے کیا اور مُعیز الدین جنکشن میں داخل ہو گئے۔

اور میں ابھی کچھ دیر پہلے کیسے ایک آسودہ سوچ میں تھا کہ مُعیز الدین جنکشن کے کے نخلستان میں پہنچ کر میں کیسے اس کے ریستوران میں ایک سالم روسٹ مرغ نوش کروں گا اور وہ بھی ڈھیر سارے فرنچ فرائز کے ساتھ اور پھر فوری طور پر موٹل کے نرم بستر پر دراز ہو کر اپنی تھکاوٹیں فراموش کر دوں گا لیکن جب ہم جنگلوں میں گھرے ایک احاطے جس کا نام مُعیز الدین جنکشن تھا.. داخل ہوئے تو خواہشوں کا وہ جام جم اس کی ویرانی اور دم روک دینے والی وحشت آثار ویرانی کے تاریک فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا..

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی..

کوئی ہول سا ہول تھا..

کوئی ایک نفس نہ تھا..

اور آس پاس کے جنگلوں میں ایک سیاہ ویرانی سائیں سائیں کرتی تھی..

اُس شب کی اترتی سیاہی میں پُر ہول جنگلوں کے درمیان ایک کھلی جگہ تھی.. ایک احاطہ تھا اور اُس میں ایک متروک شدہ ریستوران کی عمارت بھائیں بھائیں کرتی تھی جس کا صدر دروازہ مقفل تھا اور کھڑکیاں آہنی سلاخوں میں

روپوش تھیں..اوران کھڑکیوں کے چوکھٹوں تلے گھاس اُگ رہی تھی اور مقفل دروازے کے کواڑوں پر کائی کے آثار تھے..

وہاں کوئی نفس تھا اور نہ کوئی چراغ..

مُعیز الدین جنکشن کا ڈبوائے فلموں کے کسی گھوسٹ ٹاؤن کی مانند اجڑا پڑا تھا، وہاں ایک شب اور ایک دہشت اترتی تھی..

مجھ میں تو اس ویرانی کے سیاہ خوف میں اترنے کا حوصلہ نہ تھا..البتہ گونج اطمینان سے جیپ سے اتر گئی۔ میں صرف اُس کے وجود کی سفیدی کو اُس شب کی سیاہی میں حرکت کرتا اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ اب اُس متروک شدہ ریستوران کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی ہے، مقفل دروازے پر دستک دے رہی ہے..اور پھر وہ لوٹ آئی..

''ہم نے دھیان نہیں کیا کہ ہم کن موسموں میں ادھر آ نکلے ہیں..یہ ستمبر کے آخری دن ہیں اور یہاں ان دنوں میں برف اترنے لگتی ہے اور کوئی بھی سیاح ادھر کا رُخ نہیں کرتا..یہ لوگ..ریستوران، سٹور اور موٹل والے لوگ اپنا کاروبار سمیٹ کر رخصت ہو چکے ہیں اور ہم نے دھیان نہیں کیا..''

کوئی بھی شخص اُس بے سروسامانی، جنگل میں سے اترتی مہیب تاریکی، دن بھر کے سفر کی کمر توڑ تھکاوٹ، بھوک اور بے بسی کا اندازہ نہیں لگا سکتا جو ہم دونوں کو یا کم از کم مجھے ہول سے بھرتی تھی کیونکہ کوئی بھی شخص آج تک ستمبر کے آخری دنوں میں وادیٔ یُوکان کی اتھاہ کائناتی ویرانیوں میں تنہا کسی معیز الدین جنکشن ایسے آسیب بھرے مقام میں شب کی سیاہی میں داخل نہ ہوا ہوگا..

بے شک وہ معیز الدین میرا دوست رہا تھا لیکن اُس لمحے میں نے اُس کے قہقہوں اور تمباکو سے بھوری ہو چکی مونچھوں کو پسند نہ کیا..معیز الدین تم نے مرنے کے بعد بھی ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

''تو پھر؟''

''اگر تمہارے پاس ایک خیمہ ہوتا تو تمہاری شب بسری کا بندوبست ہو جاتا..'' گونج نے اپنی آنکھیں جھپکیں جن میں وہ معیز الدین جنکشن کی ساری ویرانی بھر لائی تھی..

''کبھی نہیں..ایسی دہشت ناک ویرانی میں تنہا..اور بھوکا پیاسا..ایک خیمے میں..جس کے آس پاس ریچھ لڑھکتے پھرتے ہوں..میں اتنا بھی احمق نہیں....''

''تو پھر..؟''

''تو پھر ہمارے پاس اور کوئی متبادل نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم اس رات میں سفر جاری رکھیں اور جو ہوگا دیکھا جائے گا..''

میری الاسکا یُوکان کی تصویری البم میں ایک تصویر ہے..سیاہ جنگلوں کے درمیان ایک احاطہ جس میں ایک متروک شدہ ریستوران اور جھونپڑا شب کی سیاہی میں آؤٹ آف فوکس ہیں اور تین ریچھ ہیں جو آپس میں لاڈیاں کر رہے ہیں اور اُس منظر پر ایک ہول اترتا ہے..

○●○●○

''وہ کون تھا؟ اُس شبِ دیجور میں سڑک کنارے بیٹھا، وہ کون تھا؟''

معیز الدین جنکشن کی بھوت ویرانیوں میں سے اترتی شب کی سیاہی میں سے جب ہم نکلے اور ایک شاہراہ پر رواں ہوئے تو ہمارے ذہن میں کسی منزل کا تصور نہ تھا..کسی ٹھکانے کی آس نہ تھی..

تقریباً ایک سو کلومیٹر کا فاصلہ اور وہ بھی ویرانیوں کی سیاہ آغوش میں جب طے ہو چکا تو ایک ویران گیس سٹیشن کے پہلو میں ایک سٹور کی روشنیاں نظر آئیں..

ہم رُکے اور نڈھال بھوکے بچوں کی مانند اُس کے اندر اس بے تابی سے گئے کہ کہیں اس کے دروازے یکدم مقفل نہ ہو جائیں..ہمیں دیکھ کر اُس فربہ اور بیزار خاتون نے اپنے چہرے کو سپاٹ رہنے دیا اور نہ کچھ کلام کیا کہ آیئے جناب کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں..وغیرہ..وہ جانتی تھی کہ اس سٹور میں جو بھی داخل ہوتا ہے وہ ایک مجبور اور بے آسرا ہوتا ہے، اُس نے اور کہاں جانا ہے..

''لیڈی..کیا ہمیں آپ کے ہاں سے کچھ خوراک مل سکتی ہے..بے شک سرد ہو..اور چائے یا کافی کا ایک کپ؟''

اُس نے بقول میری امی کے چھٹانک بھر کی زبان ہلانا گوارہ نہ کیا اور سیر بھر کا سر نفی میں ہلا دیا..

بہرطور وہاں چپس کے کچھ پیکٹ تھے اور دودھ کے ڈبے تھے..غنیمت تھے..

''ہمیں یہاں سے آگے شب گزارنے کے لیے رہائش مل سکے گی؟''

تب وہ بولی ''شاید سمتھرز میں..اور وہ بہت دور ہے۔''

گا میرے منوا گاتا جا رے..جانا ہے ہم کا دُور..

اندھیروں کے اُس مسلسل اور تھکن سے ٹوٹتے سفر کی شب کی یادداشت میں دو نقش ہیں جو میرے ذہن پر ثبت ہیں..

ہم کسی گمنام بستی میں سے گزرے جو تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور گھروندوں کی ایک قطار میں ایک ایسا گھر تھا جس میں روشنی تھی..اور مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ کیسے خوش بخت ہیں کہ اپنے گھر میں ہیں، شاید کھانا کھا رہے ہوں اور ابھی کچھ دیر بعد ایک چھت کے نیچے اپنے بستر میں خوابیدہ ہونے کو ہوں..تو میں نے اُس گھر کے لوگوں سے شدید نفرت کی..

اور دوسرا نقش ایسا ہے جو کچھ محیر العقول قسم کا..ڈراؤنی فلموں کے ایک منظر جیسا ہے..میں آج بھی اُس کا تصور

کرتا ہوں تو ایک جھرجھری سی بدن میں ڈر بھر دیتی ہے کہ جانے وہ کون تھا..

اُس شب تنہائی میں اُس شب کی گھنی سیاہی میں جس کے راستے جیپ کی ہیڈ لائٹس کی زد میں آ کر نمایاں ہوتے تھے اور ہم پژمردہ اور تھکے ہوئے تھے اور ہمارے بدن اور ذہن بھٹکتے تھے، ہم ایک موڑ مڑتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی رُخ بدلتی مڑ جاتی ہیں تو اُن کی زد میں سڑک کے کنارے بیٹھا کوئی ذی روح، کوئی شخص بیٹھا دکھائی دیتا ہے اور وہ ایک عجیب سے لبادے میں گھٹنوں پر سر رکھے یوں بیٹھا ہے جیسے نیند میں ہو اور جب ہیڈ لائٹس اُس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سڑک کے کنارے بیٹھے شخص پر.. یا وہ جو کچھ بھی تھا.. پڑتی ہیں اُسے عیاں کرتی ہیں تو وہ سر اُٹھا کر دیکھتا نہیں.. بدستور گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا رہتا ہے.. ہم اُس کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور وہ پھر سے تاریکی میں چلا جاتا ہے..

وہ کون تھا؟

اور اُس شبِ دیجور میں ایک شاہراہ کے کنارے کیوں بیٹھا ہوا تھا..

اگر تو وہ میرے گزر چکے زمانوں کی مانند ایک آوارہ گرد تھا جو چ ہائکنگ کے ذریعے.. سفر کرتا تھا.. کسی لفٹ کا منتظر وہاں پڑا تھا تو جیپ کی ہیڈ لائٹس کو اپنے بدن پر پھسلتے ہوئے محسوس کر کے اُس نے پُر اشتیاق ہو کر اپنا انگوٹھا بلند کیوں نہیں کیا تھا، گھٹنوں سے سر اٹھا کر دیکھا کیوں نہ تھا.. تو وہ ایک چ ہائکر نہ تھا..

اور وہ جو کوئی بھی تھا اگر شب بسر کرنا چاہتا تھا تو ایک شاہراہ کے کنارے تو شب بسر نہ کر سکتا تھا..

تو وہ کون تھا؟

وہ کوئی منشیات کا عادی بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ایک ایسے مقام پر جہاں اردگرد تاریک جنگل ویرانیاں ہوں اور کسی بھی آبادی سے کوسوں دور ہوں وہاں ایک نشئی تو نہ پہنچ سکتا تھا..

تو وہ کون تھا؟

ٹونج بھی ڈر گئی تھی.. ''میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ کوئی انسان نہ تھا..''

اُس شخص یا وہ جو کچھ بھی تھا، اُس کے اسرار میں تب اضافہ ہوا جب اگلے روز ہم نے طے شدہ سفر کا تعین کرنے کی خاطر نقشے سے رجوع کیا جس میں درج تھا کہ وہاں ہم ایک ایسے جنگل کے درمیان میں سے گزرے تھے جس کے بارے وہاں کے آبائی باشندوں کا اعتقاد تھا کہ اُس کے اندر اُس کے شجروں میں ایک قدیم طاقت کی حکمرانی ہے اور وہ آسیب زدہ ہے..

ہم بے شک ان توہم پر یقین نہ رکھتے تھے لیکن کم از کم میں آج تک یہ طے نہیں کر سکا کہ وہ جو یکدم جیپ کی ہیڈ لائٹس میں آ گیا تھا، عجیب سے لبادے میں تھا۔ کسی لفٹ کا طالب نہ تھا اور نہ ہی وہاں شب بسر کرنے کے لیے بیٹھا تھا تو.. وہ کون تھا؟

جانے رات کا کونسا پہر تھا.. چند روشنیاں تاریکی میں سے نمودار ہو کر جیپ کی ونڈ سکرین کے پار ہو کر ہماری

آنکھوں میں اترنے لگیں، ایک گیس سٹیشن اور کچھ گھر دکھائی دینے لگے.. اور ایک موٹل کا نیون سائن دکھائی دیا جو ہماری آمد کا منتظر تھا کہ اُس کے بیشتر کمرے خالی پڑے تھے اور ہم اُن میں سے کسی کا بھی انتخاب کر سکتے تھے..

صرف ایک چھت اور اُس کے تلے بچھے ستھرے بستر ہماری بھوک کی تشفی تو نہ کر سکتے تھے، ہمیں فوری طور پر اس ہمفرز نام کے قصبے کے اُس اطالوی ریستوران تک جانا تھا جو اکلوتا تھا اور ابھی کچھ دیر میں بند ہوا چاہتا تھا..

وہ ایک خوش ذوق ماحول والا وسیع ریستوران تھا جس کی وسعت کو زیادہ تر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھرتے تھے جو اس دور افتادہ کینیڈا کے اس نامعلوم قصبے میں زندگی کرتے، تنگ آتے اس کی تنہائی اور یکسانیت سے یہاں ہجوم کرتے تھے، بے وجہ ہنستے جاتے تھے، مسکراتے اور ایک دوسرے کو چومتے تھے اور مناسب قسم کا شور و غل کرتے تھے.. اور اُنہوں نے ہمیں اُس ریستوران میں داخل ہوتے دیکھا اپنا مسکرانا، چومنا اور شور و غل موقوف کر دیا کہ اُنہیں اپنے اس اکلوتے ریستوران میں اجنبی لوگوں کی آمد پسند نہ تھی..

میں نے وہاں بقول کسے.. بلکہ بقول انگریزوں کے.. ایک سؤر کی مانند بے تحاشا کھایا.. ذرا آسودہ ہوا تو ٹونج پر نظر کی.. اور وہ.. مختلف نوعیت کی گھاس پھونس، ساگ پتر اور برسیم اور شتالہ ایسے چارے جنہیں تہذیب یافتہ لوگ سلاد کہتے ہیں اُن پر چونچیں مار رہی تھی اور مطمئن تھی..

ایک ویٹرس البتہ کچھ متجسس ہو گئی.. آپ لوگ کہاں سے آئے ہو.. کہاں کے ہو تو ٹونج نے بند گوبھی کا ایک پتہ چونچ میں چباتے ہوئے کہا.. ''میزاڈین جنکشن'' تو اُس نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

''جہاں تین ریچھ تھے وہاں..''

ویٹرس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی کہ یہ آوارہ گرد لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اگر کہیں کوئی میزاڈین جنکشن ہوتا تو میں نہ جانتی جو انہی علاقوں میں پیدا ہوئی اور یہاں سے کبھی باہر نہیں گئی.. یہ لوگ عجیب سے ہوتے ہیں، انہیں اِن کے حال پر چھوڑ دو..

○●○●○

''ہوپ کی بارش میں بھیگتا کاٹھ کا اُلو''

ہم دیر تک اوندھے پڑے بچھوؤں کی مانند سوتے رہے۔

ہم سے مراد ظاہر ہے صرف میں ہوں..

گونج تو اُس اطالوی ریستوران میں کھلا پلا کر مجھے موٹل کے داخلے پر چھوڑ کر جدا ہوئی اور جانے اُس نے شب بسر کرنے کے لیے کس جھیل یا جنگل کا انتخاب کیا.. یا شاید وہ شاہراہ پر گھٹنوں پر سر رکھے اُس ذی روح کے برابر میں جا بیٹھی ہو اور اُس کے کندھے سے سر لگا کر سو گئی ہو.. اور جب وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی.. حسب عادت کسی نزدیکی جھیل میں نہائی دھوئی موٹل کے کمرے میں اگلی سویر داخل ہوئی تو میں کب کا ناشتہ کر چکا تھا اور سامان باندھ چکا تھا۔

''چلنا نہیں؟''

''کہاں چلنا ہے؟''

''آج کی مسافت کچھ زیادہ طویل نہیں.. دُکھ کے دن کٹ چکے.. ہم ہوپ کے قصبے میں رات کریں گے..''

''ہوپ؟.. یعنی اُمید.. یہ بھی کسی قصبے کا نام ہو سکتا ہے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید وہ والا ہوپ.. یا وہ باب ہوپ امریکی کامیڈین جو اپنی موٹی ناک کے ساتھ ہمیں پھسپھسے لطیفے سنایا کرتا تھا..''

گونج قطعی طور پر محظوظ نہیں ہوئی اور سامان جیپ کے پچھلے حصے میں پیک کرنے میں جُت گئی..

اور یہ جو ہوپ تک کا سفر تھا اس کے راستے میں ہمیں وہی پریاں دکھائی دیں جنہیں دیکھ دیکھ کر ہم بے زار ہو چکے تھے..

کونسی پریاں؟

میرے ایک عزیز کاروبار کے سلسلے میں یوکرین گئے.. واپسی پر میں نے اپنی خصلت سے مجبور ہو کر اُن سے سوال جواب کیے کہ یہ یوکرین کیسا ہے، وہاں کے لوگ کیسے ہیں تو اُنہوں نے کہا ''تارڑ بھائی آپ ایئرپورٹ پر اترتے ہیں تو آپ کو ہر جانب پریاں نظر آنے لگتی ہیں کہ یوکرین کوہ قاف کے دامن میں واقع ہے.. جس عورت پر بھی نظر ڈالیں تو وہ نظر اُس کے چہرے کا طواف کرنے لگتی ہے.. لیکن دو چار روز بعد آپ ان پریوں کی کثرت سے بیزار ہو جاتے ہیں اور خواہش کرنے لگتے ہیں کہ کاش کوئی معمولی کالی کلوٹی شکل نظر آ جائے.. اس متواتر حُسن کی یک رنگی سے تو نجات ملے..''

تو ہوپ تک کا جو سفر تھا اُس کے راستے میں بھی ہمیں الاسکا اور یوکان کے مناظر کی وہی پریاں نظر آتی گئیں جن سے ہم بیزار ہو چکے تھے.. وہی لامتناعی جھیلوں کی نیلگوں دنیائیں، پت جھڑ کے منتظر زرد جنگل، بلندیوں سے گرتی آبشاریں جو شاہراہوں کے کناروں پر برستی ہماری جیپ کو بھگو ڈالتی تھیں.. پوشیدہ جھرنوں کی سرگوشیاں، ندیاں اور دریا ہی دریا اور سرخ لومڑیاں، خرگوش، بارہ سنگھے اور کبھی کبھار لڑھکتے اِدھر سے ظاہر ہو کر اُدھر رُوپوش ہوتے سیاہ ریچھ.. اتنے تواتر سے نظر آتے رہے کہ ہم بھی خواہش کرنے لگے کہ یا خدا کوئی پیاس بھرا دشت ہو جس میں ببول کے کانٹے ہوں، ٹھوکتے سانپ ہوں.. کوئی دھول آلود گرم راستہ ہو جس کی مٹی ہمارے چہروں کو بھوت نہیں، بھبھوت بنا دے پر.. یہ نہ تھی ہماری قسمت پریوں سے ہی واسطہ پڑتا رہا..

وہ بارش سیورڈ میں ہماری ہمہ وقت سہیلی یہاں بھی چلی آئی تھی.. ہوپ میں بھی برستی تھی.. بارش میں ازلوں سے بھیگتا ہوپ کا قصبہ ایک دریا کنارے جہاں رہائش گاہیں تو کم دکھائی دیتی تھیں البتہ ہوٹل اور موٹل کثرت میں تھے کہ یہ کیلگری سے وکٹوریا جانے والے مسافروں کا پسندیدہ شبینہ پڑاؤ تھا.. کیوں تھا میں یہ نہ جان سکا کہ یہ مجھے تو ہوپ لیس لگتا تھا..

''بیسٹ کانٹی نینٹل موٹل'' کے بورڈ کے برابر میں کاٹھ کا ایک بہت بڑا اُلو بھیگتا تھا اور وہاں متعدد کمرے خالی تھے..

کاٹھ کا یہ اُلو یقیناً گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے یہاں آویزاں کیا گیا تھا، جانے اس کی توجیہہ کیا تھی.. شاید یہ شب بسر کرنے کی علامت تھی یا یہ کہ اگر آپ کاٹھ کے اُلو ہیں تو ہمارے پُرآسائش ہوٹل کے کمرے ایسے ہیں کہ آپ کو بھی نیند آ جائے گی..

''یو لائک مائی آؤل..'' موٹل کا مالک چینی بابا دنیا کے ہر چینی کاروباری کی طرح کانوں تک آتی مسکراہٹ چہرے پر چپکائے ہمیں خوش آمدید کہتا تھا..

''ہمیں آپ کا الو بہت پسند ہے لیکن فی الحال پلیز ہمیں ہمارا کمرہ دکھا دیں..'' اور وہ چینی بابا نہایت خوشدلی سے ہمارا سامان کمرے میں منتقل کرنے میں ہماری مدد کر رہا ہے اور بار بار ''تھینک یو'' کہہ رہا ہے.. اُس نے تو اپنا اُلو سیدھا کر لیا تھا.. گونج کو جب یہ تسلی ہو گئی کہ شب بسری کے لیے میرا مناسب بندوبست ہو گیا ہے تو وہ موٹل کے برابر میں جو شاہراہ تھی، اُس کے دوسری جانب جو پارک شروع ہوتا تھا اور پارک کے کناروں پر بارش کے زور میں آیا ہوا دریا ٹھاٹھیں مارتا تھا گونج مجھے ''سویٹ ڈریمز'' کی خواہش کر کے اُدھر اُڑان کر گئی..

ہوپ کی یادداشت میں صرف وہ صبح درج ہے جب میں ناشتے سے فارغ ہو کر کمرہ نمبر بیس کے باہر گیلری میں ایک صوفے پر براجمان ہو کر اپنا پہلا سگریٹ سلگا رہا تھا کہ کمرے کے اندر ''نو سموکنگ'' کی سرخ وارننگ آویزاں تھی..

گدلے آسمان تلے ہوپ کی مرکزی سڑک سنسان ویرانی میں بھیگتی چلی جاتی ہے اور اُس پر واقع متعدد موٹل اور ہوٹل ابھی خوابیدہ ہیں، بائیں جانب ایک پارک کے سارے شجر تیز ہوا اور بارش کے زور سے گیلے ہو کر آداب بجا

لانے کی حالت میں دوہرے ہوتے جاتے ہیں اور وہ جو دریا تھامسن نام کا تھا اُس کے پانی کناروں سے اچھل کر پارک میں ایستادہ ایک نیلے بنچ پر آبشاروں کی صورت گرتے ہیں.. گونج وہیں کہیں ابھی خوابیدہ تھی..

اور میرے کمرہ نمبر بیس کے برابر میں ایک چھوٹا سالانڈری روم ہے جہاں موٹل کے چینی مالک کی چینی بیوی نہایت عرق ریزی سے درجنوں چادریں، تولیے، تکیوں کے غلاف اِستری کیے چلی جا رہی ہے جو ظاہر ہے اُس نے دھوئے تھے اور پھر اُس نے تن تنہا اس موٹل کے تمام کمروں اور اُن کے غسل خانوں کی صفائی کرنی تھی اور بستروں پر چادریں بچھانی تھیں اور ویکیوم کلینر سے قالین صاف کرنے تھے.. چینیوں کی سرتوڑ محنت کی اگر کوئی اور قوم قدرے ہم سری کرتی ہے تو وہ سکھ ہیں..

تو یہ ہوپ تھا..

ویسے اس ہوپ سے تو وہ موٹی ناک والا مسخرہ باب ہوپ زیادہ ہوپ تھا..

○●○●○

"وینکوور.. خوش آثار، خوش جمال... بنکوور"

ہم وہ جوگی تھے جو پہاڑوں سے اترے تھے جن کے کانوں میں سوائے سناٹوں کے اور کچھ نہ تھا اور جن کی آنکھوں میں ایک مدت سے کوئی انسانی شکل نہ اتری تھی اور یکدم ہم جوگیوں کے کان بہرے ہو گئے کہ اتنا شور تھا.. اور اتنے انسان تھے کہ آنکھوں میں سماتے نہ تھے..

ہم ہوپ سے سفر اختیار کر کے پچھلے پہر Pacific سمندر کی ایک شاندار آبنائے پر تنے ہوئے ایک ایسے طویل پُل پر سے گزرے جس پر دنیا جہان کی ٹریفک کا اژدہام پھنکارتا تھا.. ہمارے ایک عرصے سے خاموشیوں کے عادی بدن میں بھونچال سا آ گیا.. جوگی پہاڑوں سے اترے تو میدانوں میں شاہ حسین کے میلہ چراغاں کے ڈھول بج رہے تھے.. لیکن یقین جانیے ٹریفک کا یہ شور اور انسانوں کا یہ ہجوم ہمارے من کو بھایا، اُسے اطمینان سے ہمکنار کیا کہ صد شکر ایک سو برس کی تنہائی اختتام کو پہنچی..

سمندر پر معلق اس طویل پُل کے آر بھی اور پار بھی کینیڈا کا سب سے خوش آثار اور خوش جمال شہر وینکوور پھیلا ہوا تھا.. یہ اپنے محل وقوع کے حسن سے کینیڈا کے دیگر بڑے شہروں ٹورنٹو، مانٹریال اور اٹاوہ وغیرہ کو گہناتا تھا، اور یہ سمندر تھا اور اُس کے کناروں پر اٹھتی وہ سرسبز پہاڑیاں تھیں جو اُس سے گلے میں سونے چاندی کے زیور پہنا کر اسے دل کش اور دلربا کرتی تھیں.. اسے "لٹل نیویارک" بھی کہا جاتا تھا لیکن نیویارک میں حسن اور دلآویزی کا یہ ٹھہراؤ نہ تھا..

ہم شام ڈھلنے تک اس کے کوچہ و بازار میں پُرخمار اور پُرمسرت گھومتے پھرے.. واقعی اس شہر کا مزاج شاعرانہ تھا.. یہاں کی حسیناؤں کی چال اور اُن کے لباس ذوق جمال کے آئینہ دار تھے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر حسینائیں چینی تھیں اور کچھ کچھ سردارنیاں بھی تھیں کہ وینکوور میں شاندار محل نما رہائش گاہیں سردار حضرات کی تھیں جن کے آباؤ اجداد اس شہر کا تلفظ ادا کرنے سے قاصر اسے بنکوور کہتے تھے اور اب بھی اُن کی آل اولاد اسے وینکوور نہیں بنکوور ہی کہتی تھی:

دنیا کے درجنوں بھی نہیں سینکڑوں شہر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر آپ نے.. ابدی روم نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا.. قرطبہ نہیں گئے تو کہیں نہیں گئے.. اگر مرنے سے پیشتر پیرس نہیں دیکھا تو آپ اطمینان سے مر نہیں سکیں گے.. اصفہان نصف جہان ہے.. شی آن کی کیا شان ہے.. خاک کاشغر کو نہیں چھوا تو آپ کی زندگی اکارت گئی.. سمرقند، بغداد، غرناطہ، برلن.. تبریز.. دلّی.. اور یہ فہرست بہت طویل ہے اور بھولیے مت کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ تو پیدا ہی نہیں ہوا.. تو ان کے دعوے آسانی سے جھٹلائے نہیں جا سکتے.. لیکن میں چاہتا ہوں کہ وینکوور کو بھی تھوڑی سی گنجائش عطا کر دیں.. اگر

لاہور، لاہور ہے تو پھر وینکوور بھی وینکوور ہے..

ساحل کے قریب اس کی بلند عمارتوں کا ایک مجموعہ ایسا ہے جو سراسر آئینہ ہی آئینہ ہے..وہ ایک دوسرے پر یوں عکس در عکس ہوتی ہیں کہ اُن کی شناخت مشکل ہونے لگتی ہے..اگر آپ ایک خاص عمارت کی جانب بڑھ رہے ہیں تو ذرا نزدیک ہونے پر کھلتا ہے کہ وہ تو کسی اور عمارت پر عکس ہو رہی ہے اور دراصل وہ آپ کی پشت پر ہے..

پانیوں کے کناروں پر آباد اور وہ بستیاں جو پانی کے اندر تک چلی جاتی ہیں وہ ہمیشہ خوش کشش اور دل کش ہوتی ہیں کہ پانی زندگی ہوتے ہیں جو اُن بستیوں کو جامد نہیں ہونے دیتے اُنہیں اپنے حسن کے بہاؤ میں رکھتے ہیں..جیسے استنبول، جنیوا اور کسی حد تک نیویارک..وینکوور بھی پیسفک سمندر کی خلیجوں اور جزیروں میں سے ایک آبی طلسم کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے..

لاؤ اپنے حُسن کی نیا نیناں اُتریں پار..

بندرگاہ کے دہانے پر سڈنی کے آپرا ہاؤس اور دبئی کے ہوٹل برج العرب کی مانند بادبانی کشتیوں ایسی شکل کی ایک سفید براق عمارت ہے اور واقعی خدشہ رہتا ہے کہ اس کے بادبانوں میں ہوا بھر جائے گی اور یہ عمارت سمندر میں تیرنے لگے گی..اس کے پس منظر کے ساتھ تصویر اُتروانا یہ ثابت کرنا تھا کہ کبھی ہم بھی وینکوور میں تھے، چنانچہ نہایت اہتمام سے مسکراتے ہوئے ایک عدد تصویر اُتروائی..

مرکزی چوک کے درمیان میں اُبلتے فواروں کے آبشار پانیوں کے پار وینکوور کا میوزیم واقع تھا جس کی پیشانی پر ایک وسیع بینر آویزاں تھا اور اُس پر میرے ایک پسندیدہ مجسمہ ساز روڈین کا نام درج تھا اور اُس کے مشہور عالم مجسمے ''دے تھنکر'' کی تصویر تھی..میں نے ابھی پچھلے ماہ نیویارک کے میٹروپالٹن میوزیم میں روڈین کے تراشے ہوئے کیسے کیسے شاہکار مجسمے دیکھے تھے اور اُنہیں دیکھنے میں کتنے پہر گزارے تھے....روڈین کے مجسموں کی نمائش میں ابھی کچھ روز باقی تھے..اگر یہ نمائش اُسی روز ہوتی تو میں اسے دیکھے بنا اس شہر سے رخصت نہ ہوتا..

ہم نے اب اس عمر میں نہیں کہیں جانا اور نہ آنا..نہ اپنے لاہور کے سوا کہیں بسیرا کرنا کہ گئے زمانوں میں کم از کم یورپ کا کونسا ایسا شہر تھا جس میں ہم ہمیشہ کے لیے بسیرا نہ کر سکتے تھے..لیکن بالآخر ہم نے بسرام کیا، آرام کیا تو اپنے لاہور میں..لیکن اگر کبھی کینیڈا میں مستقل قیام کر جانے کی کوئی مجبوری درپیش ہو جائے تو پھر..ٹورنٹو یا مانٹریال نہیں..یہی وینکوور..
ہمیں است وہمیں است!

سُلوچنج نے محسوس کر لیا کہ میں اسیر ہوتا جاتا ہوں تو شام کے ڈھلتے ہی اُس نے میرے بازو کو جھنجھوڑا ''کیا تم وینکوور میں آج کی شب بسر کرنا چاہو گے؟''

''بس یہی تو وہ جگہ ہے۔''

''دیکھو اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اگر ہم نے شب گزارنی ہے تو یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کوہستانی قصبہ ہے وِسلر نام کا...اور اُس کی بلندیوں پر دُھند کے سرد خواب تیرتے پھرتے ہیں اور اگر تمہارے کمرے کی کھڑکی کھلی ہو تو وہ اُس میں سے داخل ہو کر تمہارے رخساروں کو گیلا کر دیتے ہیں..تو پھر تم کیا کہو گے..''

○●○●○

''خزاں کی بے لباسی میں..کوہستانی قصبے وِسلر کی دُھند میں''

ہم وینکوور کے سحر سے نکل کر ایک ایسی گھنی خاموشی میں آئے جہاں سڑک کے کنارے ایک گیس سٹیشن پر ہم اپنی جیپ کا پیٹ بھرنے کے لیے رُکے تو ہمارے برابر میں گندمی رنگ کی ایک سوہنی مُٹیار اپنی سپورٹس کار میں سے باہر آئی جو اگر ایک تنگ جین اور بلاؤز میں نہ ہوتی، کُرتے اور لاچے میں ہوتی تو ایک ہیر ہوتی..وہ اپنی سپورٹس کار پر جھکی تو اُس کی پُشت کیسی دل کو لبھانے والی تھی..

''ٹھرکی..'' سُلوچنج نے فوراً سرزنش کی اور میں سنبھل گیا..

وِسلر کو اُٹھتے پہاڑی راستے کو ''آسمان میں بچھا ہوا راستہ'' کہتے ہیں تو ہمیں اُس پُرپیچ راستے پر سفر کرتے رات نے آلیا..جیپ کے شیشے دُھندلانے لگے کہ باہر ہر سُو دھند کا سرد آسیب تیرتا پھرتا تھا..اور سردی اتنی تھی کہ وہ جیپ کے اندرون میں سرایت کرتی ہیٹر کی حِدّت کو بھی یخ کرنے لگی..اس طویل یُوکان، الاسکا..برٹش کولمبیا کے سفر کے دوران ایسی سردی سے تو پالا نہیں پڑا تھا اور یہاں پالا پڑ رہا تھا..اور جب ہم جتنا بلند ہو سکتے تھے، ہو چکے تو ہمیں وِسلر کا پہلا گھر دُھند میں ڈوبا ہوا دکھائی دیا..اور رات کے گیارہ بج رہے تھے..اور اب ہمیں اس اجنبی دُھند بھری شب میں کوئی ٹھکانہ تلاش کرنا تھا..

یہ جو ہمارا لامتناہی بے انت دنیا کے طویل ترین ویرانوں اور مناظر کے حیرت کدوں کا سفر تھا تو ہم سرشام کئی اجنبی دیاروں میں داخل ہوئے..وہاں شب بسر کی لیکن..لیکن اس وِسلر کی کوہستانی بستی نے مجھ پر ایک عجیب ساحرانہ اثر کیا..مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اب تک بے حساب مسافتوں کے سمندروں میں اس جیپ کی بادبانی کشتی میں بھٹکتا پھرا تھا، بہت سے بے نام جزیروں میں شبیں گزارتا رہا لیکن یہ جو وِسلر کا بلند پہاڑی جزیرہ تھا، جو بہتی دُھند میں کبھی نمودار ہوتا تھا اور کبھی اُس میں تحلیل ہوتا تھا تو یہ میرا پہلا پڑاؤ اور آخری منزل ہے..

اس اثر اندازی کے شاید کچھ اور سبب تھے..
وِسلر کے قصبے میں ڈولتی، ڈوبتی ابھرتی، کہیں ململ کی مانند جس کے پار سب نظر آ جائے اور کبھی سفید کھدر کی طرح دبیز ہوتی دُھند مجھے مری، نتھیا گلی اور ایوبیہ کی یاد دلاتی تھی اور وہ دُھند وِسلر کی دُھند کی مانند بے رُوح اور بے ذائقہ نہ تھی، اُس میں چیڑ کی گھنی، سرسبز اور ہوا کے زور سے سرسراتی مہک تھی اور اپنی مٹی کی خوشبو تھی۔

اُن زمانوں میں جب بچے اپنے ماں باپ کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے..اُن کے چہروں کی

جانب تکتے جاتے ہیں، اُن کی انگلی نہیں چھوڑتے کہ کہیں کھو نہ جائیں.. اور کچھ ایسے بچے بھی نہیں کہ بے شک کالجوں میں پڑھتے ہوں تو ان دنوں ہم خاصی باقاعدگی سے لاہور کی تور تپش سے فرار ہو کر جب کہ ہمارے جھلستے بدن بھٹی میں مکئی کے دانوں کی مانند گرمی دانوں سے پھولتے تھے تو ہم مری کا رخ کرتے تھے..

اور وہاں جو ہمارا موسمی گھر ہوا کرتا تھا اُس کی چوبی خوشنمائی زوال پذیر ہو رہی تھی۔ وہ مال روڈ سے بہت طویل فاصلے پر واقع تھا اور وہاں تک کوئی باقاعدہ راستہ تو نہ تھا جھاڑ جھنکار اور بارش سے بھیگتی جھاڑیوں میں ایک پگڈنڈی تھی جس پر چلتے ہوئے ہم سب بہن بھائی کبھی پھسلتے تھے، کبھی بھٹکتے تھے اور کبھی ڈر کے مارے چیخیں مارتے تھے اور پھر بالآخر اُس کشمیری طرزِ تعمیر کے سراسر چوبی مکان تک پہنچتے تھے جس کا پورا وجود بارشوں اور برفوں کو سہتا سہتا اب کھوکھلا ہو چکا تھا.. کوئی دروازہ مکمل طور پر بند نہ ہوتا تھا.. اور کمروں کے تختوں میں سے نہ صرف سرد کٹیلی ہوا بلکہ دُھند بھی سرایت کرتی اندر چلی آتی تھی اور ہم سب رضائیوں میں لپٹے ٹھٹھرتے امی کے بدن کی قربت سے کچھ حدّت حاصل کرتے اباجی کی سفری داستانیں سنا کرتے تھے کہ کیسے وہ کاروبار کے سلسلے میں پاکستان بننے سے پیشتر کلکتہ، بنگال اور جانے کہاں کہاں گئے اور پھر وہ کمرہ دُھند سے ایسے بھر جاتا تھا کہ اباجی کا سرخ اور سفید.. اپالو دیوتا کے حسن سے بڑھ کر چہرہ بھی اُس دھند میں ملفوف ہو جاتا تھا..

ہم نے بعد میں مری کے نہایت پُر آسائش گھروں میں جو کہ بہت جدید تھے، وہاں بھی قیام کیا.. لیکن ہم اُس لکڑی کے بوسیدہ مکان کے لیے اداس ہوتے رہے..

اور پھر ایک سیزن جب ہم سب بچے خاصے بڑے ہو چکے تھے، ماں باپ کی اُنگلی تھامے بغیر چل سکتے تھے، ہم اک روز بمشکل وہ پگڈنڈی تلاش کر کے اُس ڈریم ہاؤس تک پہنچے تو وہ ڈھے چکا تھا.. زمین بوس ہو چکا تھا.. اس کی گیلری کا ایک حصہ گھنی جھاڑیوں میں بارشوں کی زد میں آ کر اپنی پہچان کھو چکا تھا.. وہ چوبی کمرہ بھی بوسیدہ ہو کر ڈھے چکا تھا جس کے اندر ہم رضائیوں میں پوشیدہ اپنے اباجی کی سفری داستانیں اشتیاق سے سُنا کرتے تھے..

دُھند بالآخر ہمارے ڈریم ہاؤس کو فنا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی..

میں نے کھڑکی اسی لیے کھلی رکھی تھی..

کہ اس کے راستے میرے اباجی اور امی کے چہرے بھی چلے آئیں.. مجھ سے باتیں کریں.. پوچھیں تو سہی کہ.. بیٹا تم کہاں چلے آئے ہو.. اور کیوں چلے آئے ہو.. اور ہم سے اتنی دور کیوں چلے آئے ہو.. ہم تو گلبرگ کے ایک قبرستان میں کب کے پوشیدہ ہو چکے، پھر بھی تمہاری اتنی طویل دُوری سہی نہیں جاتی.. پاس آ جاؤ، پاس سے گزرتے ہوئے ہمارے لیے فاتحہ پڑھ لو.. اتنے دور کیوں ہو..

وِسلر کی شب بسری کے واسطے جو ٹھکانہ نصیب ہوا.. جو لاج ملا اور گئی رات ملا اُس کی آسائش اور سہولت فیئر بینک کے سوفی ہوٹل سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس لاج کے عین سامنے کھڑے ہو کر اُس پر نظر ڈالیے تو یہ سیمنٹ اور لوہے کا

ایک ایسا بھاری وجود لگتا تھا جس کے اندر شاید ایسی تنصیبات تو موجود ہوں رہائش کے لیے کمرے نہیں ہو سکتے.. اور اس کی راہداریاں بھی تنگ اور روزنوں سے عاری تھیں، کسی خفیہ مقام تک جاتی سُرنگیں لگتی تھیں لیکن جب کمرے کا دروازہ کھلتا تھا تو ایک پوشیدہ رہائشی جنت کی وسعت سامنے آ جاتی تھی..

ایک ایسا ماڈرن اور جگمگاتا کچن جس میں ایک بارات کے لیے بھی کھانا تیار کرنے اور کھلانے کے وافر لوازمات موجود تھے.. ڈنر سیٹ، وائن سیٹ، کرسٹل کے گلاس اور ہر نوعیت کی مشینیں.. فریج، ٹوسٹر، مائیکرو ویو، فریزر اور جانے کیا کیا الا بلا.. دائیں جانب ایک پرائیویٹ خواب گاہ.. اور کچن کے سامنے ایک وسیع لونگ روم جس کی شیشہ دیوار وِسلر کے چند خوشنما گھروں اور اُن کے پار جو دُھند میں ڈوبے پہاڑ تھے اُن پر کھلتی تھی اور اُس دُھند میں سے کن من بوندیں اُترتی تھیں.. اور ایک قدیم طرز کا آتش دان جس میں وِسلر کے جنگلوں کی لکڑی دھڑ دھڑ جلتی تھی..

آج کا سفر کچھ زیادہ تھکن والا نہ تھا پر تھکن جتنی بھی تھی گرم شاور کے بھاپ آلود پانیوں کے ساتھ بہہ گئی اور میں لباس تبدیل کر کے آتش دان کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گیا.. پھر فوراً ہی اٹھا اور تمام روشنیاں اور ٹیبل لیمپ بجھا کر صوفے پر آ بیٹھا.. اب آتش دان میں بھڑکتی آگ کی تمازت تھی جو پورے کمرے میں شمالی روشنیوں کی مانند لہروں کی صورت ایک مدھم تلاطم میں اگرچہ خاموش کبھی میرے چہرے پر اپنی پرچھائیاں ڈالتی اور کبھی سامنے والے خالی صوفے کو روشن کر دیتی۔

وِسلر کی اُسی شب میں، میرے لیے ابھی تک ایک نا آشنا اور گمنام کوہستانی قصبے کے لاج کے اندر آتش دان میں جو شعلے لپکتے تھے وہ تو میرے رفیق نہ ہو سکتے تھے.. وہ ایک بھڑکتا سراب تھے جس نے ابھی چند ساعتوں کے بعد راکھ ہو جانا تھا.. وِسلر کے اس لاج کے وسیع لونگ روم میں اتنا بڑا خالی پن تھا اور آتش دان میں سلگتے مردہ ہو چکے شجروں کے تنے اُس خالی پن کو مزید وسیع کرتے تھے..

میرے سامنے پڑا خالی صوفہ یوں لگتا تھا کہ منتظر ہے کہ کوئی آئے اور مجھے اپنے بدن سے بھر دے..

وہاں کسی نہ کسی کو تو ہونا چاہیے تھا..

کسی زرد بن کو، خزاں کی بے لباسی میں.. صوفے کے بازو پر اپنی ٹہنی کہنیاں ٹکائے اُن پر اپنا مکھ جمائے مجھے تکتے ہوئے....

اور جیسے تپائی پر رکھے کرسٹل کے جگمگاتے گلاس میں گریپ فروٹ جُوس نہ تھا ایک زرد آتش سیال تھی جو میرے بدن میں اُترتی مجھے تنہائی کے ایک خمار سے آشنا کرتی تھی..

جس کو دیکھا خمار میں دیکھا..

اور دیکھا کہ ایک بے لباس چہرہ ہے جو صوفے کے بازو پر اپنی کہنیاں ٹکائے، ہتھیلیوں کی قوسوں میں اپنا حُسن اور پھڑ پھڑاتی آنکھیں تصویر کیے مجھے تکتا ہے اور اُن آنکھوں میں آتش دان کی آگ بھڑکتی ہے.. اور اُن آنکھوں میں پردگی کے سیاہ ڈورے ہیں.. اُس کے موٹے ہونٹ وا نہیں ہوتے میری جانب دیکھتے گیلے ہوتے ہیں..

تنہائی کا سراب بھی آپ کو کیسے کیسے کرشمے دکھاتا ہے کہ جو موجود نہیں ہوتا وہ موجود ہوتا ہے..

جب محبت کا الاؤ بدن اور رُوح کو بھسم کر دے تو وہ ایک لڑکی جب آپ کی طرف دیکھتی ہے تو اُس کے دیکھنے سے کُل جہان جان جاتا ہے کہ روندی گئی ہے.. کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہتا، سب کو خبر ہو جاتی ہے.. وہ تو جب سے اُس نے جوانی کی وادیٔ سرمست میں قدم رکھا ہے دیکھتی آئی ہے.. اپنے بہن بھائیوں کو.. سہیلیوں اور رشتے داروں کو.. دوکانداروں، پروفیسروں اور رکشا ڈرائیوروں کو.. لیکن جب وہ آپ کو دیکھتی ہے تو اور طرح دیکھتی ہے... ایک مر مٹنے کی آرزو اور مکمل خود سپردگی کی خواہش اُس کی آنکھوں میں یوں نقش ہوتی ہے کہ کُل دنیا کو خبر ہو جاتی ہے کہ یہ تو گئی..

تو وہی شکل.. جس کے بارے میں منیر نیازی نے کہا تھا کہ.. اُس شکل کو میں نے بُھلایا نہیں.. میرے سامنے صوفے پر بے لباس بیٹھی تھی.. مجھے صرف اُس کا چہرہ اور بدنی ابھاروں کا آغاز نظر آ رہا تھا.. اُس کا بقیہ بدن صوفے کے بازو کے عقب میں پوشیدہ تھا.. اور میں جانتا تھا کہ اُس کے پورے وجود میں آتش دان میں سلگتی آگ سرائت کر رہی ہے..

تنہائی کا سراب اور وہ بھی ڈِسلر ایسے گمنام کوہستانی قصبے کی رات میں.. ایک لاج کے وسیع لونگ روم میں آتش دان کے مدھم ہوتے شعلوں کے سامنے.. آپ کو کیسے کیسے کرشمے دکھاتا ہے.. جو موجود نہیں ہوتا اور آپ خواہش کرتے ہیں کہ وہ موجود ہو تو وہ موجود ہو جاتا ہے..

لونگ روم کی دیوار شیشہ کھڑکی پر دُھند اپنے سفید سانس لیتی اُسے دُھندلاتی تھی.. اور جھانکتی تھی کہ اندر کون ہے..

اور اُس کی سفید آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اندر آتش دان کے سامنے صوفے پر بیٹھا ایک شخص ہے.. تنہا ہے اور اپنے سامنے کے خالی صوفے کو ایک گئے زمانوں کے پیار میں رنگی مسکراہٹ سے دیکھتا چلا جا رہا ہے..

دن کی روشنی میں ڈِسلر اپنی دُھند سے خالی پچھلی شب کے سحر سے بچھڑ چکا تھا.. اگرچہ اس کی جاذبیت میں دل کو مسحور کرنے والے سب سامان تھے.. لیکن یہ جاذبیت قدرتی نہ تھی.. اس کے کوچہ و بازار، قدیم لگتے چرچ، ندیاں اور اُن پر بچھے پُل، گل و گلزار، ریستوران اور اُس کا مرکزی چوک سب کے سب کسی سنڈریلا کا خواب تھے.. تصور میں جو کچھ ایک کوہستانی قصبے کی رومانی تصویر ہوتی ہے وہ ایک مکمل ماڈل کی صورت میں نہایت نفاست سے ترتیب دی گئی تھی کہ اسے کسی سوس یا آسٹرین کوہستانی قصبے کے ماڈل پر تعمیر کیا گیا تھا..

اور اس میں کچھ حرج نہ تھا..

میں بھی کبھی کبھار خواہش کرتا ہوں کہ کاش وادیٔ کاغان کا ناران.. کسی آسٹرین یا سوس تعمیراتی ادارے کے سپرد کر دیا جائے اور وہ اس کے بدنما ہوٹلوں اور بازاروں کو جن میں کڑاہی گوشت کے مرغ اس کی سرد ہواؤں میں ننگے اکڑتے ہیں، ان سب کو ملیامیٹ کر کے وہاں ایک منظم اور دیدہ زیب سوس طرز کا قصبہ تعمیر کر دیں تو پھر لوگ سوئٹزرلینڈ جانا ترک کر

دیں.. اپنے وطن میں اُس سے کہیں بہتر نظاروں والے ناران میں جائیں..

ڈِسلر میں بھی جو بھی شجر تھے.. ندیوں کے کنارے مرکزی چوک میں یا اُس کے پار پہاڑوں پر وہ بھی ستمبر کے زوال کی زد میں آ کر زرد ہو رہے تھے..

آج سویرے جب میں بیدار ہوا اور کچھ دیر پہلے ہی تو آنکھ لگی تھی کہ تنہائی نے مجھے رات بھر جگائے رکھا.. یار نے مجھ کو میں نے یار کو سونے نہ دیا.. تو لونگ روم دھوپ سے بھرا ہوا تھا.. اور آتش دان کے سامنے والا صوفہ خالی پڑا تھا.. ٹونج ہمیشہ کی طرح مجھے اس لاج میں جمع کر کے ڈِسلر کی کسی دھند آلود کُنج میں جا سوئی تھی اور ہمیشہ کی طرح نہائی دھوئی لونگ روم میں اٹھلاتی پھرتی تھی.. مجھے یقین تھا کہ وہ کسی جھیل میں نہا کر نہیں نکلی لاج کے غسل خانے میں شاور کر کے نکلی ہے اور میں اُس پر شک کرتا تھا کہ آخر اُسے نہانے کی حاجت کیوں ہو جاتی ہے ہر سویر.. اور میں اگر پوچھ سکتا تو ضرور پوچھتا کہ.. چن کتھاں گزاری آ رات وے..

ہم نے دوپہر کا کھانا ''ویلج سکوئر'' میں کھایا جس کے چار چفیرے کیسے کیسے خوابناک خوش آثار ریستوران تھے جن پر ذرا سی ہوا کے چلتے ہی زرد پتے یوں برستے تھے کہ آپ اپنا مشروب اٹھاتے تھے تو سطحِ مشروب پر ایک زرد پتہ تیرتا تھا..

ہم نے ڈِسلر جتنا بھی تھا خوب جی بھر کے دیکھ لیا..
وہ دھند کے بغیر روزِ روشن میں کچھ بے روح سا لگتا تھا..
انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں دل کو لگانا کیا..

○●○●○

''مجھ کو بہتے جانے دو.. نیلگوں سمندروں میں دفن ہو جانے دو''

ہر قوم کی سُوئی اپنے کسی نہ کسی شہر پر اٹکی ہوتی ہے.. اور کُل عالم دوہائی دے کہ اے انگریز دا آخر برائٹن جیسے بارش میں بھیگتے ساحلی شہر میں کیا رکھا ہے لیکن وہ برائٹن کو گلے سے لگائے رہیں گے..... جرمنوں کے لیے ڈریڈزن.. ترکوں کے لیے ازمیر.. سویڈن والے مالمو کے شیدائی.. ایرانی شیراز پر جان دیتے ہوئے.. مراکشی کاسابلانکا پر مرتے ہوئے.. ہسپانوی بارسلونا کا نام لیتے ہی بے ہوش.. یہاں تک کہ پاکستانی مری ایسے پراگندہ شہر کو ''ملکۂ کوہسار'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ کچھ اسی طور کُل کینیڈا کی سوئی وکٹوریا پر اٹکی ہوئی ہے.. اگرچہ بینف پر بھی اٹکی ہوئی ہے پراتنی نہیں جتنی وکٹوریا پر اٹکی ہوئی ہے..

ہمیں یوں بھی مجھے اور سُونج کو ایک دوسرے سے بچھڑنے کے لیے وکٹوریا جانا تھا جہاں ایک آبی پرندہ اُس کا منتظر تھا..

اور یہ جو وکٹوریا کا ساحلی شہر تھا، یہ آبنائے جارجیا کے پار تقریباً دو گھنٹے کی سمندری مسافت کے پار وینکوور آئی لینڈ کے آخری کونے پر کہیں اٹکا ہوا تھا..

اگر سیّاں جی نے وینکوور سے پار وینکوور آئی لینڈ میں اترنا تھا تو ایک ایسی فیری کا سہارا لینا تھا جس کے پیٹ میں سینکڑوں کاریں، لینڈ روور اور جیپیں وغیرہ آسانی سے سما جاتی ہیں اور اُن میں سوار مزید سینکڑوں مسافر اُس کے مختلف عرشوں پر بکھر جاتے ہیں..

آپ ان دو گھنٹوں کے دوران.. آبنائے جارجیا کے پار واقع نانائمو کی بندرگاہ تک یا تو اس سمندروں پر رواں فیری کے اس قصبے کے اندرون میں، ایک مکمل خاموشی میں.. جہاں اس کی روانی کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی وہاں کسی نشست پر اونگھ سکتے ہیں.. اخبار کا مطالعہ کر سکتے ہیں یا ہم سفر ایسے جو جنس مخالف سے ہوں اُن کا بھی مطالعہ کر سکتے ہیں یا بھوک نہ بھی ہو تو ریستوران میں براجمان مُنہ مار سکتے ہیں اور یا پھر بقول عدم کہ.. یوں تو سفر حیات کا بے حد طویل تھا اور میں مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا تو آپ اس طویل سفر کو فیری کے مے کدے کی راہ سے ہو کر مختصر کر سکتے ہیں..

اور اگر آپ بہت ہی گئے گزرے اور کور ذوق ہیں اور اُن آبی راستوں کے آس پاس جو منظر گزرتے ہیں اُن

پر نگاہ رکھنے کے شائق ہیں تو اُس اندرون کی پُرسکون عافیت میں سے نکل کر تیز ہوا اور نمکین شور کو بدن پر جھیلنے کے لیے عرشے پر چلے آئیے..

میں چلا آیا..

اور میں اپنے آپ پر کیسا ستم کرتا اگر نہ چلا آتا..

یہ رود بار انگلستان کا.. ڈوور کی سفید چٹانوں سے فرانس کے قصبے کیلے تک کا بے رُوح سفر نہ تھا کہ سٹیمر کے آس پاس سوائے سمندر اور دُھند کے کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا.. بے شک اسی نوعیت کے ایک سفر کے دوران سٹیمر کے عرشے پر ایک سرخ کوٹ میں ٹھٹھرتی مجھے ایک لڑکی ملی تھی جس کا نام پاسکل تھا.. اور وہ ذہن سے اترتی تھی پر دل کے کسی کونے میں ابھی تک ایک اپاہج وینس کے مجسمے کی مانند آویزاں تھی..

یہ وینکوور جزیرے کی جانب رواں فیری جن آبی شاہراہوں میں سے گزرتی تھی وہ آب اور وہ راہیں جامد ہو چکے لگتے تھے.. کہیں کہیں اور یہاں ابھی تک خزاں نہ اتری تھی سرسبز شجروں سے بھرے مختصر جزیرے تھے جن کے اندر کچھ مکان تھے اور اگر مکان تو تھے تو اُن کے اندر مکین بھی تھے تو وہ کیسی یکتا خوشنمائی میں رہائش رکھتے تھے.. اُن کے مکانوں کے صحن نیلگوں سمندر میں تھے جہاں اُن کی وہ موٹر بوٹس ڈولتی تھیں جن کے ذریعے وہ وینکوور تک پہنچتے تھے..

ایک سفید بادبانوں والی پُرتمکنت کشتی ایک تتلی کی مانند سمندر کی نیلی چادر پر سرکنے لگی.. وہ چادر جو ہموار تھی اُس کے سرکنے سے کروٹوں میں یوں بدلی جیسے وصال کی سویر میں بستر کی چادر سلوٹوں سے.. شکن در شکن ہوتی ہے..

میں ایک مختلف منظر پر نظر کرنے کی آرزو میں چند سیڑھیاں اترا تو جہاں فیری کے انجنوں کی میکانکی آہ وزاری بلند ہو رہی تھی وہاں ایک خوش شکل جوڑا ایک طویل بوسے کی مسافت طے کر رہا تھا اور انہیں دیکھ کر میرا جی خوش ہو گیا کہ وہ ابھی نوجوان ہیں، انہیں زندگی کے راستوں اور محبت سے لطف اندوز ہو لینے دو.. کل یہ سب کچھ نہیں رہنا.. جذبے اور خون سرد ہو جائیں گے اور آپ دونوں بوڑھے ہو کر.. ایک دوسرے کی رفاقت میں یا جدا جدا کسی آتش دان کے سامنے بیزار بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہوں گے تو جب تک یہ آتش سلگتی ہے اس سے گریز نہ کرو..

عرشے پر موجود بیشتر لوگ تیز ہوا کو سہتے ہوئے فیری کی آہنی بالکونیوں سے نیچے رواں سمندر میں جھانکتے تھے.. اور کچھ عمر کے مارے ہوئے بنچوں پر براجمان اونگھتے تھے اگرچہ میں بھی عمر کا مارا ہوا تھا.. پر مجھ میں جو ہوس تھی منظروں کی.. وہ مجھے چین نہ لینے دیتی تھی اور میں ریلنگ پر جھکا تیز ہوا کے تھپیڑوں کو سہتا فیری جن نیلگوں سمندروں میں بے آواز تیرتی چلی جاتی تھی میں اُن کے پانیوں کو ایک ایسی محویت سے دیکھتا چلا جاتا تھا جیسے اُن کی نیلگوں روانی نے مجھے باندھ کر رکھ دیا ہو.. مجھ پر جادو کر دیا ہو اور تب.. میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کچھ مبالغہ نہیں کرتا کہ یُوکان اور الاسکا کے بعد مبالغے کی گنجائش ہی نہیں رہتی.. میں نے ریلنگ پر سے جھانکتے ہوئے نیلے سمندر میں بہتا ہوا چنار کا ایک خزاں رسیدہ پتّہ دیکھا..

وہ سمندر کی نیلاہٹ میں زردی کی ایک مُہر تھی..

نیلاہٹ پرثبت کردی گئی تھی اگرچہ بہتی چلی جاتی تھی..

میں نے نہ کسی جزیرے کی جانب نگاہ کی..نہ ہی کسی بادبانی کشتی کو نظر میں اُتارا..اُس اکلوتے خزاں رسیدہ چنار کے پتے کو سمندر میں بہتے بہتے اپنے سے دور ہوتے دیکھتا رہا..

''نیلگوں سمندروں میں..
جیسے ایک ماں کی جھولی میں..
نیلو نیل جھولی میں..
جُھولتا ایک پتہ ہے..زرد چنار پتہ ہے..
جو کہ بہتا جاتا ہے..
فیری کے آہنی وجود کے پہلو میں..
ایک تنہا خزاں رسیدہ پتہ ہے جو کہ بہتا جاتا ہے..
میں جُھکا سمندر پر..اُس پر نگاہ رکھتا ہوں..
اُس کو تکتا جاتا ہوں..
وہ جو ایک پتہ ہے جو کہ بہتا جاتا ہے..
وہ میں بھی ہوں..وہ میں بھی ہوں..
خزاں تو میں بھی ہوں..
میں بھی تو فنا کے اُس جھونکے کا منتظر ہوں..
جس نے مجھے زندگی کے شجر سے..
الگ کر کے کسی سیاہ سمندر میں بہا دینا ہے..
میں بھی تو گرنے کو ہوں..
اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر بھی یہی خزاں آ جائے..
تو مُجھ سے بچھڑ جاؤ..
مجھ سے الگ ہو جاؤ..
میں تو تمہارے بدن کی حدّت سے..
تمہارے پہلو سے جدا ہو کر کب کا نیلگوں سمندر میں..
بہتا جاتا ہوں..
فنا کی جانب بہتا جاتا ہوں..
تم سے دور ہوتا جاتا ہوں..

چند بار آنکھیں جھپکنے سے..
دو چار لمحے گزرنے سے..
یہ زرد پتہ تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا..
بہتا بہتا فنا کی سیاہی میں روپوش ہو جائے گا..
مجھ سے لگن مت لگاؤ..
نہ مجھ سے کچھ لگاؤ رکھو..
مجھ کو بہتے جانے دو..
نیلگوں سمندروں میں دفن ہو جانے دو..
مجھ سے کچھ لگاؤ مت رکھو..''

○●○●○

''وکٹوریا کی رات میں پیزا کھاتے ہاؤ ہاؤ کرتے گیدڑ''

سفر ایسا طویل تو نہ تھا لیکن شام ہوتی گئی اور جب ہم نے فیری سے اتر کر وینکوور آئی لینڈ میں قدم رکھا تو وہاں ہر شے بھیگ رہی تھی اسی لیے ہر سُو شام لگتی تھی.. نانائمو سے وکٹوریا تک کا سفر بھی ایسا تھا کہ اس کے راستے میں پڑتی بستیاں سب کی سب حُسن کی دلآویزی کے تمام مقابلے جیت سکتی تھیں.. بے شک یہ بارش تھی اور ہلکی دُھند تھی جو ہماری جیپ کے گرد بوند بوند برستی تھی اور وہ دُھند کیسے دل کش مکانوں اور بھیگتی گلیوں میں آہستہ خرام ہوتی تھی.. ڈنکن، ویورائل اور میپل ایسے خوابناک قصبے..

''آخر ہم نے وکٹوریا جا کر کیا لینا ہے.. یہیں کہیں قیام کر لیں، کیسے دل ربا مقام ہیں..''

''ہم نے وکٹوریا میں ہی شب بسر کرنی ہے کہ.. وہاں میرا انتظام ہو رہا ہے..'' گونج نے کچھ بجھے دل سے کہا ''وہی آخری منزل ہے۔''

جب ہم اُس رات وکٹوریا میں داخل ہوئے تو اُس کے اولین نقش نے دل پر ثبت ہونے سے انکار کر دیا بلکہ دل انکاری ہو گیا اُس کے اولین نقش کو اپنے پر ثبت کرنے سے.. وہ ایسا تو نہیں تھا کہ کینیڈا والوں کا یہ حال کر دے.. شاید یہ رات تھی جس نے اُس کی خوش نظری کو پوشیدہ کر لیا تھا..

''موٹر وے اِن'' کے کمرے نہایت شکستہ اور تھکے ہوئے مسافروں کو اپنی نفاست اور ستھرے پن سے خوش آمدید کہنے والے تھے.. سامان کمروں میں دھکیل کر ہم فوری طور پر خوراک کے حصول کے لیے نکل کھڑے ہوئے کہ وِسلر کے ناشتے کے بعد ہم اِدھر اُدھر ٹھونگیں تو مارتے رہے لیکن باقاعدہ کھانے کی جانب دھیان نہ کیا اور اب پیٹ کی پکار دوہائی دیتی تھی کہ میری کچھ پُوجا کر لو..

وکٹوریا گئی رات تک جاگنے والا نہیں بلکہ سرِشام سو جانے والا ساحلی قصبہ تھا.. شاید یہاں لوگ آتے ہی اس نیت سے ہیں کہ سرِشام سو جائیں.. لیکن وہ آتے بھی تو جوڑوں میں تھے..

وکٹوریا کے در و دیوار اور کوچہ و بازار پر واقعی وکٹورین عہد کی ایک قدیم چھاپ تھی، اس کی عمارتیں برطانوی طرز تعمیر کا پتھریلا شاہانہ پن اپنائے ہوئے تھیں اور اس کی مرکزی سٹریٹ پر بھی ایک چھوٹی موٹی ریجنٹ سٹریٹ کا گمان ہوتا

ساحلی قصبہ اہل کینیڈا کی جند جان تھا، وہ اس پر فریفتہ تھے اور اس فریفتگی کا ایک جواز یہ بھی تھا کہ شاید پورے کینیڈا میں
تھا.. یہ
وکٹوریا تھا جہاں برف نہیں گرتی تھی..
یہ
امریکی محاورے کے مطابق ایک ''فَن سٹی'' تھا لیکن یہاں بھی اُس سرکار برطانیہ کا جس کے اقبال کی بلندی کے لیے نہ صرف ہم ہندوستانی بلکہ سرسید اور اقبال بھی دعائیں کرتے تھے.. ایک دھیما پن تھا.. بلاّ گلاّ اور شور شرابہ نہ تھا.. تھا پر دھم دھم نچلے سُروں میں تھا.. جیسے پرانے انگریز اوپر والے ہونٹ کو اکڑا کر رکھتے تھے.. سٹف اَپر لپ یُو نو.. اسی طور وکٹوریا کھل کر مسکرانے یا قہقہے لگانے سے گریز کرتا تھا بس دل ہی دل میں غٹرغُوں غٹرغُوں کرتا رہتا تھا.. اور غٹرغوں کرتا کوئی دس گیارہ بجے ہی سو جاتا تھا چنانچہ ہم خوراک کی تلاش میں نکلے تو نہ کوئی ریستوران کھلا اور نہ ہی کوئی پیزا پارلر کھلا.. ہم خوراک کی آرزو میں بہت بھٹکے.. راہ چلتے لوگوں سے پوچھا.. وکٹوریا کی گائیڈ بک کو چھان مارا کہ کہیں تو کچھ سراغ ملے.. بالآخر فٹ پاتھ پر جھومتے، لڑھکنے سے بچتے خمار کے مزے میں مست ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ کچھ کھا رہے تھے تو اُن سے استفسار کیا کہ حضور آپ جو کچھ تناول فرما رہے ہیں یہ کہاں سے دستیاب ہے.. اُنہوں نے کرم کیا اور راہنمائی فرما دی..

اب وکٹوریا کی اُس رات میں جو واحد پیزا پارلر کھلا تھا تو وہ ہمارے ہاں کے چھپڑ ہوٹلوں سے بھی گیا گزرا تھا۔ وہاں جتنے بھی لوگ تھے نہایت مخدوش لگتے تھے جیسے ابھی ابھی جیل کی کوٹھڑیوں میں سے فرار ہو کر سیدھے اِدھر آن پہنچے ہوں۔ وہ بھوکے گیدڑوں کی مانند ہاؤ ہُو کرتے پیزے نگل رہے تھے.. اُن کی شکلیں بھی ناقابلِ اعتبار تھیں.. مردوں کے بازوؤں پر ٹیٹو گُھدے ہوئے.. اور خواتین عجیب سے بھڑکیلے میک اپ میں جیسے ہمارے ہاں کے خواجہ سرا کرتے ہیں اور ہمہ وقت کھی کھی کرتی اپنے رفیقوں سے لپٹتی ہوئی.. اس پیزا پارلر کے انتہائی معزز ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ میزوں پر جو نمک اور مرچ دانیاں تھیں اور پلاسٹک کی ٹماٹو ساس کی گندی بوتلیں تھیں اُنہیں باریک زنجیروں سے جکڑا گیا تھا تاکہ معزز گاہک اُنہیں جیب میں ڈال کر چمپت نہ ہو جائیں۔ ذاتی طور پر مجھے یہ بندوبست دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی.. اس سے پیشتر میرا خیال تھا کہ صرف ہم پاکستانی ہیں جو بڑے بے ایمان ہیں اور ہمارے ہاں ہی واٹر کولروں اور سبیلوں کے ساتھ جو پلاسٹک یا سلور کے گلاس ہوتے ہیں؛ اُنہیں زنجیروں میں باندھ کر رکھا جاتا ہے کہ کہیں کوئی ضرورت مند اُنہیں گھر نہ لے جائے.. ثابت یہ ہوا کہ یہ کینیڈا والے بھی کچھ کم بے ایمان نہیں..

یہاں ہمیں خاصے انتظار کے بعد جو پیزا میسّر ہوا اور اسے حاصل کرنے کے لیے تھوڑی سی چھینا جھپٹی کرنی پڑی اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ابھی ابھی تندور میں سے نکلا تھا اور خوب گرم تھا..

پیزا تو خیر کیا تھا ایک اکڑی ہوئی روٹی پر سکڑے ہوئے چند ٹماٹر تھے اور پنیر کی ایک بُو ند تھی، بہرطور یہ ہمارے تن تندور کی بھوک بجھانے میں معاون ثابت ہوا اگرچہ بعد میں عجیب سے ڈکار آتے چلے گئے..

تو یہ تھا وکٹوریا!

○●○●○

''جدائی کو دل سے مت لگاؤ، تم ایک سمندری بگلے لگتے ہو''

''موٹروے اِن'' کے اُس کمرے میں مجھے آرام بہت تھا۔

پہلی منزل پر واقع اس کمرے کی کھڑکی کے پردے ہٹانے سے وکٹوریا کے اُس آسمان کا ایک حصہ اندر آنے لگتا تھا جو پیسفک اوشن کی وسعتوں پر سایہ فگن تھا..اور یہاں بھی مجھے اُسی خالی پن نے آ لیا جس نے وِسلر کی رات میں مجھے دل گرفتہ کیا تھا..اس عمر میں یوں بھی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جانے اس مکمل اکلاپے میں اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی..ابھی دو چار برس پیشتر تک تو یہ خیال بھی نہ آیا تھا..اور اب آنے لگا تھا..

میں کم خواب دیکھنے والوں میں سے ہوں بلکہ خواب مجھے اپنا آپ نہیں دکھاتے اور اگر بہ فرضِ محال کوئی بھولا بھٹکا خواب آ ہی جائے تو صبح تک بھول کر بھٹک جاتا ہے اور یادداشت کے پلّے میں کچھ باقی نہیں رہتا کہ کیا دیکھا تھا..لیکن وکٹوریا کی اُس شب میں ایک مسلسل خواب بدن کی سکرین پر اپنے عکس ڈالتا رہا اور یہ ایک خاموش نہیں بلند آہنگ خواب تھا جس کے تمام لاؤڈ سپیکر کھلے تھے..میرے کانوں میں بے پناہ شور ہے، غُل ہے..میرے کمرے کے باہر وکٹوریا کا جو آسمان ہے وہ آبی پرندوں سے بھرا ہوا ہے اور کائیں کائیں کرتے چیختے چلّاتے اپنی اپنی بولیاں بولتے غدر برپا کرتے ہیں اور اُن بے انت پرندوں میں جو وکٹوریا کے سمندر پر جھکے آسمان کو بھرتے ہیں، میں ایک پرندے کو پہچان لیتا ہوں..اور وہ کُونج ہے..وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ قلقاریاں مارتی خوشی سے پاگل ہوتی اُن کے ہمراہ اڑانیں کرتی ہے، اُن کے ساتھ چونچ ملا کر اُن سے محبت کا اظہار کرتی ہے اور وہ سب کے سب بے انت پرندے اُس کے عشق میں گرفتار اُسے متوجہ کرنے کی خاطر اپنی اڑانوں کے کرتب دکھاتے ہیں..فضا میں قلابازیاں لگاتے ہیں..اور یہ وہ کُونج نہ تھی جو میری رفاقت میں یُوکان اور الاسکا کی طویل آوارہ گردیوں کے دوران ایک ناراض اور سُوجا ہوا مُنہ لے کر بیزار بیٹھی رہتی تھی..یہ تو کوئی اور نٹ کھٹ چنچل اور البیلی کُونج تھی جو غُل کرتی اُن پرندوں کے ساتھ نخرے کرتی اڑتی تھی..

شب بھر رہا چرچا ترا..

اگلی سویر میری آنکھ کھلی تو کھڑکی کے آگے تنے ہوئے پردوں میں سے دھوپ سرائت کرتی میری آنکھوں کے پپوٹوں پر پھیلتی اترتی تھی اور میں ایک سمندری نمکین نمی سونگھ سکتا تھا جو اُس دھوپ کے ساتھ چلی آتی تھی..

کمرے کے باہر جو ایک طویل گیلری تھی وہاں مجھے ایک سفید سراپا حرکت کرتا نظر آیا اور پھر دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی..میں نے بستر سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو کُونج اپنے پَر سمیٹتی اندر چلی آئی اور اُس کی سیاہ سحر آنکھوں میں بے خوابی کی سرخی تھی..

''کیا تم ٹھیک طرح سوئے؟'' اُس نے پیار سے نہیں، گنتاموبے کے ایک تفتیشی ایجنٹ کی مانند ڈانٹ کر پوچھا..

''تم نے سونے ہی نہیں دیا..''

''میں نے..''

''ہاں..رات بھر اتنے بے انت آبی پرندوں کے ساتھ تم غُل کرتی رہی ہو..اُن کے ساتھ فلرٹ کرتی رہی ہو تو میں کیسے سو سکتا تھا..''

''تو کیا تم حسد میں مبتلا ہو گئے ہو؟''

''نہیں..قطعی نہیں..''

''دیکھو مستنصر..'' وہ میرے برابر میں پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی ''جدائی کو دل سے نہیں لگاتے کہ جب کوئی آغاز ہوتا ہے تو اُس کا بہر طور ایک انجام ہوتا ہے...وکٹوریا ہمارے یُوکان، الاسکا اور برٹش کولمبیا کی لمبی مسافتوں کا انجام ہے اور یہاں سے واپسی کا سفر شروع ہو جائے گا..اور جب تم واپس کیلگری پہنچو گے تو تقریباً بارہ ہزار کلومیٹر کا زمینی سفر طے کر چکے ہو گے، کیا یہ ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین حصول نہیں ہے..''

''جب میں واپس پہنچوں گا..''

''ہاں مستنصر..یہ تو طے ہو چکا ہے..وہ کیا کہتے ہیں کہ کُند ہم جنس بہ ہم جنس پرواز..تو میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گی..مجھے تو اپنے ہم جنسوں میں واپس جانا ہے..فلوریڈا کے کھرے نیلے آسمانوں کو لوٹنا ہے..لیکن ابھی دو چار روز میں تمہارے ہمراہ رہوں گی..تو ابھی جدائی کو دل سے نہ لگاؤ..اور تمہیں پتہ ہے کہ وکٹوریا کے اس پہلے دن میں ہم کیا دیکھنے والے ہیں؟''

''مجھے اس سے کچھ غرض نہیں ہے..'' میری خفگی بہت عیاں تھی..

اُس پر میری خفگی کا چنداں اثر نہ ہوا اور وہ چہچہا کر بولی ''ہم آج وہیل مچھلیاں دیکھنے گہرے سمندروں میں جائیں گے اور بہت ساری وہیل مچھلیاں..''

''اگر وہ الاسکا کے سمندروں میں نظر نہیں آئیں تو یہاں کہاں دکھائی دیں گی..''

''دیکھو..میں نے ''پرنس آف وہیلز'' ٹُور کے نہایت مہنگے دو ٹکٹ خریدے ہیں اور اُنہوں نے گارنٹی دی ہے کہ اگر اُن سمندروں میں کوئی وہیل مچھلی نظر نہ آئی تو وہ آدھے ڈالر واپس کر دیں گے اور ذرا غور کرو کہ یہ انگلستان والا ''پرنس آف ویلز'' نہیں..وہیل مچھلیوں والا ''پرنس آف وہیلز'' ہے..اور مستنصر..'' وہ چونچ کھولے میرے قریب ہو گئی ''تمہارے بال ایک عرصے سے رنگے نہیں گئے..جڑوں تک سفید ہو رہے ہیں تو کیا تم ان کو ڈائی نہیں کرو گے..''

''وہیل مچھلیوں کے لیے..''

''ہاں..'' وہ اِٹھلا کر بولی۔ ''مجھے تو کچھ فرق نہیں پڑتا بلکہ مائنڈ نہ کرنا جب تمہارے بال سفید ہونے لگتے ہیں تو تم مجھے اچھے لگتے ہو، ایک سمندری بگلے سے لگتے ہو۔''

''تو میں اپنے بال ڈائی نہیں کروں گا..ایک سمندری بگلا لگتا رہوں گا۔'' میں نے طیش میں آ کر کہا۔ ''ڈُو یو مائنڈ..''

''نو..آئی ڈُونٹ مائنڈ..'' وہ اپنے پَروں سے میرے رخسار چھوتے ہوئے جیسے مجھے چھیڑتی ہو، بولی ''صرف ایک سمندری بگلا نہیں..ایک بگلا بھگت..سچ بتاؤ کہ تم نے آج تک اپنی بھگتی میں کتنی معصوم مچھلیوں کو نگلا ہے..''

○●○●○

''وکٹوریا کی بندرگاہ.. کیسے کیسے کھیل تماشے''

وکٹوریا کا اولین نقش باطل ثابت ہوا اس لیے کہ ہم نے سمندر نہ دیکھا تھا.. ایسا شریف اور ملنسار قسم کا سمندر کہ نہ اس کے ساحلوں سے ٹکرا کر شور کرتا تھا اور نہ کوئی طوفان برپا کرتا تھا بلکہ اس شہر کے قدموں میں خاموشی سے لیٹتا چلا جاتا تھا.. یوں جانئے کہ یہ ایک پالتو سا سمندر تھا..

وکٹوریا کی زندگی میں جتنی بھی سرمستی اور چلبلاہٹ تھی اُس کے سارے جھرنے اس کی مختصری بندرگاہ سے پھوٹتے تھے.. یہ بندرگاہ اتنی مختصر اور کیوٹ ہے کہ ایک ماڈل لگتی ہے اور اُس میں لنگرانداز کشتیاں اور سٹیمر ایسے کھلونے لگتے تھے جو بچوں نے وہاں چھوڑ رکھے تھے.. اس کے آس پاس، کناروں اور فٹ پاتھوں پر سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لیے طرح طرح کے کھیل تماشے ہمہ وقت جاری رہتے تھے.. اور پھر دیدہ زیب ریستوران ہیں جن میں سے مقبول ترین ''مائل سٹون'' ہے جس کے آگے رنگ رنگ کی دھوپ سے بچاؤ والی چھتریاں کھلی ہیں اور ان کے سائے میں جو میزیں بچی ہیں اُن کے حصول کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وہاں بیٹھ کر کسی بھی مشروب کے گھونٹ بھرتے آپ کے آگے سے سیاحوں کے بے فکرے ہجوم گزرتے ہیں اور اُن کے پار بندرگاہ کے آغوش میں بادبانی کشتیاں پانیوں میں جھولتی ہیں.. وکٹوریا میں ''مائل سٹون'' کا یہ ریستوران یاد کے نہاں خانوں میں آج بھی اپنے بے مثل منظر سمیت نقش ہے..

اور وہ فٹ پاتھوں اور شاہراہوں کے کناروں پر اور بندرگاہ کے برابر میں اور اُس میں اترنے والی سیڑھیوں پر جو کھیل تماشے ہوتے ہیں وہ ہر قدم پر آپ کے قدم روکتے ہیں، وہ اتنے دلچسپ اور انوکھے ہوتے ہیں.. اور یاد رہے کہ وکٹوریا میں ٹریفک کی بھگدڑ نہیں، کسی ایک شخص کے چہرے پر تفکر کی لکیریں نہیں کہ میں نے آفس پہنچنا ہے، میں نے کاروبار سنبھالنا ہے.. میرے غسل خانے کا نل لیک کر رہا ہے اُس کے لیے مستری کا بندوبست کرنا ہے یا یہ کہ بچوں کو سکول سے پک کرنا ہے اور پھر فلاں بل کی آخری تاریخ ہے، آج ہی ادائیگی کرنی ہے.. کیونکہ ان لوگوں نے کہیں آنا جانا نہیں.. جہاں وہ آنا چاہتے تھے آ گئے اور جب جانے کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا کہ سب کے سب اسی نوعیت کے تفکرات سے فرار ہو کر یہاں آئے تھے.. چنانچہ فرصت ہی فرصت ہے اور ہوا میں نمی کے شائبے ہیں، آسمانوں پر آبی پرندے غل کرتے ہیں اور خوشگوار دھوپ ہے تو کیوں نہ اس سنہری بالوں والی نہایت مدبر خاتون سے کچھ موسیقی سُن لی جائے اور وہ خاتون

اپنے سامنے ایک سٹینڈ پر کھلے موسیقی کے نوٹس پر نظریں جمائے، ٹھوڑی تلے وائلن کا دستہ دبائے نہایت انہماک سے ایک کلاسیکی دھن بجا رہی ہیں.. اتنی مگن اور ڈوبی ہوئی ہیں جیسے ایک پُر ہجوم فٹ پاتھ پر نہیں بلکہ رائل البرٹ ہال لنڈن یا کارنیگی ہال نیویارک کے سٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہیں.. اور چند ایک سیاح جو کلاسیکی موسیقی کی رمزوں سے آگاہ ہیں وہ اُن کی وائلن کے سُروں کی داد دیتے ہیں اور کوئی ایک اُس خاتون موسیقار کے قدموں میں بچھے ایک غالیچے پر ایک دو ڈالر اُس کی موسیقی کی تحسین کے طور پر رکھ دیتا ہے..

ایک روز جب شام ہونے والی تھی اور وہ خاتون اپنی وائلن، میوزک نوٹس اور سٹینڈ سنبھالتی جانے کو تھی تو میں نے اُن سے کچھ سوال پوچھے.

''میں یہاں وکٹوریا کے ایک میوزک سکول میں کلاسیکی موسیقی کی ٹیچر ہوں.. ان موسموں میں یہاں فٹ پاتھ پر اپنا سنگل وومین کانسرٹ پرفارم کرتی ہوں اور میں بے حد لطف اندوز ہوتی ہوں کہ کھلی فضا میں اپنی من پسند موسیقی بجانا اور لوگوں کو متوجہ کر لینا ایک دل کو راحت دینے والا تجربہ ہے.. یوں میری پریکٹس بھی ہو جاتی ہے اور کچھ اضافی آمدنی بھی ہو جاتی ہے.''

''آپ کو.. جب لوگ آپ کے سامنے کچھ رقم ڈال دیتے ہیں تو معیوب نہیں لگتا؟''

''نہیں.. ہرگز نہیں.'' اُسے میرے سوال پر قدرے تعجب ہوا ''لوگ اگر میرے فن کو سراہتے ہوئے کچھ ڈالر دے جاتے ہیں تو وہ مجھ پر کچھ احسان نہیں کرتے، میری فراہم کردہ موسیقی کی قیمت ادا کرتے ہیں.''

سڑک کے پار آپ کیا دیکھتے ہیں اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ سفید سنگ مرمر سے تراشیدہ پی کیپ پہنے ایک مجسمہ ایستادہ ہے.. اور صبح سے ایستادہ ہے اور جب آپ اُس کے قریب سے گزرتے ہیں تو وہ یکدم زندہ ہو جاتا ہے اور جھک کر آداب بجا لاتا ہے تو آپ یقیناً اُس کے بہروپ کی داد دیتے ہوئے اُس کے آگے رکھے ہیٹ میں ایک آدھ ڈالر ڈال دیتے ہیں..

بندرگاہ تک اترتی سیڑھیوں کے قریب سُرخ پھولوں سے ڈھکی ہوئی ایک دیوار کے ساتھ ایک صاحب روایتی سکاٹش لباس میں، چارخانی اونی سکرٹ میں گھٹنوں تک آتی دبیز جرابوں میں اور ٹویڈ کی ایک ٹوپی میں ملبوس نہایت اہتمام سے سکاٹ لینڈ کی پہچان وہ قدیمی پائپ بجا رہے ہیں جو ایک مشکیزے کی مانند ہوتا ہے اور آپ گال پھُلا پھُلا کر اُس میں پھونک بھرتے ہیں تو اُس میں سے کچھ ایسی آوازیں برآمد ہوتی ہیں جیسے متعدد بانسریاں بین کر رہی ہوں.. ویسے آج بھی انگریز سرکار کے زمانوں سے چلی آنے والی روائت کے مطابق ہماری فوج میں بھی ایسے بینڈ ہیں جن میں یہی سکاٹش پائپ چکوال اور میانوالی کے فوجی اتنی مہارت سے بجاتے ہیں کہ سکاٹ لوگ بھی عش عش کر اٹھتے ہیں.. یہ سکاٹ موسیقار تنہا نہ تھے، فٹ پاتھ پر ایک رنگین دری بچھی تھی اور اُن کے دو بچے.. ایک دس بارہ برس کی لڑکی.. جسے سکاٹ لینڈ کے محاورے کے مطابق ایک بونی لیس کہا جا سکتا ہے اور ایک تقریباً آٹھ برس کا بچہ اور وہ بھی ایک بونی لیڈ کہلانے کا مستحق

تھا، دونوں اُسی روایتی سکاٹش لباس میں اباجی کی پائپ موسیقی پر رقص کر رہے تھے..

سکاٹ لینڈ کی سرد اور ہمہ وقت بارش میں بھیگتی سرسبز پہاڑیوں اور ڈھلوانوں پر..اس کی ٹھنڈک بھری جھیلوں کے کنارے..اور قدیم قلعوں کے کائی زدہ پتھروں کے سائے میں وہاں کے پرفخر باشندے روب رائے کو یاد کرتے اسی سکاٹش پائپ کی اداس دُھنوں پر خوشی اور غمی میں..محبت یا ماتم میں یہی لوک رقص ہزاروں برسوں سے ناچتے چلے آئے ہیں..

وہ لڑکی ناچتی ہوئی کبھی کبھار اپنے چیک سکرٹ کا ایک کونہ پکڑ کر اُسے ذرا بلند کرتی اور دوسرا ہاتھ فضا میں لہرا کر اپنے آبائی لہجے میں کچھ اظہار کرتی اور اُس کا برادر خورد بھی اُس کا ساتھ دیتا..

چند سیاح نہایت دلچسپی سے یہ اوپن ایئر سکاٹش رقص دیکھ رہے تھے اور تالیاں بجا کر داد دینے میں بُخل نہ کرتے تھے..

اگر آپ اس فیملی کانسرٹ سے محظوظ ہوئے ہیں تو کچھ حرج نہیں کہ اگر اُن کے آگے بچھی رنگین دری پر کچھ ڈالر رکھ کر اپنے صاحب ذوق ہونے کا اظہار کر دیں..یہ کھیل تماشے اکثر سرِ شام شروع ہوتے اور جب بندرگاہ کے اردگرد کی عمارتوں کی سجاوٹ کی روشنیاں گل ہونے لگتیں تب تک جاری رہتے..

یہ وکٹوریا تھا..

○●○●○

"پرنس آف وہیلز..ایک سیاہ موبی ڈِک سمندروں میں سے ابھرتی ہے"

ایک سٹیمر دھاڑتے چنگھاڑتے کف آلود سمندروں میں ڈولتا اُبھرتا رُستم کے گھوڑے رخش اور مرزے کی گھوڑی بکّی کی مُنہ زور رفتار سے چلا جا رہا ہے اور نمکین پانیوں کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگوتے ہیں اور آج صبح جو میں نے شیو کی تھی اور بلیڈ کی تیز دھار سے جو نا معلوم خراشیں آئی تھیں، وہ نمکین پانی اُن پر بھی ایک آفٹر شیو لوشن کی مانند چھڑکے جا رہے ہیں اور اُن میں سے ہلکے درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں..

اور میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا وہیل مچھلیوں کو تو مجھے کیوں مجبور کر کے اس سٹیمر پر سوار کر دیا گیا ہے لیکن اب تو بہت دیر ہو گئی تھی..مجھے جوشیلے سمندر کے تھپیڑے اور رخساروں پر تھپڑ مارتی ہواؤں کو سہنا تھا..

اور گونج..وہ کیسے بار بار اپنے لامبے پَر پھیلا کر چونچ کٹکٹا کر مسرت سے کوکتی تھی..

"پرنس آف وہیلز ٹور" کا سٹیمر جس میں وہیل مچھلیوں کی تھوتھنیوں سے اپنی ناک ملانے والے خواہش مند شائقین بھرے پڑے تھے، ساحل سے جدا ہوا..وکٹوریا کی پرسکون بندرگاہ میں لنگر انداز بادبانی کشتیوں اور یاٹس کے درمیان میں سے بے حد احتیاط سے پھٹ پھٹ کرتا رواں ہوا..

ایک چھوٹا سا پنکھوں والا جہاز وکٹوریا کی بندرگاہ کے پانیوں پر اتر رہا تھا.جس میں غالباً ایسے سیاح تھے جو اتنے متمول تھے کہ وہ ایک ہوائی سفر کے دوران وکٹوریا سے دور ایسی دور افتادہ ندیوں پر نظر ڈال آئے تھے جہاں ان موسموں میں ریچھ سالمن مچھلیوں کو دبوچنے کی خاطر یلغار کرتے ہیں..

جونہی ہم ذرا کھلے سمندر میں آئے تو سٹیمر ایک منہ زور گھوڑا ہو گیا..اُس کی رفتار میں یکدم یوں اضافہ ہوا کہ وہ پانیوں پر پھسلتا اور کبھی اپنے اپنے زور میں اُن کے اوپر رواں ہوتا..جھاگ اڑاتا اڑنے لگا..

کیا یہ سمندری سفر بھی رائیگاں ہوگا..

ہمیں کچھ بھی دیکھنے کو نہ ملے گا..ایک مونچھوں والا اود بلاؤ بھی نہیں..جیسا کہ الاسکا میں ہمارے ساتھ ہاتھ ہوا تھا..

جب بہت دیر تک ہم اس سفر میں رہے اور یقین ہونے لگا کہ سمندر بھی ختم ہونے کو ہے تو آس پاس اُس سمندر میں سے بادلوں سے ڈھکے جادو میں ڈوبے ہوئے کچھ جزیرے ابھرنے لگے..

ہم وکٹوریا سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد پیسفک اوشن کے ایسے گہرے پانیوں میں پہنچ چکے تھے جہاں وہیل مچھلیوں کے کچھ خاندان رہائش پذیر تھے..

یہ ٹور آپریٹر حضرات گانٹھ کے پکے تھے، خوب جانتے تھے کہ سمندر کے فلاں حصے میں ان موسموں میں اتنی تعداد میں وہیل مچھلیاں بہرطور ہوتی ہیں اور وہ اپنے مخصوص علاقے سے باہر نہیں جاتیں..یعنی وہ اپنے پانی کے گھروں میں رہتی تھیں اور وہ اس آبی چاردیواری کے باہر نہیں جاتی تھیں..نہایت شرعی نوعیت کی وہیل مچھلیاں تھیں..بے شک یہ آبی چاردیواری کم از کم بیس پچیس کلومیٹر پر محیط تھی اور اسی لیے ٹور آپریٹر یہ گارنٹی دیتے تھے کہ اگر وہیل مچھلیاں نظر نہ آئیں تو آدھے ڈالر واپس..

اس دوران سٹیمر کے کپتان نے لاؤڈ سپیکر پر ہمیں متوجہ کیا کہ خواتین و حضرات میں آپ کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں..آج ہماری خوش قسمتی کی کوئی انتہا نہیں ہے..میرے سامنے جو راڈار سکرین ہے اُس پر کم از کم درجن بھر وہیل مچھلیوں کی موجودگی روشن ہو رہی ہے اور خواتین و حضرات وہ آپس میں باتیں کر رہی ہیں..جی ہاں وہ ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ کر رہی ہیں..تو آئیے میں آپ کو اُن کی گفتگو سنواتا ہوں..

سب سیاح حضرات نے جنگلی بلّوں کی مانند کان کھڑے کر دیئے، ہمہ تن گوش ہو گئے..سپیکرز میں سے عجیب نامانوس آوازیں آنے لگیں..جیسے کوئی روبوٹ اٹک اٹک کر ٹُوں ٹُوں کر رہا ہو..جیسے بطخیں قیں قیں کر رہی ہوں..اور یہ خیال بدن میں ایک سنسنی پھیلاتا تھا کہ ہمارے سٹیمر تلے گہرے سمندروں میں کچھ وہیل مچھلیاں آپس میں گپ بازی کر رہی ہیں اور ہم اُن کی آوازیں سُن رہے ہیں..

بیشتر سیاح اتنے انہماک سے وہ قیں قیں اور چرخ چُوں، ٹُوں ٹُوں اور مدھم گُرلاہٹ سُن رہے تھے جیسے وہ وہیل مچھلیوں کی زبان پر عبور رکھتے ہوں اور وہ کبھی کبھار یوں مسکرانے لگتے جیسے کسی وہیل مچھلی نے دوسری وہیل مچھلی کو کوئی گندا لطیفہ سنایا ہو..

بے چاری وہیل مچھلیاں..سمندروں کی گہرائی میں اپنی چادر اور چاردیواری میں یہ نہیں جانتی تھیں کہ حضرت انسان جدید ترین آلات کی مدد سے اُن کی ذاتی گفتگو سُن رہے ہیں..

اور تب..گدلے آسمان تلے سمندروں کا جو پھیلاؤ تھا اُس میں سے سیاہ رنگ کی ایک وہیل کا وجود ابھرا..اور اُس کی نموداری کا جلال ایسا تھا کہ اُس نے سمندروں کو بھی حقیر اور ہیچ کر دیا..

اُس کے نتھنوں سے وقفے وقفے کے ساتھ سانس کے پانیوں کا ایک فوارہ..ایک آبشار بلند ہوتا..جیسے ایک آبی پھنکار ہو..اُس کے بھاری سیاہ وجود کے گرد جو سمندر تھا اُس کے پانی جھاگ آلود اور اُبلتے ہوئے لگتے تھے..وہ کم از کم تن و توش میں ہمارے سٹیمر جتنی تو ہوگی..

میں تو بجھے دل سے صرف مُونج کے اصرار کرنے پر اس سمندری سفر پر چلا آیا تھا ورنہ مجھے واقعی کسی وہیل

وغیرہ کو دیکھنے کا کچھ چاؤ نہ تھا..اور چلا آیا تو کتنا اچھا کیا کہ اس پہلی وہیل کی سیاہ چٹانی نموداری اور سمندر میں سے یکدم ابھرنے کا جاہ و جلال ایسا تھا کہ میں دم بخود ہو گیا..اور پھر اُس کے سانس کے فوارے پانی جو بلند ہوتے چلے جاتے تھے اور پھر ایک آبشار کی صورت گرتے چلے جاتے تھے..میں اکثر تذکرہ کرتا ہوں کہ آپ بے شک جانوروں کی لاکھ تصویریں دیکھیں، نیشنل جیوگرافک کی دستاویزی فلمیں دیکھیں، چڑیا گھر میں قریب ہو کر بے شک انہیں چھو لیں اور ادب میں لفظوں کی تصویروں سے انہیں اپنے تصور میں لائیں..لیکن جب آپ انہیں اُن کے قدرتی ماحول میں دیکھتے ہیں تو وہ جانور یکسر کوئی اور ہوتے ہیں اور آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ انہیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں..

یہ سیاہ وہیل بھی ایک ایسا ہی ان دیکھا جانور تھی..

آرویل کے ''اینیمل فارم'' میں ''بورن فری'' کے وہ شیر جن کی چاہت میں اس کتاب کی مصنفہ انہی کے ہم نسلوں کا شکار ہو جاتی ہے..''گوریلاز اِن دی مسٹ'' کے سیاہ بن مانس..کافکا کے ''میٹا مارفسس'' کا مکوڑا..عبداللہ حسین کا ''باگھ''..ہیمنگوے کی ''گرین ہلز آف افریقہ'' کے شیر اور بھینسے..''رچرڈ باخ کا ''لونگ سٹون سی گل'' میرے اپنے ''پکھیرو'' کا پکھیرو اور ہرمن میلول کی ''موبی ڈک'' ایک وہیل مچھلی جو سر پھرے لنگڑے کیپٹن اہاب کو بھی لے ڈوبتی ہے..یہ سب شیر، بن مانس، مکوڑے، باگھ، بھینسے، سمندری پرندے، پکھیرو اور وہیل مچھلیاں بے شک لفظوں کے جادو سے زندہ اور سانس لیتے ہوئے لگتے ہیں لیکن...وہ کہتے ہیں ناں کہ دیکھنا ہی یقین کرنا ہے تو میں نے بھی جب اپنی زندگی کی پہلی وہیل کو پیسفک کے سمندر میں ابھرتے اور سانس کے فوارے چھوڑتے دیکھا تو یہ کوئی اور وہیل تھی..موبی ڈک نہ تھی..لیکن ہم اُسے موبی ڈک کے نام سے بہرحال پکار سکتے ہیں..

اور جب یہ موبی ڈک کچھ دیر سطح پر رہنے کے بعد غڑاپ سے پانیوں میں ڈوب جاتی ہے تو اُس مقام پر ایک بھنور سا گردش کرنے لگتا ہے..

اُس پہلی موبی ڈک کے بعد شاید وہیل مچھلیوں کے درمیان ابھرنے اور پھنکارنے کا مقابلہ شروع ہو گیا..سٹیمر کے آس پاس اور کبھی کچھ فاصلے پر اُن کے سیاہ وجود پانی میں سے یکبار ابھرنے لگے..

ہم کسی ایک وہیل کے وجود کو نمودار ہوتے دیکھ کر اُدھر متوجہ ہوتے تو یکدم سٹیمر کے کُل سیاح بچوں کی مانند شور کرنے لگتے کہ اُدھر اُدھر..بائیں جانب..دیکھو دیکھو..وہاں پوری پانچ وہیل مچھلیاں ہیں..اور واقعی وہ تو ایک قطار میں ڈوبتی ابھرتی آبشار سانس لیتی تھیں..

اس دوران سٹیمر کے انجن بند کر دیئے گئے تھے تاکہ وہیلیں اُس کے شور سے چلی نہ جائیں..اور پھر یکدم سمندر ہموار ہو جاتا..تادیر اُس کے سینے میں سے کوئی وہیل نہ ابھرتی..پھر ہمیں مطلع کیا جاتا کہ خواتین و حضرات وہیل خاندان زیر آب تیرتے ہوئے ایک اور علاقے میں چلے گئے ہیں اور ہم راڈار پر تعین کر چکے ہیں کہ وہ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہیں تو آئیے وہاں چلتے ہیں..سٹیمر کے انجن حرکت میں آ جاتے اور ہم وہ فاصلہ طے کر کے سمندر کے اُس حصے میں پہنچ جاتے..سٹیمر کے انجن پھر تھم جاتے اور سیاحوں کی متلاشی آنکھیں سمندر پر بچھ جاتیں اور وہ پہلی مانس ہمیں مایوس نہ کرتیں..پانیوں

میں سے بلند ہو کر سمندر پر راج کرنے لگتیں.. کم از کم ایک وہیل ہمارے سٹیمر کے عین برابر میں سطح پر ابھری تو اُس کے وجود کا ایک جھٹکا سٹیمر کو لرزا دینے کے لیے کافی تھا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے سانس کا بلند آبی فوارہ چھوٹا اور پھر اُس آبشار کے گرنے سے سٹیمر پر کھڑے کچھ سیاح بھی بھیگ گئے اور انہوں نے اس خوش قسمتی پر خوب خوب چیخیں ماریں..

اور جب شام کی پہلی پرچھائیاں اُن سمندروں پر اتریں.. ایک سیاہ سرد ہوا جانے کدھر سے شرلاٹے بھرتی ہوئی آئی اور ہم سب ٹھٹھرنے لگے.. ہم نے کچھ انتظار کیا، بہت دیر تک کوئی وہیل پانیوں میں سے ظاہر نہ ہوئی، وہ بھی شام ڈھلتے ہی واپس گھر چلی گئی تھیں تو سٹیمر کے انجن گرم ہو کر متحرک ہو گئے اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا..

دنیا کا دستور ہے.. کامیابی اور خوشحالی کی علامت ہے کہ میری جیب میں اتنے کروڑ کے بینک اکاؤنٹ ہیں.. اتنے بلند سرکاری عہدے ہیں.. فارم ہاؤس ہیں، نیویارک اور دبئی میں فلیٹ ہیں.. سپین میں جائیدادیں ہیں.. اتنی رولز رائس اور بی ایم ڈبلیو سپورٹس کاریں.. یہ میری جیب میں ہیں تو وہ جو آشفتہ مزاجوں، آوارہ گردوں اور خانہ بدوشوں کی دنیا ہے تو اُس میں دستور ہے کہ.. میری جیب میں.. ایک سنو لیک ہے.. ایک جھیل کرومبر ہے.. ایک فیری میڈو، ترشنگ، دیوسائی، منی مرگ ہے.. وادیٔ شگر کی چٹانوں پر کھڑے مارخور ہیں.. معیز الدین جنکشن کے تین ریچھ ہیں.. یہ میری جیب میں ہیں..

اور آج ان سب جائیدادوں کے علاوہ میری جیب میں پیسفک اوشن میں سے ابھرنے والی وہ پہلی سیاہ وہیل بھی ہے.. جس کے آبشاری سانس ہمارے سٹیمر پر گرتے ہمیں بھگوتے تھے..

○●○●○
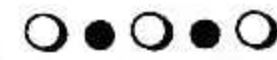
"عشق نہ پچھے ذات.. وکٹوریا میں بھی نہیں"

"مائل سٹون" ریستوران جس کا اردو ترجمہ سنگِ میل ریستوران کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، اگرچہ وہاں نیاز احمد یا افضال احمد نہیں تھے، اُس کی کھڑکی بندرگاہ میں لنگر انداز کشتیوں پر اور اُس کے پار جو شاندار وکٹورین عمارتیں تھیں اور روشنیوں سے منور تھیں، اُن پر کھلتی تھیں اور ان روشنیوں نے پورے گیارہ بجے گُل ہو جانا تھا..

"کیا کھاؤ گے؟"

"مجھے باقاعدہ خوراک کی کچھ چاہت نہیں.. صرف سُوپ کافی ہوگا۔"

"تمہیں بھوک نہیں ہے؟"

"نہیں.."

"کیوں نہیں.. تم کھاؤ گے۔"

میں اس راز کو نہیں پا سکا تھا کہ آخر گونج کی سوئی میری خوراک پر ہی کیوں اٹکی رہتی ہے.. میں لاکھ انکار کرتا ہوں کہ نہیں مجھے بھوک نہیں، صرف سُوپ لوں گا اور وہ زبردستی پر اتر آتی ہے کہ نہیں.. تم کچھ نہ کچھ کھاؤ گے.. بے شک ایک نوالہ لے کر چھوڑ دینا لیکن تم کھاؤ گے.. اور کمبخت خود صرف سلاد پر گزراوقات کرتی چلی جاتی ہے..

برابر کی میز پر ایک عجیب دیہاتی سا بے جوڑ قسم کا گورا جوڑا ڈنر کر رہا تھا پر وہ خوراک کی جانب کم دھیان کرتا تھا.. وہ اپنے وائن کے گلاسوں کو اٹھا کر ایک دوسرے کو تا دیر تکتے جاتے تھے، پھر ہنستے تھے.. گلاس ٹکرا کر اُن میں سے ایک آدھ گھونٹ بھر کر پھر سے ایک دوسرے پر نظریں جما دیتے تھے اور کبھی ذرا آگے ہو کر ایک دوسرے کو چوم لیتے تھے.. اُن کے چہرے فروغِ مے سے نہیں محبت کے فروغ سے سُرخ ہوئے جاتے تھے.. مرد درمیانی عُمر کا، ہاتھ پیر کا مضبوط، توانا، شاید کوئی راج مزدور تھا اور عورت.. وہ بھی پچاس کے آس پاس ہوگی.. ذرا چوڑی چکلی اور بہت مردانہ شکل کی.. وہ خاصی گئی گزری تھی اور کرخت شباہت کی تھی.. اُسے پہلی نظر کے بعد دوبارہ دیکھنے کے لیے جی کڑا کرنا پڑتا تھا.. لیکن اُن دونوں کے چہروں پر رفاقت کی جو مسرت مسکراتی تھی وہ کم ہی دیکھنے میں آتی ہے..

"یہ کیا ہے گونج.."

"یہ وہ ہے جس سے تم بے خبر ہو۔"

"اور وہ کیا ہے، جس کی مجھے اب تک خبر نہیں۔"

"محبت۔۔"

کسی حد تک یہ تو فہم میں آتا تھا کہ اگر اس چوڑی چکلی بے ڈھب ڈھلتی عُمر کی نسوانیت سے عاری عورت پر ایک مرد۔۔ جیسا بھی مرد سمجھ گیا ہے تو وہ اُس کے عشق میں برباد ہو جاتی ہے لیکن وہ بھلا مانس اگر اس پر ہی ریجھا ہے تو کیا دیکھ کر ریجھا ہے یہ کُچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔۔

میرے دل کی تختی پر جتنے سوال نقش ہوتے تھے، جتنی بجھارتیں جنم لیتی تھیں تُونج اُنہیں پڑھ لینے اور جان لینے پر قادر تھی یہ اقرار میں متعدد بار کر چکا ہوں تو وہ بولی "محبت ماورا ہوتی ہے۔۔ صُورت شکل، ذات پات نہیں پُوچھتی۔"

وہ شاید پنجابی صُوفی شاعری سے آگاہ تھی کہ عشق نہ پچھے ذات۔۔ اِک سوہنیاں دے متھے بھاگ ناہیں۔۔ اِک کوجھیاں لنگھ لنگھ پار گئیاں تے ڈُب موئیاں کرماں والڑیاں نیں۔۔ کہ بھاگ، نصیب صرف حُسن والوں کے ماتھے پر لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔۔ وہ جو کوجے، بدشکل ہوتے ہیں وہ تو دریا کے پار اتر جاتے ہیں اور جو شکل والے ہوتے ہیں وہ ڈوب جاتے ہیں۔۔

تو یہ عورت وہ کوجی، بدشکل تھی جو عشق دریا کے ڈباؤ پانیوں میں سے تیرتی پار اُتر گئی تھی۔۔ شاہ حسین کی وہ چُوہڑی۔۔ گندگی اور غلاظت ڈھونے والی جو صاحب کی منظورِ نظر ہو گئی تھی۔۔

"مجھے امید ہے آپ بُرا نہیں مانیں گے۔۔" وہ عورت میری جانب ایک کیمرہ بڑھا کر بولی۔۔ اور وہ چھوٹا سا کیمرہ اُس کے بڑے بڑے کرخت ہاتھوں میں ایک ننھی سی چڑیا لگتا تھا "کیا آپ۔۔ ہم دونوں کی ایک تصویر اتار سکتے ہیں۔۔ پلیز۔"

"ہاں۔۔ کیوں نہیں۔"

تصویر اترتے ہی اُس نے اپنے مرد کو ٹھاٹھیں مارتی ایک اُلفت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر اپنے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کو فخر سے نمائش کرتی ہوئی کہنے لگی "کیا یہ انگوٹھی دل کو موہ لینے والی نہیں ہے۔۔ ہم نے شادی کر لی ہے اور ہم یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں۔"

"آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔"

"تھینک یُو۔۔ اور میں آپ دونوں کی بھی ایک تصویر اپنے کیمرے میں اُتار سکتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں گے میں اس کا ایک پرنٹ آپ کو بھجوانے میں سُستی نہیں کروں گی۔۔"

کیا وہ دیکھ نہیں رہی تھی کہ میرے پہلو میں کوئی عورت نہیں ہے ایک پرندہ ہے، جس نے مجھے تنہا چھوڑ کر اپنے کسی ہم جنس کے ہمراہ پرواز کر جانا ہے۔۔ کیا محبت آپ کو نابینا کر دیتی ہے۔۔ میں نے محسوس کیا کہ تُونج اس پیشکش سے کچھ سمٹ سی گئی ہے۔۔

"نہیں" اُس نے فوراً کہا "لیکن بہت بہت شکریہ۔" وہ عورت سمجھ نہ سکی کہ آخر ایک تصویر اتروانے میں کیا قباحت ہے، اُس کے کرخت اگرچہ مسرت سے دمکتے چہرے پر ایک ملال سا آیا اور گزر گیا "نو پرابلم۔۔ اینڈ تھینک یُو اگین۔۔"

"یُو آر ویلکم۔۔"

ہمارے درمیان ایک ناراض خاموشی حائل ہو گئی اور پھر میں تھا جس نے خاموشی کے اس قفل کو کھولا "میں خوب جانتا ہوں کہ محبت ماورا ہے۔۔ اگر نہ ہوتی تو مُجھ ایسے کوجے پر کیوں کرم کرتی۔۔ میں بے خبر نہیں۔"

بندرگاہ کے دوسرے کنارے پر واقع وکٹورین عمارتوں کی روشن آرائش بجھنے لگی۔۔ ساحل کے ساتھ ساتھ قمقموں کی جو قطاریں نمکین ہوا میں جُھولتی تھیں وہ گُل ہونے لگیں۔۔ گیارہ بج رہے تھے۔۔

وکٹوریا دیر تک جاگنے والا شہر نہ تھا۔۔

پل بھر میں یہ روشن شہر۔۔ بے چراغ ہو گیا۔۔

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ، اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

○●○●○

''وکٹوریا کے سمندروں پر ہزاروں آبی پرندے.. تیرتے، ڈوبتے، ابھرتے''

اور اُس شب بھی میری بے خواب آنکھوں میں وکٹوریا کے تاریک آسمان پر غُل کرتے بے انت آبی پرندوں کے غول غُل کرتے میرے اندر اداسی بھرتے تھے کہ اُس غول میں گونج تھی اور اُس کی گرلاہٹ میں اداسی نہ تھی شادمانی تھی..

وادیٔ یُوکان اور الاسکا کے بعد برٹش کولمبیا کے جنگلوں میں سے گزرتے ہوئے وکٹوریا تک کا سفر تو ہمارے سیاحتی ٹور کے شیڈول میں شامل تھا.. یہاں سے ہر سیاح نے اپنی سہولت اور مرضی کے مطابق جدھر چاہنا تھا نکل جانا تھا..

مُجھے آسمانوں سے اترتی ''موٹروے اِن'' کے کمرے میں داخل ہوتی گونج کی شادمان گرلاہٹ اچھی نہ لگتی تھی.. اتنی طویل رفاقتوں کے بعد وہ کیسی بے دید تھی کہ اُس میں بچھڑ جانے کے خیال سے ذرہ بھر اداسی جنم نہ لیتی تھی.. مُجھ پر تو اُس کی رفاقت اور طویل مسافتوں کی اثراندازی کُچھ یوں ہوئی تھی کہ مُجھے پچھلی وہ حیات جس میں گونج میری رفیق نہ تھی رائیگاں لگنے لگی تھی..

بے دید گونج!

ایمکس تھیٹر کی وسیع سکرین پر جو گلیشیئر تڑخ تڑخ کر دراڑوں میں بٹتے ریزہ ریزہ ہوتے ایک کانوں کو بہرا کر دینے والی گونج کے ساتھ مسمار ہوتے تھے اور اُن کی برفوں کا سفوف اور بڑے بڑے ٹکڑے تھیٹر کی نشستوں پر براجمان تماشائیوں کے اوپر گرنے کو آتے تھے اور اُن کے چہرے زرد ہونے کو آتے تھے کہ گھر سے فلم دیکھنے کے لیے نکلے تھے برف میں دفن ہو جانے کے لیے تو نہیں.. قطب شمالی کے بارے میں یہ فلم جو تھیٹر کی جہازی سکرین پر متحرک تھی اُس کا ساؤنڈ ٹریک دہلا دینے والا تھا.. وہ ہمارے آس پاس یُوں گونجتا اور ٹوٹتا تھا کہ ہر لمحے یہی خدشہ دامنگیر رہتا تھا کہ ہم اس گلیشیئر کے سفید انباروں میں دب جائیں گے اور ہم ہراساں ہوکر پہلو بدلتے تھے..

فلم کے خاتمے پر تھیٹر سے باہر آکر اطمینان کا سانس لیا کہ بچ گئے.. کافی کا ایک کپ گرم گرم حلق میں انڈیلا تو حواس بحال ہوئے..

وکٹوریا کی دوپہر میں اُس کے آسمان پر بس دو چار آبی پرندے اڑان میں تھے.. کیا ان میں سے کوئی ایک ہے جسے گونج نے اپنے لیے پسند کرلیا ہے اور وہ مُجھے ترک کر کے اُس کے ساتھ پرواز کر جائے گی..

ایمکس تھیٹر میں اگلا شو شروع ہونے کو تھا اور منتظر لوگ ٹکٹ خرید کر اندر جا رہے تھے.. اور میں نے دیکھا کہ گونج چپکے سے میرے پہلو میں سے فرار ہوکر ٹکٹوں کی کھڑکی کی جانب بڑھ رہی ہے..

''ہیلو..'' میں نے اُسے متوجہ کیا..

''ہم اگلی فلم بھی دیکھیں گے۔'' اُس نے مڑ کر کہا..

''میرے حواس تو ابھی تک بلند آہنگ صداؤں اور ساؤنڈ سسٹم کی گونج سے ڈگمگا رہے ہیں.. تو اب فوراً ہی ایک اور فلم کیوں..''

''بیئرز..'' اُس نے پَر سکیڑ کر بے حد ہیجان انگیز لہجے میں کہا ''ریچھ.. اگلی فلم ریچھوں کے بارے میں ہے.. بیئرز..''

''کیا ہم نے کم از کم اس زندگی کے لیے ضرورت سے زیادہ جو یہ بیئرز ہیں دیکھ نہیں لیے.. ایک ہی دن میں سات سات آٹھ آٹھ بیئرز.. اور ان میں معیزالدین جنکشن کے ریچھ بھی شامل ہیں تو اب مزید ریچھ.. ہرگز نہیں۔''

وہ کُچھ روٹھ سی گئی ''آئی لَو بیئرز.. میں تو مزید ریچھ دیکھنا چاہتی تھی لیکن اگر تم کہتے ہو تو نہیں.. جدائی سے پیشتر ریچھوں کے حوالے سے ایک دوسرے سے ناراض ہونے سے فائدہ..''

''ہم ابھی تک وکٹوریا کے اُس ساحل پر نہیں گئے جہاں سے پیسفک اوشن کا لامتناہی پھیلاؤ تاحدِ نظر پھیلتا افق میں جا ڈوبتا ہے.. وکٹوریا کے سیاحتی کتابچوں میں سفارش کی گئی ہے کہ ہر سیاح کو کم از کم ایک شام وہاں گزارنی چاہیے.. اگر آپ تیر سکتے ہیں تو تیریے.. لہروں پر اپنا تختہ بچھا کر اُس پر سوار ہوکر سمندر کے سینے پر سرفنگ کرنا چاہتے ہیں تو کیجیے.. اگر آپ کو سمندر کی تازہ اور نمکین ہوا پسند ہے تو جی بھر کے سانس لیجیے اور اگر آپ کسی روز کُچھ نہ کرنا چاہیں تو ساحل کی ریت پر اوندھے ہوکر کُچھ نہ کیجیے..''

''چلو پھر ہم کُچھ بھی نہیں کرتے۔'' گونج روٹھی رہی۔ ''اگر ہم نے بیئرز نہیں دیکھنے تو پھر کُچھ بھی نہ کریں تو کیا فرق پڑتا ہے۔''

دور دور تک ساحل کے کناروں پر خوش نظر قطار اندر قطار گھر ایسے تھے کہ میں اپنے آپ کو ایک فریب میں مبتلا کرتا رہا کہ اگر میرے پاس اختیار ہو تو میں ان میں سے کس گھر میں رہائش اختیار کروں گا.. وہ سرخ چھتوں والا ایک مختصر گڑیا گھر جو ایک سوس شلیے کی شکل کا ہے یا وہ جس کی ساری کھڑکیاں سمندر پر کھلتی ہیں یا وہ جس کے لان کی ہریاول سمندر کے پانیوں تک اترتی ہے.. چناؤ مشکل ہو رہا تھا..

سمندر وکٹوریا کے آخری کناروں سے شروع ہوکر کائنات کے آخری افق کے اندر کہیں گم ہو رہا تھا..

ایک چوڑا پتھریلا راستہ جس پر متعدد کاریں پہلو بہ پہلو آسانی سے سفر کر سکتی تھیں، سمندر کے اندر تک چلا جا رہا تھا اور پھر سمندر اُسے روک دیتا تھا کہ بس یہاں تک.. وہاں کچھ زیادہ لوگ نہ تھے..

بھلا وکٹوریا کی ماڈل نما بندرگاہ کے اردگرد ہونے والے کھیل تماشوں اور گہما گہمی سے جدا ہو کر اس سمندری ویرانے میں کون آتا تھا..

پتھریلے راستے کے نشیب میں متعدد چٹانیں تھیں جن پر سمندر اپنا ماتھا پٹختا پُر شور ہوتا تھا..

اور وہ سمندر ہمیں بُلاتا تھا..

ہم ذرا دھیان کرتے اپنے آپ کو سنبھالتے کہ چٹانیں بھیگی ہوئی تھیں اور پتھروں پر جو گر پھسلتے تھے، احتیاط سے قدم رکھتے اُس نشیب میں اترے اور سمندر کی اتنی قربت میں ہو گئے کہ لہروں کے چھینٹے ہمیں بھگونے لگے.. باہر کی دنیا باہر رہ گئی اور اُس کی جگہ سمندر کے شور نے لے لی.. ذرا سی بے احتیاطی سے ہم پھسل کر اُس سمندر میں آسانی سے غرق ہو سکتے تھے..

اور ہم سے ہمیشہ کی طرح مراد صرف میں ہوں.. کونج کے پنجوں نے کہاں پھسلنا تھا اور اگر پھسلنا تھا تو پَر پھڑپھڑا کر بلند ہو جانا تھا..

اور ہم نے اُس نشیب میں اتر جانے کا خطرہ صرف سمندر کے قریب ہو جانے کے لیے مول نہیں لیا تھا.. بلکہ وہاں چٹانوں کے آس پاس، کناروں کے نزدیک جو ڈھیروں آبی بگلے آپس میں چونچلے کر رہے تھے، کچھ تو پانیوں پر یونہی پَر ہلائے بغیر کاہلی سے ڈولتے تھے اور کچھ اپنی دُمیں کھڑی کر کے اُن میں ڈبکیاں لگاتے شغل میلہ کر رہے تھے.. اور اُن میں سے کچھ چونچیں وا کیے بے وجہ غُل کرتے کائیں کائیں کرتے تھے.. ہم اُن کے قریب ہونے کے لیے اترے تھے.. سمندر میں ابھی ابھی نیل گھولا گیا تھا اور اُس کی نیلاہٹ پر یہ ہزاروں پرندے ہماری موجودگی سے غافل موج میلہ کر رہے تھے..

کونج پتھریلے راستے سے الگ ہو کر اس نشیب میں قدرے اشتیاق سے اتری تھی جب کہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ چونچ بسورتی روٹھی ہوئی اترے گی اور اب میں اس کا سبب جان گیا تھا.. وہ سینکڑوں آبی پرندے..

شاید اُن میں سے کوئی ایک تھا جس کے ساتھ کونج نے اڑان کر جانی تھی..

اسی لیے وہ پُر اشتیاق اس نشیب میں اتری تھی..

شام ہونے لگی اور پھر ہو گئی..

وہاں سے جہاں تک یہ پیسفک اوشن چلا جاتا تھا اور بالآخر ایک افق میں غرق ہو جاتا تھا، بس وہاں سے وہ شام چلی آئی.. اُس کی مٹیالی سرمئی تاریکی پانیوں پر تیرتی ہم تک چلی آئی اور نہ صرف ہم دونوں کو بلکہ اُن ہزاروں پُرمسرت کلکاریاں مارتے، قیں قیں کرتے سفید بگلوں پر اثر انداز ہو کر اپنے آپ میں گُم کر لیا.. گُم یوں کیا کہ اُس نیم تاریکی میں پرندوں کی سفیدی کہیں کہیں پانیوں پر ڈوبتی ابھرتی دکھائی دیتی جاتی تھی.. جیسے کسی مصوّر نے ایک سیاہ

کینوس پر سفید رنگ کے کچھ سٹروکس.. کچھ یہاں کچھ وہاں لگا دیے ہوں.. صرف اس فرق کے ساتھ کہ اُس کی تصویر میں وہ جامد ہوتے ہیں اور یہاں ہماری نظروں کے سامنے سمندر کے سیاہ کینوس پر وہ سفید رنگوں کے چھینٹے ڈولتے حرکت کرتے تھے..

اُن میں سے وہ کونسا چھینٹا تھا جس کے ساتھ کونج نے چلے جانا تھا..

○●○●○

''باغ بہاراں اور گلزاراں.. اِک فردوسِ بریں''

میں ہوش میں آتا ہوں تو میرے کانوں میں پرندے گیت گاتے چہکتے ہیں.. عجیب سے مدھر گیت چہکتے، میرے کانوں میں رس گھولتے ہیں.. طوطے ہیں اور وہ نہیں چہکتے، نہ ٹیں ٹیں کرتے غُل کرتے ہیں بلکہ وہ کسی مانوس زبان کی بولیاں بول رہے ہیں، بول نہیں رہے، کچھ پڑھ رہے ہیں اور وہ واضح طور پر سن سکتا ہوں کہ وہ قرأت کر رہے ہیں، آیاتِ مقدسہ کی تلاوت کر رہے ہیں.. میں یہ کیسے جہان میں ہوں جہاں پرندے ورد کر رہے ہیں..

یہ اُس دنیا میں تو وجود نہیں رکھتے تھے..

اور وہ کونسی دنیا تھی جس کے رنج والم میں، کٹھنائیوں اور کلفتوں میں.. میں زندگی کی چٹان پر اپنی مشقت کے تیشے سے عمر بھر وار کرتا رہا اور اس کے باوجود اُس کا ایک سنگریزہ بھی اُس کے وجود سے جُدا نہ کر سکا، وہ چٹان میرے پسینے سے بھیگی ہوئی تھی، میرے خون سے لتھڑی ہوئی تھی..

ایسی کٹھن حیات بسر کرنے کے بعد مجھے کسی حیات بعد از موت کا ڈر نہ تھا کہ وہ اس حیات کی نسبت کیا بُری ہوگی..

اور پھر میں ایک ویران راستے پر چلا جاتا تھا، بھوک، پیاس اور ناداری سے نڈھال مرجانے کی تمنا کرتا تھا تب وہ ایک فرشتہ رُوپ شخص اُس راستے پر نمودار ہوا اور اُس نے مجھے ڈھارس دی اور میری پیاس بجھانے کی خاطر مجھے کچھ پینے کو دیا.. وہ ایک مشروب تھا یا کسی بُوٹی کا نشہ آور دھواں تھا جو میرے رگ وپے میں پھیل گیا اور میں ہوش گنوا بیٹھا..

اور اب ہوش میں آتا ہوں تو میرے کانوں میں پرندے چہکتے آیاتِ قرآنی کا ورد کرتے ہیں..
نازک انداز برہنہ بدن دوشیزائیں مجھے آغوش میں لیتی ہیں..
یہ ایک فردوسِ بریں تھا.
یہ وہی جنت تھی جس کا وعدہ کیا گیا تھا. تو کیا میں مر چکا ہوں؟
نہیں یہ وہ جنت نہ تھی جس کا وعدہ کیا گیا تھا..

اور نہ ہی یہ حسن بن صباح کی جنت تھی..

اگر مجھے شائبہ ہوا کہ پرندے آیات قرآنی کا ورد کرتے ہیں تو یہ اُس جنت کا تصور تھا جس کا وعدہ کیا گیا تھا.. یہ محض ایک وہم تھا..

یہ بھی حضرت انسان کی تخلیق کردہ ایک جنت تھی اور کینیڈا میں وکٹوریا کے قصبے سے تین چار جھیلیں پار واقع تھی..

یہاں بھی پرندے چہکتے تھے لیکن انگریزی، فرانسیسی اور کسی حد تک پنجابی میں چہکتے تھے کہ یہ خالص کینیڈین پرندے تھے.. اور وہ حُوریں نہ تھیں جو اس میں ٹہلتی پھرتی تھیں موٹی موٹی امریکی سیاح خواتین تھیں..

ویسے وہ جنت جس کا وعدہ کیا گیا تھا وہ حزن آمیز دلکشی میں اس سے بڑھ کر کیا ہوگی.. یہ اُس سے بھی ماورا کوئی اور ہی جہان تھا.. یہاں ایسے ایسے انوکھے پھول تہہ در تہہ انباروں میں رنگوں کی آبشاروں میں کھلے ہوئے تھے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے اور نہ کسی ناک میں اُن کی مہک گئی.. اور اُن کے رنگ تو جہاں سات رنگوں کا اختتام ہوتا تھا وہاں سے جنم لے کر ابد کی آبشاروں تک جاتے تھے.. اور ہاں میرے سامنے ڈھلتی دھوپ میں حُسن بیمار ہوتے شجروں کے ایک جھنڈ میں بلندی سے، کہیں بلند چٹانوں میں سے آبشاریں گرتی تھیں اور ایک ایسے تالاب میں گرتی تھیں جو ہریاول کے ایک سمندر کے گھیرے میں آیا ہوا تھا.. اور اُس میں ایسی نقرئی بیلیں جھولتی تھیں جن کی لڑیاں زندہ لگتی تھیں، مہ جبینوں کی بانہیں لگتی تھیں.. اور وہاں ایسے گھنیرے کُنج تھے جن پر لہو رنگ پتوں کے انبار جھکے ہوئے تھے اور اُنکے اندر کوئی سحر پرورش پاتا ہماری آنکھوں کے راستے بدن میں اُتر کر اُسے مسحور کرتا تھا.. اُس دنیا میں کہیں ایسی گھاس نہ تھی جو اس جنت کے راستوں پر بچھی تھی، اس نرم مخمل پر چلنے سے کسی کے پاؤں نہ چھل سکتے تھے..

جانے میں کس پہر ہوش میں آیا.. کہ اُس ساعت پچھلے پہر کی دھوپ میں اُس گل وگلزار پر ایک عجیب مرگ اداسی اتر رہی تھی جو اُس جہانِ رنگ وبُو میں ایک خوف بھرتی تھی..

میں آنکھیں جھپکنے سے گریز کرتا تھا کہ یہ سب خواب وخیال ہے جو محض آنکھ جھپکنے سے زائل ہو جائے گا..

اس فردوس بریں کو.. اس کے گل وگلزار کو، آبشاروں اور رنگ وبُو کی بوچھاڑ کو اور وہ بھی پچھلے پہر کی زرد روشنی میں بیان کرنا ایک سعی لاحاصل ہے.. ہاں اگر میں اپنی آنکھیں آپ کو مستعار دے سکتا تو شاید آپ اسے جوں کا توں دیکھ سکتے جیسا کہ میں دیکھ رہا تھا لیکن آپ فوری طور پر میری آنکھیں واپس کر دیتے کہ ان میں تو نظر کا کوئی فریب ہے، کوئی کرشمہ سازدھوکا ہے کہ جو دکھائی دیا وہ تو روئے زمین پر ممکن ہی نہیں، صحیفوں میں کہیں مذکور نہیں..

تب لامبے سفید پروں والا پرندہ جس کی آنکھوں میں ایک سحر تھا، میرے نزدیک ہوا، اپنی چونچ میرے رخساروں پر رکھ کر بولا ''اگلے جنم میں اگر میں ایک انسان ہوگئی یا تم ایک پرندے ہوگئے تو ہم ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوجائیں گے.''

وکٹوریا میں یہ ہمارا آخری دن تھا۔۔

یوکان، الاسکا اور برٹش کولمبیا کی تقریباً گیارہ بارہ ہزار کلومیٹر کی مسافت کے بعد یہ آخری پڑاؤ تھا اور کل سویرے سیاحتی گروپ کے ہر سیاح نے پر تولنے تھے اور اپنے اپنے شہروں اور وطنوں کو پرواز کر جانا تھا۔۔

یہ آرام اور استراحت کا۔۔سامان سمیٹنے اُسے پیک کرنے کا ملاقاتی کارڈوں کا تبادلہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھنے کے وعدوں کا، جذباتی ہو کر گلے لگانے اور بچھڑنے کا دن تھا، کچھ نہ کرنے کا دن تھا۔۔اور سفر کے اختتام کی اداسی کا دن تھا۔۔

ہم نے وکٹوریا کے ایک مہنگے اطالوی ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھایا جہاں گونج اس لیے مجھ سے ناراض ہوگئی کہ میں نے ویٹر کو آرڈر کی تعمیل نہ کرنے پر ہلکی سی سرزنش کر دی تھی۔۔۔وہ آج سویرے سے ہی مجھ سے رنجیدہ سی تھی، رُوٹھی سی تھی۔۔

ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔۔

سیاحتی سیزن کا اختتام ہو رہا تھا اور وکٹوریا کے ہر سٹور کے باہر سیل سیل کے پھریرے لہراتے تھے۔۔میں نے اپنے لیے ایک شوخ مالٹا رنگ کی جیکٹ خریدی جو گونج کو سخت ناپسند ہوئی۔ تم اپنی عمر نہیں دیکھتے۔۔یہ پہنو گے۔۔

میں اگر آئینہ دیکھتا تو اپنی عمر دیکھتا۔۔۔میں ابھی تک اُسی آئینے کو دیکھتا تھا جس میں جھیل جنیوا کے کنارے صرف ایک نیلی جین میں ایک نوخیز وجود ہے اور اُس کا پیٹ ایک چیتے کی مانند ستواں اور ہموار ہے۔۔

اور جب کچھ بھی کرنے کو نہ تھا۔۔یہاں تک ہم نے اطالوی آئس کریم بھی ایک فٹ پاتھ پر براجمان ہو کر کھالی تو مجھے اپنے دوست جمیل احمد کا مشورہ یاد آ گیا کہ تارڑ۔۔اگر تم کبھی وکٹوریا گئے تو وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ایک حیرت انگیز باغ۔۔ہے اُسے دیکھنا نہ بھولنا۔ اُسے دیکھ کر تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔۔پاگل ہو جاؤ گے۔۔

اور یہ باغ۔۔اور اس کی مسافت میں تین چار جھیلیں آتی تھیں۔۔پھر ہم شاہراہ سے دائیں ہاتھ مڑ کر درختوں کے ایک سلسلے کے درمیان میں سے گزرتے اس کے داخلے تک پہنچ گئے۔۔

مجھے دس ڈالر کی داخلہ فیس بہت گراں گزری کہ ایک باغ ہے۔۔جناح باغ سے بڑھ کر کیا باغ ہوگا تو محض اسے دیکھنے کے لیے پورے دس ڈالر۔۔یہ تو سیاحوں کو لوٹ لینے کے بہانے ہیں۔۔

میں کہاں جانتا تھا کہ محض دس ڈالر کے عوض میں ایک ایسے باغ بہاراں گلزاراں فردوس بریں میں داخل ہونے کو ہوں جو مجھے گنگ کر دے گا۔حسن بن صباح کی جنت جس کے آگے ماند پڑ جائے گی۔۔جس میں دوبارہ واپس آنے کے لیے فدائین کے خنجر سلجوق سلطانوں کے گلے کاٹ دیتے تھے۔۔بے شک یہ باغ بہاراں ایک حیرت بھرا عجوبہ تھا جو یقین کی سرحدوں سے ماورا تھا لیکن میں یہاں واپس آنے کے لیے کسی کا گلا نہ کاٹ سکتا تھا کہ اس کی سیاہ اداسی میں ایک مرگ

کیفیت تھی۔۔زرد دھوپ میں وہ ایک حسن بیمار ایسا تھا جو دل میں خوف بھر دیتا تھا۔۔اس باغ کے بے بہا پھولوں کو یا اس جادو نگری میں گرتے آبشاروں اور سحر طراز کُنجوں کو دکھانا ممکن نہیں، خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کو دکھانا ممکن نہیں اور یہ خواب بھی نہ تھا، حقیقت تھی۔۔ایک وسیع ویرانے پر کسی ایک شخص کی دیوانگی نے اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر، زندگی بھر کی کمائی لٹا دی اور اس جنتِ ارضی کو تخلیق کر دیا۔۔

تب وہ لامبے سفید پروں والا پرندہ جس کی آنکھوں میں ایک سحر تھا، میرے نزدیک ہوا، اپنی چونچ میرے رخسار پر رکھ کر بولا۔۔۔۔

یوکان اور الاسکا کے راستوں پر جب کبھی کسی منظر نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔۔میں اُس کی تاب نہ لا کر گنگ ہوا۔ کوئی ایک لفظ بھی اُسے بیان کرنے کے لیے میرے کشکول میں نہ ہوا اور پھر جب ہوش آیا، قوت گویائی بحال ہوئی تو میں نے لامحالہ مولانا روم اور شمس تبریز کے درمیان جو معرفت کا کرشمہ مکالمہ ہوا لاچار ہو کر اُسے دوہرا دیا اور اب بھی اُسے دوہراتا ہوں کہ۔۔یہ کیا ہے؟

یہ جو باغ بہاراں، گلزاراں، چمن آرا گلشن گلشن آبشاراں، سرو وسمن رنگ برنگاں، حیرتاں، وصل کی راتاں سے بھی بڑھ کر لطف وانبساط کی جو کیفیتاں تھیں جس کی آرائشاں اور ترتیباں اور بناوٹاں میں ایک الوہی موجودگی بہر طور تھی اور آنکھیں بے یقینیاں میں پکارتی تھیں اور جو کچھ دیکھتیاں تھیں اُس پر اعتبار نہ کرتی تھیں۔۔آنکھ جدھر جاتی تھی کسی کُنج کے گھنگھور اندھیروں میں اُلجھ کر گم ہو جاتی تھی۔۔لیکن اس کرشماتی باغ میں۔۔اس فردوس بریں میں ایک سیاہ الم ناکی کی پرچھائیاں تھیں۔۔گل وگلزار پر جو زرد دھوپ اترتی تھی اور وہ گل بوٹے بھی جو سائے میں تھے اُن کی پور پور میں اداسی گندھی ہوئی تھی اسی لیے میں کبھی یہاں دوبارہ نہیں آنا چاہتا تھا۔۔

یہ کیا ہے؟

یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔۔

اُس ڈھلتی زرد دھوپ میں اس جنت ارضی کے پُر بہار گل وگلزار میرے بدن میں مسرت اور سرخوشی نہیں، اداسی اور خوف کے مرگ آثار نشتر اُتارتے تھے اور میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر کبھی دوبارہ وکٹوریا آنا ہوا تو میں کبھی ادھر کا رُخ نہیں کروں گا کہ اس سحر طراز، پُر بہار، صحرائے لالہ زار میں سے جو سیاہ اداسی جنم لے رہی ہے وہ مجھے اپنی بانہوں میں لپیٹ کر، میرا دم روک کر، یہیں کہیں کسی خاموش کُنج میں مجھے خاموشی سے دفن کر دے گی۔۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں۔۔'' گونج میری مسلسل خاموشی اور اس باغ بہاراں میں گھومتے ہوئے میری چُپ سے ذرا فکر مند ہوئی۔

''نہیں۔۔میں ٹھیک نہیں ہوں۔۔'' میں نے اقرار کیا۔ ''مجھے اس باغ کی اداسی نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور یہ مجھے احساس دلاتی ہے کہ میں کچھ کھونے کو ہوں، بچھڑنے اور تنہا رہ جانے کو ہوں۔۔گونج میری مانو تو یہاں سے نکل چلیں۔''

''تم نے ہی تو یہاں آنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا..''

''میں اُس دوست جمیل احمد کو بہت کوستا ہوں جس نے مُجھے اس باغ میں آنے کا مشورہ دیا تھا.. مُجھے کیا پتہ تھا کہ یہ ایک باغ نہیں ایک زردمرگ میں ڈوبا ہوا ایک جہان ہے.. یہاں سے نکل چلیں.. جیسے ہم ٹوک سے نکلنا چاہتے تھے.. دیکھو وکٹوریا کے ساحل پر کل شب نشیب کی چٹانوں کے گرد جو سمندر تھا وہاں ہزاروں آبی پرندے تیرتے، غُل کرتے تھے جو شب کی سیاہی میں سفید چھینٹوں کی مانند پانیوں کے سیاہ کینوس پر پھڑ پھڑاتے تھے تو وہ آج بھی وہاں موجود ہوں گے.. وہاں چلیں.. یہاں سے نکل چلیں اس سے پیشتر کہ یہ باغ بہاراں گلزاراں مرگ اداسی ہمیں نگل لے.. اور اُن آبی پرندوں کی رفاقت میں چند لمحے گزار کر ہم بندرگاہ کے کنارے ''مائل سٹون ریستوران'' کے باہر فٹ پاتھ پر لگی میزوں پر بیٹھ کر آج شب اپنا آخری کھانا کھائیں.. کوئی آخری سرد مشروب پی لیں اور کُچھ دیر کے لیے یہ فراموش کر دیں کہ یہ ہماری رفاقتوں اور مسافتوں کی آخری شب ہے.. کیوں گونج؟''

''مُجھے کُچھ اعتراض نہیں لیکن تم ناحق اداس ہوئے ہو.. شاید تم نہیں مانو گے لیکن تمہیں ہر گل بُوٹے اور کُنج اور گوشے اور یہاں تک کہ آبشاروں کے پانیوں میں بھی گُھلی ہوئی اداسی محسوس ہوتی ہے۔ وہ حقیقت میں وہاں نہیں ہے.. ہمارے سوا بھی تو اس باغ کے گُل رنگ عجائب میں درجنوں سیاح محوِ خرام ہیں اور دیکھو اُن کے چہرے تو ان رنگوں کی بوچھاڑ سے گلنار ہوتے مسرت سے مہکتے جاتے ہیں.. تم نے جیسے مُجھے اپنے تصور کے چاک پر چڑھا کر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی حدت سے تخلیق کیا ہے کُچھ ایسے ہی جب تمہیں خلق کیا گیا تھا تو تم میں عام انسانوں کی نسبت ایک سیاہ اداسی زیادہ ہی بھر دی گئی تھی.. یہ وہی تمہارے وجود میں گُندھی ہوئی اداسی ہے جو تمہیں ان روشن اور چمکیلے رنگوں کی شوخیوں کے دہکتے گلزاروں کے پتے پتے بُوٹے بُوٹے کی رگوں میں گُندھی تمہیں دکھائی دیتی ہے.. اگر تم پل بھر کے لیے اپنی اس سیاہ کیفیت میں سے باہر آ جاؤ.. اور غور کرو تو ہر گل بوٹے میں، پتے پتے میں، نقرئی بیلوں کی جھالروں میں، سحر طراز گوشوں میں اور ان آبشاروں کے پانیوں کی ہر بوند میں، وہ سفر جو تمام ہو چکے، وہ مسافتیں جو اپنے اختتام کو پہنچ چکیں اُن سب کے نقش نمایاں ہوتے ہیں.. تم ذرا غور تو کرو.. ہر پتے پر جُھک کر دیکھو، ہر بوند پر غور کرو تو تم ہمارے سفر کے سارے نقش اُن پر زندہ ہوتے دیکھ سکو گے.. اور تم ان نقشوں کو پہچان لو گے.. اپنے آپ میں گُندھی ہوئی اداسی اور خاموشی سے مُنہ موڑ کر اپنا رُخ اس گُل و گلزار کی جانب کرو.. ہر پتہ تصویر ہو گا، ہر بُوٹا ایک منظر ہو گا.. ذرا غور تو کرو..''

یہ تو میرے بس میں نہ تھا کہ میں اپنے بدن میں گُندھی ہوئی اداسی اور خاموشی سے الگ ہو سکتا.. آٹے میں ملایا ہوا نمک کیسے الگ ہو سکتا ہے لیکن گونج کا دل رکھنے کی خاطر میں نے غور کیا..

اور مُجھ پر حیرت کے منظر در منظر کُھلے..

واقعی وہاں ہر گُل بُوٹے پر ہر پتے پر ہمارے گزر چکے سفر کے نقش متحرک ہوتے تھے..

جیسے اس آفت گلزار بہاراں کو دیکھتے ہوئے میری آنکھیں، بے یقینی، بے یقینی کا ورد کرتی تھیں.. ایسے ہی جو

تصویریں پتے پتے بوٹے بوٹے پر نمایاں ہو رہی تھیں.. آبشاروں کے پانیوں کی ہر بوند میں جھلملاتی تھیں اُن پر بھی میری آنکھیں یقین نہ کرتی تھیں کہ نہیں.. ایسا تو نہیں ہے کہ.. پچھلے چار ہفتوں میں ہم ایسے عجوبہ منظروں میں سے گزر کر آئے ہیں.. یہ بھی اس باغ بہاراں کے سیاہ سحر کے فریب ہیں.. پر وہ شناسا سے لگتے تھے.. کیا پتہ ہم کسی خواب میں گُم واقعی اُن منظروں اور وادیوں میں سے گزرے ہوں.. ذرا جُھک کر انہیں غور سے دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں.. ذرا جُھک کر انہیں دیکھتے ہیں..

○●○●○

''اور کون ہے آئینوں میں.. بس تُو ہی تُو ہے''

اُس ایک پتے پر کُونج کی پورٹریٹ نقش تھی..

یہ کونج یونہی تخلیق نہیں ہو گئی تھی، اسے وجود میں لانے کے لیے میں نے بہت کشٹ کاٹے تھے.. زندگی بھر کی محبتوں، اذیتوں اور کلفتوں کی مٹی گوندھی تھی۔ پھر میں نے اسے چاک پر چڑھایا تھا.. چاک کو اپنے پاؤں کے زور سے گھمایا، دونوں ہتھیلیوں کو گیلی مٹی پر جمایا، ہولے ہولے یوں دبایا کہ وہ ایک شکل اختیار کرنے لگی، سانس لینے لگی، ایک قلبوت کی صورت میں ظاہر ہونے لگی اور اُس میں ایک رُوح پھڑ پھڑانے لگی.. یہ قلبوت اُس کونج کا تھا جو الاسکا کے سفر کے دوران میری رفیق ہوئی..

چنار کے ایک پتے پر.. خزاں رسیدہ پتے پر بنیف کی برف سفیدیوں اور اوائل ستمبر کی خزاں زردیوں میں ایک لڑکی ہے جو منہ موڑے کھڑی ہے.. بے شک اُس کی شکل نظر نہیں آتی اور اُس کے باوجود میں اُس کے گھنیرے سیاہ بالوں اور متناسب بدن کے زاویوں سے جان گیا کہ وہ زندگی سے خوش نہیں ہے.. اس لیے مُنہ موڑے کھڑی ہے..

ایک نقرئی بیل میں پروئی ہوئی..

بگلا جھیل، کبوتر جھیل، دھواں جھیل، ریچھ جھیل کے بعد ایک راج ہنس جھیل ''گل لیک'' پر سفید آبی بگلوں کے ہجوم اترتے تھے..

یہ کیا کہ ایک تیز سرخ رنگ کے پُھول کی ایک پتی پر جس سے ہیرے کا جگر چیرا جا سکتا ہے اُس پر ایک چیڑ کا درخت نمایاں ہوتا ہے..

مجھ سے ملاقات کرنے کی خاطر.. ملنے کے لیے لوگ آتے رہتے ہیں..

باقاعدگی سے نہیں..

کبھی روز و شب گزر جاتے ہیں اور کوئی بھی نہیں آتا..

وہ میری سٹڈی کے دروازے پر تعینات ایک بلند قامت پہریدار کو دیکھتے ہیں.. میرے چیڑ کے درخت کو دیکھتے ہیں..

یہ کیسے پنجاب کے میدانوں کی حدت میں پنپ رہا ہے..

وہ پہلا سوال یہی کرتے ہیں..

کبھی.. کسی قریب کے زمانے میں..

مجھ سے ملاقات کے لیے آنے والے سٹڈی کے باہر مردہ ہو چکے چیڑ کے اس شجر کو دیکھیں گے.. اور جب وہ دروازے میں سے داخل ہو کر اندر جھانکیں گے.. تو اندر.. بھی چیڑ ایک شجر.. مُردہ ہو چکا ہو گا..

''کم از کم میں تمہاری آنکھوں پر تو ایمان لے آیا ہوں''

''جُھوٹے..'' اُس نے اِٹھلا کر کہا..

اب یہاں تو کوئی موقع نہ تھا جس کے جواز میں مُجھے جُھوٹا کہا جائے تو میں نے کہا ''کیوں؟''

''بس یونہی۔'' اُس نے اِٹھلا کر کہا.. اُس کے نخرِیلے پن کا بھی کچھ حساب نہ تھا..

اُس عجوبہ گلزار میں ایک کائی زدہ تالاب پر کنول کا ایک چوڑا پتہ معلق تھا اور اُس پر ایک عبارت نقش تھی..

"YOU ARE ENTERING THE
WORLD FAMOUS
ALASKA HIGHWAY
DAWSON CREEK B.C"

''پنک ماؤنٹین سے ڈرائیونگ کے فاصلے''

مقام	فاصلہ
وہائٹ ہارس (وادیٔ یُوکان)	773.5 میل
بیور کریک (امریکی سرحد)	1024 میل
اینکرایج (الاسکا)	1497.7 میل

ایک نیم تاریک کُنج میں بسون بھینسے اپنے سیاہ وجود کے ساتھ مزید تاریک ہو رہے تھے۔ الاسکا ہائی وے کے دُھندلکے میں وہ سیاہ آسیبوں کی مانند ظاہر ہونے لگے۔ اُس ڈھلتی شام میں، کول رور سے تقریباً دس گیارہ کلومیٹر کی مسافت کے بعد.. وہ عظیم الجثہ سیاہ حیوان، کالے شاہ، گھنے یاک کے بالوں ایسے گھنے سیاہ بالوں والے، بے دریغ وحشی خصلت والے بسون بھینسے نظر آ گئے.. اگرچہ ابھی تاریکی مکمل نہ ہوئی تھی لیکن اُن کی مہین آنکھیں شعلوں کی مانند روشن بھڑک گئی تھیں..

"اپنی جانب کا شیشہ چڑھا دو مستنصر.." گونج تشویش میں پھڑپھڑائی اور مسافت کے دوران اُس نے پہلی بار مجھے میرے نام سے پکارا تھا..

اُس گلشنِ فریب میں کوئی ایک شجر تھا جو ابھی ہریاول سے نچڑتا تھا اور ابھی وہ سونے کے سنہرے پن میں ڈھل گیا..
سونے کی وادی..یُوکان..
سورج کی کرنیں مسافروں کے چہروں پر پڑتیں تو وہ سونے میں ڈھلے ہوئے چہرے لگتے..گونج کے سفید پَر اُن کرنوں کے کرشمے سے گندھارا عہد کے کسی راہب خانے میں سے برآمد ہونے والے سونے کے جھمکوں کی مانند سنہرے دکھائی دینے لگتے..اور ایسا کیوں نہ ہوتا...کہ یُوکان سونے کا دیس تھا..

بادۂ گل رنگ کا ایک منظر کُھلا..
ایک قوسِ قزح رنگین خمار میں یُوں اترتی تھی کہ وہ جھیل ٹسلن کے پانیوں میں سے جنم لیتی جُھولا جھولتی بلند ہوتی تھی..
موتیوں کا ہر طرف زیور کُھلا..

"مت کرو۔" گونج نے مجھے دھمکایا۔
"کیا نہ کروں؟" میں تو کُچھ بھی نہیں کر رہا تھا..
"یہی جو تم بر سرِ عام سگریٹ کے ساتھ سیکس کرتے ہو..سلگانے سے پیشتر اُسے اپنی اُنگلیوں سے نرم کرتے ہولے ہولے دباتے ہو.."

ہم تو گہری نیند میں اتر چکے تھے جب دستک ہوئی..
"سوری ٹُو ڈسٹرب یُو سر" وہ نظریں جھکائے جیسے التماس کرتی ہو۔ "لیکن باہر اس رات میں..ال ڈوراڈو ہوٹل کے باہر...دریائے یُوکان اور ڈاسن سٹی کے آسمان کا جو تاریک گنبد ہے وہاں اس لمحے شمالی روشنیوں کے رنگین بہاؤ ظاہر ہوتے ہیں..یہ عجوبہ ہر شب ظہور میں نہیں آتا..شمالی روشنیوں سے ہمارا آسمان رنگوں کے بھڑکیلے پن میں ڈوب رہا ہے..کیا آپ باہر آ کر انہیں دیکھنا پسند کریں گے..سوری ٹُو ڈسٹرب یُو.."

ال ڈے راڈو..حقیقت نہیں، ایک فسانہ ہے محض تصور ہے وجود نہیں..ایک افسانوی شہر جو موجود نہیں، ایک چاند نگر..
شہرِ دل کی گلیوں میں..
شام سے بھٹکتے ہیں..
چاند کے تمنائی..

ڈاسن سٹی کے آسمان پر شمالی روشنیوں کے بھڑکیلے سانپ لہرا رہے تھے..اپنے شوخ رنگوں سے ہماری آنکھیں چندھیا رہے تھے..
شہرِ دل کی گلیوں میں..

اور وہ جو باغ بہاراں، گُل و گلزار تھا..وہ زردی اور سُرخی کی ایک تصویر میں ڈھلتا تھا، ہمیں "ٹاپ آف دے ورلڈ روڈ" پر لے جاتا تھا..
اور تب آنکھوں کے سامنے ایک المیہ ظہور پذیر ہوا، ایک سوگواری نے، ایک شدید بے بسی، لاچارگی اور حزن کی موت نے جنم لیا..ایسا منظر تو نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا..اور نہ زندگی بھر دیکھا تھا..
آج تک جتنے منظر دیکھے تھے وہ اس منظر کے سامنے ہیچ تھے..جیسا کہ امام خمینی نے کہا تھا کہ یہ دنیا..ہیچ ہیچ....
زرد پتوں کے بن ہیں..ذخیرے ہیں..خزاں رسیدہ شجروں کے انبوہ ہیں۔ایسی زردی میں ڈوبے ہوئے کہ اگر اُن کی گھناوٹ کے اندر کوئی بلیک بگ ہرن غلطی سے چلا جائے اور جب اُن سے باہر آئے تو وہ ایک زرد بسنت ہرن ہو چکا ہو، اگر آئینہ دیکھے تو اُس کی شفافی بھی سرسوں کی زردی ہو جائے..
اور کہیں جھاڑیاں اور بُوٹے اتنے سُرخ سڑک پر اُمڈتے ہوئے اتنے سُرخ کہ لگتا تھا کہ اُن کے پتوں سے خون ٹپکنے لگے گا..ان جھاڑیوں اور بُوٹوں تلے اگر کسی حسن کوزہ گر کا کوزہ رکھ دیا جائے تو وہ اُن کے خون کی ٹپکتی بوندوں سے بھر جائے یہاں تک کہ اُس کی مٹی میں سے شفق کی سُرخی پھوٹنے لگے..
آسمان سے اترنے والا دہکتا ہوا لاوا جو اِن پہاڑیوں کو ڈھک کر سرد ہو گیا..ٹیلر روڈ کی توصیف میں غالب نے کہا تھا..

صُبح آیا جانبِ مشرق نظر   اِک نگارِ آتشیں، سُرخ، سر کُھلا

اور وہ ایک تھرتھراتے بدن والی ہرنی کی مانند اپنے بدن پر کچھ لبادہ نہ رکھتی تھی..
....لیکن اُس آخری ساعت میں بھی میں وادیٔ یُوکان کی اس کوہستانی خزاں کے آگے سر بسجود ہوتے ہوئے بھی اُس سے بچھڑنا نہ چاہوں گا..

"اور کیا آپ جانتے ہیں کہ کینیڈا سے الاسکا میں زمینی راستے سے..پوکر کریک سے داخل ہونے والے آپ میرے پہلے پاکستانی شہری ہیں..آپ کے پاسپورٹ پر میں نے معمول کی نہیں ایک خصوصی مُہر لگائی ہے..یہ دیکھیے۔"
میرے پاسپورٹ کے ایک صفحے پر ایک بہت بڑے بارہ سنگھے کی شبیہہ ثبت تھی جس کے نیچے "الاسکا" درج تھا..

الاسکا کی موہوم اور دور افتادہ سلطنت کی نیم سرد ہواؤں میں..
شاہراہ کے دونوں جانب..سوختہ ساماں..جل چکے شجر..جنگل کے جنگل..تا حدِ نظر، صرف اُن کے سوختہ تنے

تھے سینکڑوں کلومیٹر تک ہمارے آس پاس.. سوگواری میں سیاہ.. عجیب آتش زدہ منظر.. یہ کیسے دل جلے تھے.. اور اُن کے درمیان میں ہماری جیپ چلی جا رہی تھی، سہمی ہوئی اور پُر ملال.. راتوں کو ان سوختہ تنوں سے لپٹ کر جانے کونسی اور کس کس کی روحیں روتی ہوں گی..

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا..

اور پھر اُس پچھلے پہر کی دھوپ کی زردی میں آزردہ اور پُر ملال، دل میں ایک خوف بھرنے والے حُسن کے ہر پتے پر ایک اور خوف حاوی ہونے لگا.. مجھے اس گلزار میں آخر نوک ہی کیوں یاد آیا تھا.. وہ بھی.. ایک اجاڑ پن.. دور افتادگی کا ہول، کسی آسیب کا سایہ.. توہم کا کارخانہ.. اس کا اعتبار نہ کرو.. یہاں سے نکل چلو.. اگر تم اپنی محبتیں سنبھال کر رکھنا چاہتے ہو تو یہاں مت ٹھہرو.. یہاں آسیب اور واہموں کے بُوٹے پھوٹتے ہیں.. یہاں سے نکل چلو..

وہ شجر اور سبز جھاگ بیلیں ہمارے بدنوں کے ہر ہر مُو میں جڑیں پکڑ جاتے اور یوں ہماری جیپ، کونج کا سفید بدن اور میں بھی اُن امڈتے جنگلوں کا ایک حصہ بن جاتے.. وہ جنگل ہم ہو جاتے.. اور ہم.. وہ جنگل ہو جاتے..

ہم دونوں سبزے میں حنوط ہو چکی جیپ میں حنوط پڑے ہیں..

یہ سب ستمبر کے کرشمے تھے کہ.. ہم آتش پرست ہوئے جاتے تھے..

ہر سُو ایسی آگ سلگ رہی تھی..

فیئر بینک سے اینکر ایج کی جانب جب رُخ کیا تو راستے میں یہ سرخ آگ بھڑک اٹھی..

ایک مدھم بہاؤ کا دریا تھا.. اور وہ دریا مدھم مدھم اُس سلگتی آگ کی بھڑکتی سُرخی کے درمیان رواں تھا..

اور پھر اس آتش آفت منظر میں سے ایک برفیلا صبح کی روشنی میں طلوع ہونے والا ابھارا ابھرنے لگا اور سارے منظر پر حاوی ہو گیا.. امریکہ کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ میکنلے، بیس ہزار تین سو بیس فُٹ بلند.. یعنی اگر اُس کے قدموں میں کوئی سمندر ہوتا تو وہ چوٹی سے تقریباً چار میل کی گہرائی میں ہوتا..

ہم جس خطے میں سے گزر کر آئے تھے اسے الاسکا کا سنہری دل کہا جاتا تھا..

اب ہمیں اس دل کے پار جانا تھا..

شکاریوں کے لینڈ روور کے بھاری ٹائر گھومے، اُن کے بے تحاشا گھومنے سے چند کنکر اُڑے، کچھ دھول اٹھی..

اور جب وہ لینڈ روور دور ہوتا تھا تو اُس مردہ بارہ سنگھے کے عالی مرتبت اور گنجلک شاہانہ سینگ یوں اٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ ماؤنٹ میکنلے کی برفوں میں چھید کر ڈالیں گے، اُن میں دفن ہو کر پھر سے زندہ ہو جائیں گے اور اپنے آبائی جنگلوں کو لوٹ جائیں گے..

"اوئے ماں کے خصمو.. باندرو"

اینکر ایج کی پہلی سویر میں "میرل فیلڈ اِن" کے مختصر کمرے میں..

"تُسی لاہور دے او.." وہ میری جانب یُوں کھنچا چلا آیا جیسے میں خود لاہور ہوں، ایک مقناطیس ہوں۔ "تُسی الاسکا وچ" میں ستندر سنگھ ہاں یہ "میرل فیلڈ اِن، آپاں دا موٹل اے.."

"تمہاری کُڑی ہے!"

"کونج" میں اُن بوٹوں اور پتوں پر نقش گزشتہ ایام کی تصویروں میں یُوں گم ہوا کہ اُسے فراموش کر دیا "کیا تم یہاں ہو.."

"ہاں میں ہوں.." وہ کہیں دور تھی.. قریب نہ تھی..

وہ ایک اسکیمو تھا..

اُس بوڑھے کی آنکھیں ترچھی منگول تھیں، وہ پستہ قد تھا، ناک قدرے چوڑی تھی اور اُس کے چہرے پر برفوں ایسی معصوم مسکراہٹ کھیل رہی تھی.. جہاں آج کا اینکر ایج تھا یہاں ان گنت زمانوں سے خدا کی برفانی اور ویران سلطنت تھی جس کا وہ شہزادہ تھا.. اور آج وہ فقیر تھا..

وہ ایک گُڈلی سا، رولی پولی، گلے لگا کر خوب بھینچنے کے لائق ایک اسکیمو تھا..

"پے کستان.. تمہاری پرابلم ہے انڈیا کے ساتھ.. اباؤٹ کے شمیر.. ناٹ گڈ پرابلم.."

اُس.. وکٹوریا سے چند جھیلوں کے فاصلے پر واقع باغ بہاراں کی الم ناکی میں مزید اضافہ ہو گیا جب اُس کے ایک کُنج میں کھودی جانے والی ایک قبر نظر آنے لگی.. اور جب اُس میں اُسے دفن گیا تو اُس قبر کی مٹی کا ہر ذرہ دکنے لگا.. سونے کا ہو گیا..

"الاسکا نیٹو ہوسپٹل" اُس کے صدر دروازے میں سے ایک خوشبو فرار ہوئی اور اُس نے میرا گھیراؤ کر لیا..

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بُوئے دوست

یہ ہسپتال میرے دوست تلمیذ حقانی کا ندیم رہا تھا..

ایسے لگتا تھا جیسے سمندروں میں سفید رنگ کے اونٹ یوں ڈوبے ہوئے ہیں کہ صرف اُن کے کوہان ظاہر ہوتے ہیں.. ابھرتے ہیں اور پھر روپوش ہو جاتے ہیں.. وہ الاسکا کے سرمئی سمندروں میں ابھرتی ڈوبتی درجنوں بیلوگا نسل کی سفید وہیل مچھلیاں تھیں.. اگرچہ وہیل مچھلی نہیں ہوتی، لیکن صرف وہیل کہہ دینے سے تشفی نہیں ہوتی.. جب تک کہ اُس کے ساتھ

مچھلی کا اضافہ نہ کیا جائے..

ہم سیورڈ میں تھے اور بارش ابھی تک تھمی نہ تھی..ونڈ سکرین پر اُس کی دھاریں بیوہ کے آنسوؤں کی مانند گرتی جاتی تھیں..

سامنے آبنائے الاسکا کا تاریکی میں گُم سمندر شور کرتا تھا..

سیورڈ کا سارا وجود بھیگ رہا تھا ''مرفی زلونگ شور لاج'' کے باہر بارش ہوتی چلی جاتی تھی، ہر شے..سیورڈ کے گڑیا گھر، فٹ پاتھ اور پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا گیلا ہو رہا تھا..

دور دور تک رم جھم۔

دور دور تک سمندر پر گرتی بوندیں..

''فرمایئے؟''

''ہاں..یہیں مرجانے کو جی چاہتا ہے..''

''اندر آ جاؤ۔''

''اندر آ کر مروں؟''

بارش، سیورڈ کی سہیلی تھی، اُس کی جان نہ چھوڑتی تھی..

ہم ایگزٹ گلیشیئر کے اندر ایک برفانی کھوہ میں داخل ہوئے جہاں تاریکی تھی..

میں اُس کی برفانی لپیٹ میں آ کر ٹھٹھرنے لگا اور بے اختیار ''ہُو ہُو'' کرنے لگا..

''ٹھرکی'' مُونا مجھے عاجز کر دینے پر تُل چکی تھی ''اب خود بھی ہُو ہُو کرنے لگے ہو..''

''اللہ ہُو..''

اور اُس وہیل مچھلی، کسی سالمن یا ڈولفن کو بھی یقین نہ آتا تھا کہ ایک پاکستانی یہاں تک پہنچ سکتا ہے..

اُس سرمئی شام میں گلف آف الاسکا کے سمندر میں سے ایک وہیل تو نہیں، ایک سالمن یا ڈولفن اچھلی اور ڈوب گئی..

''ہم یہاں آرام کرنے تو نہیں آئے..گلف آف الاسکا کے سمندروں کو محسوس کرنے آئے ہیں..میں جا رہا ہوں۔''

''تو جاؤ۔'' مُونا نے درشتی سے کہا ''میں دیکھتی ہوں تم عرشے پر کتنی دیر ٹھہر سکتے ہو۔''

میں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھتا ہوا سٹیمر کے اندرون کے خاموش کُنج میں سے نکل کر عرشے پر آیا تو کان بھر سے ہوگئے..آنکھیں نمکین پانیوں کی بوچھاڑ سے بھر گئیں..کوئی شور تھا، کوئی قیامت تھی اور کوئی غدر مچا ہوا تھا، کانوں میں

دنیا بھر کے سمندروں کی چنگھاڑ کا شور اترتا تھا..سمندر واقعی تلاطم میں تھا اور اُس میں سے جنم لینے والی لہروں کے غضب کی جھاگ سٹیمر پر انڈیلی جا رہی تھی..

کھڑکی کے وسیع شیشے پر پانی کی دھاریں اترتی تھیں اور اُس کے عقب میں مُونا کا چہرہ بھی ایک آبی شکل ہوا جاتا تھا، جیسے وہ بوندوں اور دھاروں سے تخلیق کی گئی ہو..

ہمارے سٹیمر کے پہلو بہ پہلو کوئی درجن بھر متجسس ڈولفن مچھلیاں ہیں جو زیر آب تیرتی چلی آ رہی ہیں اور اُن میں سے کبھی دو چار ابھرتی ہیں اور پھر ڈبکی لگا جاتی ہیں..

ہمارا سٹیمر ایک ناکام شکاری کی مانند شرمندہ سا سیورڈ کی بندرگاہ میں داخل ہونے لگا..شباب ختم ہوا، اک عذاب ختم ہوا..

اُس ویران خلاء میں ایک برف پوش پہاڑ تھا..

جیسے تُرکی کے قصبے ڈوگ بایزید سے نظر آنے والا نوح کا پہاڑ کوہ آرارات ہو..

وہ ایک برف پوش کوہِ طور تھا اور اگر الاسکا میں کبھی کسی پیغمبر کا ظہور ہوا تھا وہ یقیناً اسی کی چوٹی پر آگ لینے کے لیے نہیں برف لینے کے لیے گیا ہوگا..

کبھی شاہراہ کے عین سامنے ایک جوگی براجمان..

کبھی سرکتا دور ہوتا سینکڑوں کلومیٹر کی دوری پر چلا جاتا مدھم ہو جاتا..اور درمیان میں طویل فاصلوں میں لاکھوں زرد شجر، ندیاں اور دریا..

یہ پہاڑ کم از کم راکاپوشی کے سامنے تو آ کھڑا ہوا تھا..

اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا..

زندگی بھر کی محبتیں کسی جادو ٹُونے کی نذر ہو گئیں..

مجھے ٹوک کی اُس شب میں ڈراؤنے خوابوں نے گھیر لیا..وہ بلاؤں کی مانند میرا پیچھا نہ چھوڑتے تھے..

کبھی مُونا کے کُرلانے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں آنے لگتیں..وہ ماتم کناں تھی کہ میں نے یہ الاسکا سفر تمہارے ساتھ کیوں اختیار کیا..ہچکیاں بھرتی ایک گمشدہ بچی واش رُوم کے ٹب میں بیٹھی روتی چلی جاتی ہے اور جب میں ہڑبڑا کر اٹھتا ہوں تو وہاں کوئی نہیں ہے..

''مُونا..'' اور وہ وہاں تھی، میرے پہلو میں اُس زردی میں سیاہ ہوتے خوف کے سایوں والے باغ بہاروں میں اور وہ بھی اپنے گزشتہ سفر کی پھولوں، بیلوں اور پتوں پر عکس ہوتی تصویریں انہماک سے دیکھتی تھی۔ ''تم ٹوک میں رو کیوں رہی تھیں؟''

''سب تمہارے مشرقی توہم..میں تو ٹوک کے نواح کے جنگلوں میں پوشیدہ گہری نیند میں تھی۔''

"میں پھر سے ٹوک کے خوف میں آ گیا ہوں.. مجھے بقیہ سفر کے عکس دیکھنے کی کچھ حاجت نہیں ہے."

"ٹسلن کی قوس قزح کے رنگوں میں رات نہیں کرو گے..تمہارے بستر کی چادر پر اُس کے سات رنگوں نے سات شکنیں ڈال دی تھیں اُن کو نہیں دیکھو گے اور پھر میڈ اڈین جنکشن کے بیئرز..اب تو سفر تھوڑا رہ گیا ہے."

اگر ٹوک ایک آسیب تھا تو ٹسلن ایک جنت گم گشتہ تھی..

بے شک میں نیند میں تھا لیکن میں قوس قزح کے سات رنگوں کے لشکارے اپنے خوابیدہ بدن پر محسوس کر سکتا تھا..کمرہ نمبر آٹھ کی کھڑکی کے آگے تنے ہوئے پردوں میں سے اُس کے رنگ چھن چھن کر آتے تھے..اور میرے ڈبل بیڈ کے خالی حصے کو رنگین کرتے تھے..اگر ایک گوری کا پنڈا میرے برابر میں نیند میں ہوتا تو وہ کیسے اُس کے نشیب و فراز کو رنگین کرتی..کہاں اُس کے رنگ پھسل کر نیچے گرتے اور کہاں وہ کسی اندھیارے میں گم ہو جاتے..

اُچیاں لمیاں ٹاہلیاں تے وِچ گُجری دی پینگ وے ماہیا

جنگل ذرا پرے پرے ہونے لگے..

اور اس کے ساتھ ہی تاریکی بھی ایک جھٹپٹے میں بدلنے لگی..کُچھ کُچھ دکھائی دینے لگا..پھر معیز الدین جنکشن کے آثار ہمارے قریب آنے لگے..

اس سے پیشتر کہ ہم اُس کی مکمل ویرانی اور کھنڈر نما وحشت اور خوف کے ماحول میں سانس لیتے دائیں جانب سے ایک نہیں پورے تین درمیانی جسامت کے سیاہ ریچھ جھاڑیوں میں سے نمودار ہو کر لڑھکتے ہوئے شاہراہ پر آ گئے اور جیسے ریچھ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے لاڈ پیار کرتے ہیں ایسے چُہلیں کرنے لگے..

باہر مت نکلو..وہ تم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں..

میں زیادہ قریب نہیں جاؤں گا..

بیٹھے رہو..

معیز الدین جنکشن..شب کی اترتی سیاہی میں پُر ہول جنگلوں کے درمیان ایک متروک شدہ ریستوران مقفل..

کھڑکیوں کے چوکھٹوں تلے گھاس اُگ رہی تھی..

مقفل دروازے کے کواڑوں پر کائی کے آثار تھے..

وہاں کوئی نفس تھا اور نہ کوئی چراغ..

وہ کون تھا؟

ایک شب دیجور میں ایک شاہراہ کے کنارے سر جھکائے کیوں بیٹھا ہوا تھا..

میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ کوئی انسان نہ تھا..

ایک ایسا جنگل جس کے بارے میں وہاں کے آبائی باشندوں کا عقیدہ تھا کہ وہ آسیب زدہ ہیں..وہ اُن جنگلوں کے قریب سر جھکائے سیاہ رات میں اُس ویرانی میں تنہا بیٹھا تھا تو وہ کون تھا..

نو لائک مائی آؤل..موٹل کا چینی بابا..

ہمیں آپ کا الو بہت پسند ہے لیکن فی الحال پلیز ہمیں ہمارا کمرہ دکھا دیں..

تو یہ ہوپ تھا..ویسے اس ہوپ سے وہ وہ موٹی ناک والا مسخرہ باب ہوپ زیادہ ہوپ تھا..

جوگی پہاڑوں سے اترے تو میدانوں میں شاہ حسین کے میلہ چراغاں کے ڈھول بج رہے تھے..صد شکر کہ ایک سو برس کی تنہائی اختتام کو پہنچی..

سمندر پر معلق ایک پُل کے آر بھی اور پار بھی کینیڈا کا سب سے خوش آثار اور خوش جمال شہر وینکوور پھیلا ہوا تھا..

اگر لاہور، لاہور ہے تو وینکوور بھی وینکوور ہے..

وِسلر کی اُس شب میں، میرے لیے ابھی تک ایک نا آشنا اور گمنام کوہستانی قصبے کے لاج کے اندر آتش دان میں جو شعلے لپکتے تھے وہ تو میرے رفیق نہ ہو سکتے تھے..وہ ایک بھڑکتا سراب تھے جس نے ابھی چند ساعتوں کے بعد راکھ ہو جانا تھا..

وہاں میرے سامنے والے خالی صوفے پر کسی نہ کسی کو تو ہونا چاہیے..

کسی زرد بن کو، خزاں کی بے لباسی میں، صوفے کے بازو پر اپنی ٹہنیاں کُہنیاں ٹکائے اُن پر اپنا مکھ جمائے مجھے تکتے ہوئے..

دُھند..اپنے سفید سانس لیتی اندر جھانکتی تھی..

تنہائی کا سراب اور وہ بھی وِسلر کی دُھند آلود شب میں..آپ کو کیسے کیسے کرشمے دکھاتا ہے..جو موجود نہیں ہوتا اور آپ خواہش کرتے ہیں کہ وہ موجود ہو تو وہ موجود ہو جاتا ہے..

وینکوور جزیرے کی جانب رواں فیری کی ریلنگ پر سے جھانکتے ہوئے نیچے نیلے سمندروں میں بہتا جاتا چنار کا ایک خزاں رسیدہ پتہ تھا..

نیلگوں سمندروں میں..

جیسے ایک ماں کی جھولی میں..

نیلو نیل جھولی میں..

جُھولتا ایک پتہ ہے، زرد چنار پتہ ہے..

جو کہ بہتا جاتا ہے..

وکٹوریا کا آسمان غُل کرتے آبی پرندوں سے بھرا ہوا ہے ایک خواب میں..اور اُن کے درمیان میں کُونج ہے.. اپنے ہم جنسوں کے ساتھ قلقاریاں مارتی خوشی سے پاگل ہوتی اُن کے ساتھ چونچ جوڑ کر اُن سے محبت کرتی اور وہ سب پرندے اُس کے عشق میں گرفتار اُسے متوجہ کرنے کی خاطر اپنی اڑانوں کے کرتب دکھاتے اُسے لُبھاتے ہیں.."مائنڈ نہ کرنا..جب تمہارے بال سفید ہونے لگتے ہیں اور تم غفلت برتتے اُن کو ڈائی نہیں کرتے تو مجھے اچھے لگتے ہو..ایک سمندری بگلے لگتے ہو.."

اور تب..گدلے آسمان تلے سمندروں کا جو پھیلاؤ تھا اُس میں سے ایک سیاہ رنگ کی وہیل کا وجود ابھرا..اور اُس کی نمو داری کا جلال ایسا تھا کہ اُس نے اُن سمندروں کو حقیر کر دیا..ایک موبی ڈِک..

اُس کے نتھنوں سے وقفے وقفے کے ساتھ سانس کے پانیوں کا ایک فوارہ بلند ہوتا..جیسے ایک آبی پھنکار ہو..
اُس کے بھاری سیاہ وجود کے گرد جو سمندر تھا اُس کے پانی جھاگ آلود اور ابلتے ہوئے لگتے تھے..

○●○●○

"سفرِ یُوکان اور الاسکا ختم شُد سب خواب و خیال تمام شُد"

اور پھر ہمارے سفر کی پرچھائیوں کا اختتام ہوا کہ جو آخری نقش تھا اُس میں ہم وکٹوریا سے سفر کرتے چند جھیلوں کے پار اس باغ بہاراں کی اداسی میں داخل ہو گئے تھے..

اور تب ہر پتے ہر بُوٹے پر کنول کے چوڑے پتے اور آبشاروں کی ایک ایک بوند میں ہمیں اپنے چہرے دکھائی دینے لگے کہ ہم سفر کے اختتام میں تھے اور یہی آخری نقش تھا..ہر خاموش کُنج میں اور اُس باغ میں کھلے ہر پھول کی ہر پتی پر ہمارا عکس ہی جھلکتا تھا..

اور کون ہے آئینوں میں..بس تُو ہی تُو ہے..

لیکن اگلے ہی پل میں ایک ماجرا ہو گیا..وہاں میں تو تھا پر اُس کا چہرہ نہ تھا..وہ جو پتے بُوٹے اور بوندیں ابھی کچھ پل پہلے ہم دونوں کی شکلوں سے مزین تھے وہاں صرف ایک خزاں رسیدہ چنار کے پتے کا عکس تھا، اُس کے پہلو میں خلا تھا وہاں اور کوئی نہ تھا..

کُونج موجود نہ تھی..

نہ میرے پہلو میں کہ جب بھی وہ میرے پہلو میں ہوتی تھی اُس کے گرم سانسوں کی حدت میرے کاندھے پر ایک مسلسل ٹکور کرتی تھی اور اب وہ سانس میرے بدن پر نہ اُترتے تھے..

نہ کسی رنگیلے پھولوں کے انبار میں اُس کی من موہنی شکل دکھائی دے رہی تھی..

نہ وہ زرد پتوں کی بیلوں کی زردی میں کہیں جھلکتی تھی..

اور نہ ہی آبشاروں کی کسی ایک بوند میں وہ جھلملاتی تھی..

وہ وہاں نہیں تھی..

جا چکی تھی..

اُس نے میرے تصور کی آنکھ میں سے جنم لیا تھا اور اب اُسی تصور کی راکھ میں راکھ ہو گئی تھی۔۔

وہ ققنس نہ تھی کہ اپنی ہی راکھ میں سے دوبارہ جنم لے لیتی۔۔اگر ایسا ہوتا تو میں اُس راکھ کو تاابد کریدتا رہتا۔جیسے مختلف عقیدوں کے لوگ ایک مسیحا کے منتظر رہتے ہیں۔۔میں بھی اُس کے جنم کا منتظر رہتا۔۔

لیکن نہ تو وہ ایک ققنس تھی اور نہ ہی ایک مسیحا۔۔وہ راکھ ہوئی تھی تو اُس نے راکھ ہی رہنا تھا چاہے میں اُس کی راکھ کو ابد تک کریدتا رہتا۔۔

میں نے ہی اُسے اپنے تصور کے چاک پر چڑھا کر اُس کا قلبوت اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا تھا۔تو وہ قلبوت پھر سے مٹی ہو گیا تھا۔۔

وہ اپنے آسمانوں کی جانب اڑان کر چکی تھی۔۔

نہ سلام نہ دعا۔۔نہ کوئی الوداعی بوسہ۔۔نہ کوئی چشمِ نم اور نہ بچھڑنے پر کوئی ایک آہ۔۔اتنا بھی نہیں کہ تم ایک اچھے ہم سفر تھے۔۔وہ ابھی میرے پہلو میں تھی، میرے ہمراہ، میرے کاندھے پر جھکی ہوئی باغ بہاراں کے گل بوٹوں پر نقش یوکان اور الاسکا کی مسافتوں کی تصویریں تکتی۔۔اور ابھی۔۔میرے برابر میں ایک خلاء تھا۔۔

وہ پل بھر میں معدوم ہو گئی تھی۔۔

وہ معدوم ہوئی، راکھ ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میری سب مسافتیں بھی راکھ ہوئیں، زمانوں کی دُھند میں تحلیل ہو گئیں۔۔وہ سب منظر جو ابھی ابھی ایک تصویر کی مانند ہر گل بوٹے پر متحرک نظر آ رہے تھے۔۔وہ سب ایک واہمہ ایک خیال ہو گئے۔۔وہ لڑکی جو اوائل ستمبر میں بنیف کی برف سفیدیوں اور خزاں زردیوں میں مُنہ موڑے کھڑی تھی۔۔بے شک اُس کی شکل نظر نہ آتی تھی اور اس کے باوجود اُس کے گھنیرے بال اور متناسب بدن کے زاویے گواہی دیتے تھے کہ وہ زندگی سے خوش نہیں ہے۔۔وہ لڑکی نظر کا دھوکا تھی۔۔

نہ کوئی کول رِور تھا اور نہ ہی اُس سے تقریباً دس گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر وہ کالے شاہ بسون بھینسے۔۔نہ اُن کی تاریکی میں شعلوں کی سی مانند جلتی مہین آنکھیں۔۔

کوئی سونے کا دیس یوکان نہ تھا۔۔

نہ کوئی اُبھری ایک ست رنگی پینگ میں جھیل ٹسلن کے پانیوں پر جھولتی تھی۔۔

ال ڈے راڈو تو تھا ہی ایک چاند نگر۔۔شمالی روشنیاں جو ڈاسن سٹی کی رات میں اُس کے آسمان پر رنگوں کے لہریئے سانپ تھیں۔۔وہ بھی ایک سراب تھیں۔۔

ٹیلر روڈ کے ستمبر کے کرشمے زرد اور دہکتے ہوئے۔۔سوختہ سامان جل چکے شجروں کے جنگل۔۔ٹوک کا آسیب زدہ ہول۔۔سبزے میں حنوط شدہ جیپ اور ہم۔۔الاسکا کا سنہری دل۔۔گلے لگا کر بھینچنے کے قابل ایک اسکیمو۔۔الاسکا نیٹو ہوسپٹل جس میں میرے دوست کے سانس تھے۔۔بیلوگا نسل کی وہیل مچھلیوں کے سفید ابھار۔۔نہ کوئی سالمن مچھلی اور نہ کوئی ایک ڈولفن۔۔اور نہ وہ برف پوش کوہ طور۔۔نہ ہی پیسفک اوشن کے پھیلاؤ میں سے ابھرتی سیاہ رنگ کی ایک موبی ڈک وہیل۔۔

سب کے سب سراب۔۔سارے کے سارے خواب۔۔تصور کے جھوٹے کرشمے۔۔دھوکا دہی کی حسین وارداتیں۔۔

نہ میں کہیں گیا نہ آیا۔

اپنی سٹڈی کی راتوں میں تنہا سٹڈی ٹیبل پر کاغذوں پر جھکے۔۔اُن سفید کاغذوں پر میرے قلم نے اپنے تصور کے نقش مصور کیے۔۔گھر بیٹھے یوکان اور الاسکا کے سفر تصور کر لیے۔۔کہ نہ میں کہیں گیا نہ آیا۔۔گویا میرے ہم عصر اور کچھ نقاد اگر مجھ پر اعتراض کرتے تھے، مجھے دشنام کرتے تھے کہ میں اپنے سفرناموں میں جو کچھ بیان کرتا ہوں، وہ فکشن ہوتا ہے۔۔کہ یہ تو ممکنات میں سے نہیں کہ کوئی شخص ایسے حیرت بھرے تجربات میں زندگی کرے تو وہ سب آج معتبر ٹھہرے تھے۔۔وہ سچ کہتے تھے۔۔کہ میں نہ کہیں گیا نہ آیا۔۔

لیکن۔۔کھوج لگانی چاہیے کہ وہ کون تھا جس نے بارہ ہزار کلومیٹر سے زیادہ کے زمینی فاصلے ایک نقرئی جیپ پر طے کیے۔۔یوکان اور الاسکا کے طلسمِ ہوش ربا میں سے گزرا۔۔میں نہ تھا تو اور کون تھا۔۔

جو بھی تھا۔۔بے خبر تھا۔۔

یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔۔

جو رہی تو بے خبری رہی۔۔

اگر اُس باغ بہاراں کی زرد شام میں میرے پہلو میں گونج نہ تھی۔۔سلام دعا کے بغیر ایک آخری الوداعی بوسے کے بغیر مجھے ترک کر کے چلی گئی تھی تو۔۔یہ سب واہمے اور خیال تھے۔۔اگر حقیقت ہوتے تو گونج کا گرم سانس میرے کاندھے پر پھیلتا مجھے آسودگی سے ہمکنار کرتا ہوتا۔۔

اور وہ چلی گئی تھی۔۔

تم اس سراب میں ہو کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔۔
مجھے یوں اس باغ بہاراں گلزاراں میں۔۔
اس کی الم ناک زردی میں۔۔
تنہا ترک کر کے چلی گئی ہو۔۔
اپنی قدیم رفاقتوں کی آغوش میں چلی گئی ہو۔۔
اپنے دل کو پتھر کر لیا ہے۔۔
جس پر نہ ایک گداگر کی فریاد اثر کرتی ہے۔۔
اور نہ یوکان اور الاسکا کی رفاقتوں کی یاد میں بہتے آنسو۔۔
نہ وہ پہلی بارش جو سیورڈ میں اُترتی تھی۔۔
اور نہ وہ نمکین نمی کے ذائقے جو تمہارے ہونٹوں سے۔۔
میرے لبوں پر منتقل ہوتے تھے۔۔
تم اس سراب میں ہو کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔۔